مکتبۃ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی
شجرۂ مبارکہ
یعنی
تذکرہ علماءِ مبارکپور
اضافہ شدہ ایڈیشن
جس میں
شمالی ہندوستان کے مشہور علمی و دینی اور صنعتی قصبہ مبارکپور اور اس کے ملحقات کی
ساڑھے چار سو سالہ اجمالی تاریخ اور قصبہ و سواد قصبہ کے مشائخ و بزرگانِ دین
علماء، فقہاء، محدثین، مدرسین و مصنفین، شعراء و ادباء اور دیگر اربابِ علم و فضل
کے حالات اور ان کے علمی و دینی کارنامے بیان کیے گیے ہیں۔
مؤرخ اسلام
مولانا قاضی اطہر مبارکپوری
۱۹۱۶ء - ۱۹۹۶ء
مکتبۃ الفہیم

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

جس میں

شمالی ہندوستان کے مشہور علمی و دینی اور صنعتی قصبہ مبارکپور اور اس کے ملحقات کی ساڑھے چار سو سالہ اجمالی تاریخ اور قصبہ و سواد قصبہ کے مشائخ و بزرگان دین علماء، فقہاء، محدثین، مدرسین و مصنفین، شعراء و ادباء اور دیگر ارباب علم و فضل کے حالات اور ان کے علمی و دینی کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

از : مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ (۱۹۱۶ء-۱۹۹۶ء)

MAKTABA AL-FAHEEM
Raihan Market, 1st Floor, Dhobia Imli Road
Sadar Chowk, Maunath Bhanjan - (U.P.) 275101
Ph : (O) 0547-2222013, Mob 9236761926, 9889123129, 9336010224
Email : maktabaalfaheemmau@gmail.com
www.maktabaalfaheemislamicbooks.com

نام کتاب	:	شجرۂ مبارکہ یعنی تذکرہ علمائے مبارکپور
مصنف	:	مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ
کمپوزنگ	:	الفہیم کمپیوٹر، مئو
پروف ریڈنگ	:	مولانا قمر الزماں قمر مبارکپوری
طبع اول	:	۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء
طبع دوم	:	(اضافہ کے ساتھ) ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء
صفحات	:	375
قیمت		چارسو روپے(=/Rs.400)

ملنے کا پتہ

مکتبہ ضیاء الکتب مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ (یوپی)

پن کوڈ: 276121 (موبائل: 9235327576)

MAKTABA AL-FAHEEM

Raihan Market, 1st Floor, Dhobia Imli Road

Sadar Chowk, Maunath Bhanjan - (U.P.) 275101

Ph.: (O) 0547-2222013, Mob 9236761926, 9889123129, 9336010224

Email : maktabaalfaheemmau@gmail.com

www.maktabaalfaheemislamicbooks.com

فہرست مضامین

شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان
مبارک پور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش الہند
قاضی شیخ علی
قاضی شیخ امام بخش
قاضی محمد رضا
قاضی شیخ حسام الدین
قاضی شیخ رجب
میاں جی حاجی لعل محمد
میاں جی ولی محمد
میاں جی محمد شفیع
میاں جی حاجی محمد عمر
میاں جی عبداللہ
میاں جی حاجی اسداللہ
میاں جی حاجی محمد حسین
میاں جی حاجی محمد حسن
مورخ اسلام
مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
قاضی حیات النبی
قاضی ضیاء النبی
قاضی غلام النبی
قاضی عبدالعزیز
قاضی خالد کمال
قاضی ظفر مسعود
قاضی سلمان مبشر
قاضی حسان احمد
قاضی فوزان طارق
قاضی فرحان احمد
قاضی عدنان احمد
قاضی ریحان احمد
قاضی فیصل
قاضی محمد
قاضی ریان احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکر و اظہارِ حقیقت

الحمد لخالق البرایا والشکر لواهب العطایا وصلی
ربی علی محمد بکرا وظهائر وعشایا امابعد۔

والد محترم مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ کی اہم کتاب ''تذکرۂ علمائے مبارکپور'' پہلی بار جون ۱۹۷۴ء میں دائرۂ ملیہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ یوپی سے شائع ہوئی تھی اور عرصۂ دراز سے دستیاب نہیں تھی۔قدرداں حضرات کا اصرار تھا کہ اس کی دوبارہ اشاعت ہونی چاہیے۔اسی امتثالِ امر میں اب تیس سال بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آرہی ہے۔ فالحمدلله علی ذالك۔

قصبہ مبارکپور کا کل تاریخی سرمایہ ''تذکرۂ علمائے مبارکپور'' ہے۔اس کے علاوہ اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب اب تک شائع نہیں ہوسکی ہے۔البتہ بزرگوں کی بعض قلمی کتابیں اور بیاضیں ہیں،جن کی حیثیت ذاتی روزنامچہ کی ہے۔اس سلسلہ میں اپنوں سے بھی شکوہ ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کی تاریخ وثقافت سے بےاعتنائی برتی اور اپنے قلم کے آثار میں اس کو شامل نہیں کیا۔

مبارکپور زائد ایک صدی سے علم وفن اور صنعت وحرفت کا گہوارہ ہے اور مسلمانوں کے ہر مسلک کے مدارس اس وقت سے موجود ہیں، جب ضلع اعظم گڑھ میں خال خال دینی مدارس پائے جاتے تھے۔لیکن نصف صدی قبل تک مبارکپور ذات برادری کی عصبیت کا شکار رہا اور اس کے آس پاس کی گمنام بستیوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی، جب کہ اس وقت مبارکپور کا علمی ودینی، سیاسی وسماجی اعتبار سے سنہرا دور تھا اور اس کی شہرت کا آوازہ ہر طرف تھا۔اس کی نظراندازی کی زندہ مثال ''حیاتِ شبلی'' ہے۔جس کے

مصنف علامہ سید سلیمان ندوی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"محمد آباد کے قریب مبارکپور نام کا ایک بڑا قصبہ ہے۔ جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور پچھلے زمانہ میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں۔"[1]

یہ ڈیڑھ سطری عبارت تجاہل عارفانہ کا اچھا خاصا نمونہ ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے مبارکپور کی ریشمی کپڑوں کی صنعت نے ہندوستان سے گزر کر اقصائے عالم میں اپنی راہ ہموار کر لی ہے اور یہاں کی حریری پوشاک نے حسینانِ نازک اندام کو لباس کے بارِ گراں سے سبکدوش کر دیا ہے، تو دوسری طرف خود اپنے ملک ہندوستان کے نوابوں، راجاؤں، حکام اور اعلیٰ طبقہ میں اس کے کپڑوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ایسے میں اہل قلم کے یہاں مبارکپور کا ذکر نہ ہونے کی دوسری کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور دینی، علمی، قومی و ملی سیاست کا مرکز رہا ہے۔ تحریکِ آزادی میں یہ ہر طرح سے شریک تھا۔ اس مناسبت سے احیاء العلوم اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں دینی، علمی، قومی اور سیاسی ہم آہنگی تھی اور جانبین سے آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ خاص طور پر مولانا شکراللہ مبارکپوری ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم نے تو حصولِ آزادی کے سلسلہ میں قید و بند کی مشقت بھی اٹھائی تھی، جس وقت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم دارالمصنفین میں مقیم تھے۔

مورخِ اسلام مبارکپوری شبلی منزل اعظم گڑھ اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے تعلقات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

"اس زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں کئی مشہور اہل علم تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی وجہ سے

---

[1] حیاتِ شبلی۔ ص: ۵۷۔ ۱۹۴۳ء

دارالمصنفین ضلع کی سیاست کا مرکز تھا۔ میں کبھی کبھی ساتھیوں کے ہمراہ وہاں جایا کرتا تھا اور مولانا سید سلیمان ندوی اِدھر اُدھر جاتے ہم لوگوں کو دیکھ کر رُک جاتے اور خیریت دریافت کرتے اور بعض اوقات وہ خود بھی مدرسہ احیاء العلوم میں آیا کرتے تھے، مگر ان سے یا دارالمصنفین کے کسی عالم سے استفادہ نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی دارالمصنفین دوسروں کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔ البتہ وہاں کی تصانیف اور رسالہ سے بہت فائدہ ہوا اور ان سے میرے ذوق کو مدد ملی۔"[1]

مورّخِ اسلام ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی کے طالب علم تھے اور عربی کی پوری تعلیم احیاء العلوم سے حاصل کی تھی۔ انھوں نے صرف ایک سال کے لیے مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

مبارکپور قدیم دَور سے علم وفن اور صنعت وحرفت کا مرکز رہا ہے اور دینی علوم کی آبیاری کے لیے یہاں انیسویں صدی کے اخیر میں دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کی پہلی کڑی باب العلم ہے، اس کے بعد دارالتعلیم کی بنیاد پڑی، پھر اس کے بعد مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم اور احیاء العلوم کا قیام ہوا۔ موخر الذکر دونوں مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور سات دہائیوں سے ہزاروں علماء کرام سند فراغت حاصل کر چکے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مبارکپور بیسویں صدی کے شروع سے چاروں مکتب فکر کا مرکز رہا ہے اور آج بھی اس کی یہ حیثیت باقی ہے اور یہ نا قابل تردید حقیقت ہے کہ پورے متحدہ ضلع اعظم گڑھ میں جو مدارس کے برگ وبار نظر آ رہے ہیں، چندے معدودے کو چھوڑ کر اکثر وبیشتر میں مبارکپوری مدارس کے شجرۂ مبارکہ کی قلم لگی ہوئی ہے۔ خواہ ان کا

---

[1] خودنوشت کاروانِ حیات۔ ص ۲۷۔ مصنف: مورخِ اسلام مبارکپوری

کسی فرقہ سے تعلق ہو۔ مبارکپوری مدارس کی دینی و علمی روشنی ضلع سے نکل کر اطراف وجوانب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ۱۹۴۳ء میں مبارکپور کا ذکر محمد آباد کے حوالہ سے کرنا مضحکہ خیز بات ہے۔

جب مبارکپور کے دینی، علمی، فکری اور سیاسی عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اس وقت مبارکپور کے آسمان علم وفن پر چندے آفتاب بھی تھے اور چندے ماہتاب بھی۔ جن کا مفصل تذکرہ اور ان کی علمی و دینی خدمات کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ ان عباقرہ میں سے چند کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں:

(۱) مولانا عبدالعلیم حنفی رسولپوری مبارکپوری متوفی ۱۹۲۲ء۔ صاحب کتاب الشہادۃ۔

(۲) مولانا عبدالسلام مبارکپوری متوفی ۱۹۲۴ء۔ صاحب کتاب سیرۃ البخاری۔

(۳) مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری متوفی ۱۹۳۵ء۔ صاحب تحفۃ الاحوذی۔

(۴) مولانا حکیم الٰہی بخش مبارکپوری متوفی ۱۹۳۷ء۔ بانی مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور۔

(۵) مولانا احمد حسین رسولپوری مبارکپوری متوفی ۱۹۳۹ء۔ صاحب سبیل الآخرت۔

(۶) ملا رحمت علی اسماعیلی مبارکپوری متوفی ۱۷ر جون ۱۹۴۴ء۔ بوہرہ مذہبی کتابوں کے مصنف اور عربی کے بہترین شاعر۔

(۷) مولانا شکر اللہ مبارکپوری۔ ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم متوفی ۱۹۴۱ء۔

اگر متحدہ ضلع اعظم گڑھ سے مدرسہ احیاء العلوم، مولانا شکر اللہ مبارکپوری اور اس وقت کے مبارکپوری علمائے کرام کے نام خارج کردیے جائیں تو اس ضلع کی دینی، علمی، ادبی، سیاسی، فکری، سماجی اور تحریکِ آزادی کی کوئی داستان مکمل نہیں ہوسکتی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے قیام دارالمصنفین کے زمانہ میں علمائے مبارکپور کی دینی و علمی خدمات کا غلغلہ ہندوستان سے باہر عالم اسلام میں پہونچ چکا تھا۔ ''حیات شبلی'' کے مصنف کو محمد آباد کے ایک دو جج تو نظر آئے، مگر مبارکپور کے درجنوں جہابذۂ علم وفن نظر نہیں آئے۔ جن کے علمی، دینی اور ادبی سرمایہ کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔

انگریزوں کے دورِ غلامی میں جو ہندوستانی مسلمان سرکاری ملازم تھے، وہ ایک خاص طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے انگریز آقا کی غلامی میں اپنی ساری ذہنی وفکری صلاحیتیں خرچ کرتے تھے اور آزادی کے بعد آج بھی مسلمان سرکاری ملازم پوری زندگی اپنی ساری ذہنی وفکری صلاحیت حکومتِ وقت کی وفاداری کے تنور میں جھونکتے ہیں، مگر صلہ میں ان کو حکومت کی طرف سے صرف غداری کا تمغہ دیا جاتا ہے۔

مسلمان سرکاری ملازمین کا ہندوستانی مسلمانوں کے قومی، ملی، سیاسی اور معاشی مسائل سے کچھ لینا دینا نہ تو آزادی سے پہلے تھا، نہ ہی آزادی کے بعد۔ مبارکپور کی جو علمی، دینی، سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی ہے وہ صرف اہل مبارکپور کی دینداری، عزیمت اور جوہرِ اصلی کی مرہونِ منت ہے۔ کیوں کہ آزادی کے پہلے اور اس کے بعد اس کے ساتھ سرکاری سطح پر کوئی علمی یا معاشی تعاون نہیں رہا ہے۔ مبارکپور کی ہمہ گیر ترقی میں صرف مبارکپوری عوام کے حوصلہ اور دینی غیرت وحمیت کا دخل ہے۔ ان سارے حقائق کے باوجود گمنام بستیوں کی طرح اس کا ذکر کرنا کتنی لغو اور بے تکی بات ہے۔ مگر قلم تو محکوم ہوتا ہے اور صاحبِ قلم حاکم۔ قلم کا کام صرف فرماں برداری کرنا ہے اور بس اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے۔

بہرحال مبارکپور قدیم دَور سے علم وفضل اور صنعت وحرفت کا مرکز رہا ہے۔ مگر روایتی طور پر اسے نظر انداز کرنے کے لیے تجاہل عارفانہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مورّخِ اسلام مبارکپوری نے ''تذکرۂ علمائے مبارکپور'' کی تصنیف میں تنکے تنکے چنے ہیں، تب کہیں جا کر تاریخ مبارکپور کا آشیانہ تیار ہو سکا ہے۔ گویا کہ یہ کتاب اس موضوع پر بنیاد کا پتھر ہے اور مصنفؒ نے مبارکپور کی تاریخی کڑی جوڑنے میں رات دن کی قید سے آزاد ہو کر جگہ جگہ سے معلومات حاصل کی ہے اور تاریخ مبارکپور کو خواب وخیال کی دنیا سے نکال کر کتابی شکل دی ہے۔ اس موقع پر اقبال سہیل کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

کچھ کھیل نہیں گلچیں تعمیر نشیمن کی
بکھرے ہوئے تنکوں کو چُن چُن کے سجانا ہے

یہ کتاب تاریخ مبارکپور رقم کرنے والوں کے لیے نقش اوّلین ہے۔ جون ۱۹۷۴ء میں شائع ہونے کے بعد آپ نے ۲۳ رسال میں بعض ان علماء کے حالات اس کتاب میں بڑھا دیے ہیں، جو اُن کی زندگی میں فوت ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں مفید اور اہم اضافہ کیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ ایڈیشن اسی اضافہ شدہ حصہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مولانا خالد کمال کا تعارف بھی شامل کرلیا گیا ہے، جو اگرچہ مورّخِ اسلام کے قلم سے نہیں ہے، مگر بیٹے ہونے کی وجہ سے اس کی شمولیت ضروری سمجھی گئی۔ مصنف نے بعض عبارتوں کے ترجمے نہیں کیے تھے، ان کے ترجمے بھی شامل ہیں، مگر مصنف کی عبارت سے امتیاز قائم کرنے کے لیے قوسین میں سلمان یا قمر لکھ دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو قبول فرما کر مصنف کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین یارب العالمین۔

طالب دعا

قاضی سلمان مبارکپوری

مدیر: قاضی اطہر اکیڈمی
مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، (یوپی) انڈیا
المرقوم ۱۸؍ رمضان ۱۴۲۸ھ
مطابق یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء

دعوتِ نظر

از: علامہ انور صابری

عارضِ الفاظ میں عکسِ جمالِ طور دیکھ
آفتابِ عظمتِ ماضی کا فیضِ نور دیکھ

تذکرے اسلاف کے بخشیں گے روحوں کو حیات
باہمہ کیف و نشاطِ جذبۂ مسرور دیکھ

اطہر و پاکیزۂ جذباتِ اطہؔر کی قسم
دورِ حاضر میں علاجِ خاطرِ رنجور دیکھ

آشنا ہوکر عمل سے جائے گا جو تافلک
وہ نیا رنگِ شعورِ فطرتِ مستور دیکھ

جس میں پر تو ہے قرونِ خیر کے ایمان کا
ہوش کی آنکھوں سے ''تاریخ مبارکپور'' دیکھ

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے

مختصر حالاتِ زندگی

از: مولانا قمرالزماں مبارکپوری۔ جعفر لائبریری مبارکپور ضلع اعظم گڑھ

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا خاندانی نام عبدالحفیظ بن شیخ حاجی محمد حسن ہے۔ انھوں نے ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷؍مئی ۱۹۱۶ء کو محلہ حیدرآباد قصبہ مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، صوبہ اتر پردیش کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو مغل بادشاہ ہمایوں کے دورِ حکومت میں راجہ سید شاہ مبارک رحمۃ اللہ علیہ بانی مبارکپور کے ہمراہ ضلع الٰہ آباد کے کڑا مانک پور سے ترکِ سکونت کر کے یہاں آباد ہوا تھا۔

مولانا کے خاندان میں ایک عرصہ تک نیابتِ قضا کا عہدہ قائم تھا۔ اسی لیے آپ بھی قاضی کہے اور لکھے جاتے ہیں۔ انگریزوں کے آخری دَور میں محکمۂ قضا ایک اعزازی محکمہ تھا۔ مبارکپور کے قریب محمد آباد گوہنہ دارالقضا تھا اور قاضی محمد سلیم متوفی ۱۲۶۶ھ، ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ سے سولہ برس تک محمد آباد گوہنہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ جنھوں نے مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے جدِّ اعلیٰ شیخ امام بخش کو مبارکپور کا نائب قاضی مقرر کر کے، اس حلقہ میں اقامتِ دین، امامتِ جمعہ وعیدین، پیش آمدہ وقتی مسائل، نکاح، طلاق وراثت، اختلاف بین المسلمین کے قضایا وغیرہ کی انجام دہی کی ذمہ داریاں سپرد کیں۔

مورّخِ اسلام مبارکپوریؒ کے پردادا شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا کے دو صاحبزادے تھے، میاں جی حاجی لعل محمد اور میاں جی ولی محمد۔ میاں جی ولی محمد کے دو لڑکے تھے، میاں جی محمد شفیع مرحوم اور میاں جی حاجی محمد عمر مرحوم۔ میاں جی حاجی لعل محمد زندگی بھر کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی روایات کے حامل رہے۔ حج وزیارت کی دولت

حاصل کی۔ ان کی اولاد میں ۴رصاحبزادے اور دولڑکیاں تھیں۔ (۱) میاں جی عبداللہ متوفی ۱۵ررجب ۱۳۵۷ھ (۲) میاں جی حاجی اسداللہ متوفی ۲۵ر صفر ۱۳۸۲ھ (۳) میاں جی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵ررجب ۱۳۶۵ھ (۴) میاں جی حاجی محمد حسن متوفی ۲۸رفروری ۱۹۷۸ء۔ الحمدللہ میاں جی حاجی لعل محمد کے چاروں صاحبزادوں نے متاہل زندگی گزاری اور ان کا خاندان اپنے وطن مبارکپور میں رہتا ہے۔

مورّخِ مبارکپوریؒ کے والد شیخ حاجی محمد حسن بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے کل ۶ راولادیں ہوئیں، جن میں ۵ رلڑکے اور ایک لڑکی۔ سب نے متاہل زندگی گزاری جن کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

(۱) مورّخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ متوفی بروز یکشنبہ ۲۸ رصفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ رجولائی ۱۹۹۶ء اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ آپ کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں، جن میں ۶ رلڑکے اور دولڑکیاں ہیں۔

(۲) محمودہ خاتون متوفیہ ۱۹۹۵ء ان کی کل آٹھ اولادیں ہیں، جن میں ۶ رلڑکے اور دولڑکیاں ہیں۔

(۳) قاضی حیات النبی متوفی ۱۹۸۰ء ان کے دولڑکے ہیں۔

(۴) قاضی ضیاء النبی متوفی ۱۹۹۴ء کل پانچ اولادیں ہیں، جن میں دولڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

(۵) قاضی غلام النبی بقید حیات ہیں اور ۶ راولاد کے والد ہیں، جن میں دولڑکے اور چارلڑکیاں ہیں۔

(۶) قاضی عبدالعزیز باحیات ہیں اور ان کی کل ۹ راولادیں ہیں، جن میں ۷ رلڑکے اور دولڑکیاں ہیں۔ آپ کے تمام بھائی اور ان کی اولاد مبارکپور میں رہائش پذیر ہیں اور زندگی کی دوڑ میں جدوجہد کررہے ہیں۔

مولانا نے گھر پر اپنے والدین مکرمین سے اور محلہ کے ایک گھریلو مکتب میں تیسرا

پارہ پڑھنے کے دوران مدرسہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ لیا۔ یہاں حافظ علی حسن سے ختم قرآن کر کے، منشی عبد الوحید لاہر پوری سے اُردو، منشی اخلاق احمد سے ریاضی اور مولانا نعمت اللہ مبارکپوری سے فارسی وخوشنویسی کی تعلیم پائی۔ صفر ۱۳۵۰ھ سے شعبان ۱۳۵۹ھ تک تقریباً ۱۰/برس اسی مدرسہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے باصلاحیت اساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین مبارکپوری متوفی ۲۲/محرم ۱۴۰۴ھ سے اکثر وبیشتر کتابیں، مولانا شکراللہ مبارکپوری متوفی ۵/ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ سے منطق وفلسفہ کی زیادہ تعلیم، مولانا بشیر احمد مبارکپوری متوفی ۳/شوال ۱۴۰۴ھ سے علم منطق کی بعض کتابیں، مولانا محمد عمر مظاہری مبارکپوری متوفی ۱۳/اپریل ۱۹۹۵ء سے تفسیر جلالین اور اپنے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسولپوری متوفی ۱۱/صفر ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوافی اور ہیئت کے بعض اسباق کی تعلیم حاصل کر کے اُردو، فارسی اور عربی میں صاحبِ کمال ہوئے۔ درمیان میں ۱۳۵۴ھ میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں داخلہ لے کر مقاماتِ زمخشری، دیوان حماسہ وغیرہ کتابیں پڑھیں، مگر کسی وجہ سے سال پورا ہونے سے پہلے ہی مبارکپور آ کر احیاء العلوم میں تعلیم پانے لگے۔ بہرحال آخری سال ۱۳۵۸ھ میں دوبارہ دَورۂ حدیث کے لیے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد گئے اور وہاں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، مولانا سید محمد میاں متوفی ۱۶/شوال ۱۳۹۵ھ سے سنن ترمذی دیوان حماسہ اوّل، مقاماتِ زمخشری اور مولانا محمد اسماعیل سنبھلی متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھ کر ۱۳۵۹ھ[1] میں سندِ فراغ حاصل کی۔

مولانا نے اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اپنی قوت مطالعہ وکثرت کتب بینی کی وجہ سے عربی زبان وادب کے متعلقات ومبادی جیسے لغت، اشتقاقِ ابواب، صلات نحو، صرف، خاصیات وغیرہ کے باب میں بڑی صلاحیت وبصیرت حاصل کر لی تھی۔ ان کے عربی کا ذوق مقامات حریری، دیوان حماسہ، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ کے درس اور

[1] مئے طہور میں ۱۳۶۰ھ غلطی سے درج ہے۔ (قمر)

لغت وادب کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ابتداء میں کڑی محنت ومطالعہ کی برکت تھی کہ قاضی صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی میں مشکل مقامات کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت پیدا کر لی تھی، جس کی وجہ سے اس دَور کو انھوں نے نہایت نشاطِ علمی کے ساتھ گزارا۔ یہی وجہ تھی کہ قاضی صاحب کو اپنی طالب علمی کے دَور ہی میں مدرسہ احیاء العلوم کے عربی تلامذہ کو بعض درسی کتابوں کی تعلیم وتدریس کی ذمہ داری ارباب بست وکشاد کی طرف سے سونپی گئی، جس کو مورّخِ مبارکپوریؒ نے نہایت خوش اُسلوبی اور تمام تر علمی کامیابیوں کے ساتھ سرانجام دیا۔

مولانا کو ابتدا ہی سے کتابوں کے جمع کرنے اور خریدنے کا شوق تھا۔ اُنھوں نے جِلد سازی کر کے اس کی رقم سے بڑی اہم اہم کتابیں جمع کیں۔ کتاب ومطالعہ کے اسی ذوق کی وجہ سے ان میں مضمون نگاری اور شعر وشاعری کا رُجحان پیدا ہوا۔ اس طرح مولانا کا پہلا مضمون ''مساوات'' کے زیرِ عنوان رسالہ ''مومن بدایوں'' کے دسمبر ۱۹۳۴ء مطابق ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوا جو ان کے حصولِ تعلیم کی مُدّت ہے۔ اسی طرح مولانا کی پہلی نظم فرقان بریلی کے شمارۂ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ میں ''مسلم کی دعا'' کے عُنوان سے چھپی۔

مولانا مبارکپوری تکمیل تعلیم کے بعد شوال ۱۳۵۹ھ سے محرم ۱۳۶۴ھ تک یعنی تقریباً سوا چار سال تک اپنی مادرِ علمی احیاء العلوم میں عربی کے مدرّس رہے۔ کچھ وقفہ کے بعد شوال ۱۳۶۶ھ سے صفر ۱۳۶۷ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء کل پانچ ماہ تک اسی مدرسہ میں عربی کے عارضی مدرّس بھی رہے۔

مولانا فراغت کے بعد کافی مالی پریشانی میں رہے، امرتسر اور لاہور گئے۔ وہاں جنوری ۱۹۴۷ء میں مولانا عثمان فارقلیط مدیر روزنامہ ''زمزم'' کے نائب اڈیٹر بنائے گئے اور ان کی رہنمائی میں صحافت میں قدم رکھا، لیکن وہ ۱۰؍جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کی شورش سے وطن لَوٹ آئے اور پھر کبھی نہ جا سکے۔ محرم ۱۳۶۷ھ مطابق نومبر ۱۹۴۷ء تا رجب

۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء بہرائچ میں ہفتہ وار اخبار ''انصار'' کے مُدیر رہے۔ جو سات ماہ کے بعد حکومتِ اُتر پردیش کی معاندت کے بعد بند ہوگیا۔ شوال ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء سے شعبان ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۹ء تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرّس رہے۔ یہاں کا ایک سالہ تدریسی دَور مولانا کی علمی و قلمی زندگی کا اہم ترین دَور ہے۔ ''رجال السند والہند'' کی ابتداء یہیں ہوئی، جو علمائے سِندھ اور ہند کے احوال وکوائف میں ایک اہم کتاب سمجھی گئی ہے۔

تلاشِ معاش میں قاضی صاحب ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق نومبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی گئے اور وہاں جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی کے دفتر میں کام کرنے لگے۔ اس طرح آٹھ ماہ گزارنے کے بعد جب ۱۵/ جون ۱۹۵۰ء کو روزنامہ ''جمہوریت'' بمبئی کا پہلا شمارہ اشاعت پذیر ہوا تو مولانا اس کے نائب مُدیر بنادیے گئے۔ آپ کی محنت اور لگن کی وجہ سے یہ روزنامہ چند ہی دِنوں میں بمبئی کا مقبول ترین روزنامہ سمجھا جانے لگا اور روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی کی مقبولیت اور دائرۂ اثر کو بھی متاثر کرنے لگا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں بمبئی کے مقبول ترین اخبار ''انقلاب'' سے وابستہ ہوکر اس کے نائب مُدیر کے فرائض انجام دینے لگے۔ مولانا کے مضامین اور قلمی نوادر کی وجہ سے ''انقلاب'' کو بہت فروغ ملا۔ اس اخبار میں مولانا کے تو ہونے کو تین تین چار چار کالم ہوتے تھے مگر ان میں احوال ومعارف کو جو ہر قسم کی معلومات کا خزانہ ہوا کرتا تھا۔ قدیم وجدید دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ ۲۳/ فروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰/ اپریل ۱۹۹۱ء تک کے ''انقلاب'' میں مطبوع احوال ومعارف کو اگر کتابی صورت میں الگ الگ عنوان کے تحت مرتب کیا جائے تو کئی معیاری کتابیں صورت پذیر ہوسکتی ہیں اور اس طرح یہ منتشر اور پھیلا ہوا کالم علمی حلقوں میں مصادر ومراجع کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر یہ کام ایک مرد کار کی توجہ سے ہی انجام پاسکتا ہے۔

جب ۱۴/ مئی ۱۹۵۴ء کو ہفت روزہ ''البلاغ'' بمبئی کا اجرا ہوا تو اسی کے ساتھ

ماہنامہ ''البلاغ'' کی تاسیس بھی ہوئی اور دوسرے دو مدیروں کے ساتھ مولانا کو بھی اس کی ادارت میں شریک کیا گیا۔ کچھ دِنوں کے بعد دونوں مدیران نے رسالہ سے ترکِ تعلق کرلیا، مگر مولانا مبارکپوری نے تقریباً ۲۶ رسال تک ''البلاغ'' کا مُدیر تحریر رہ کر اس کو جاری رکھا۔

مولانا کی علمی زندگی، علمی و قلمی انہماک و اشتغال، سادگی و پُرکاری، توکل واستغنا، ایمان و یقین، خود اعتمادی و خوش اعتقادی، حزم و احتیاط، نظم و ضبط، کم گوئی واستغراق، تفکر و تبحر، محنت و جانفشانی، جگر کاوی و دل سوزی، یکسوئی و دل جمعی، ترتیب و تنظیم، تہذیب و شائستگی، خوش نظری و جہاں بینی اور خوش روئی و خوش خلقی سے عبارت تھی۔ بمبئی جیسے دولت کے شہر میں رہ کر مولانا کو دنیا داری اور دولت کمانے کے بہت سے مواقع نصیب ہوسکتے تھے، مگر مولانا میں جو دنیا بیزاری، علم پروری اور اخلاص دینی کا جذبہ تھا، اس نے دولت کمانے کے تمام راستوں سے گریز کیا۔ سعودیہ عربیہ اور عرب ممالک کے سلطانوں، رئیسوں، تاجروں اور قدر دانوں میں اپنا علمی اثر ونفوذ رکھنے کے باوجود اس طرح کی تمام پیشکش کو انھوں نے ٹھکرا دیا، جس سے دولتِ دنیا میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ مولانا اپنے دینی و علمی اور قلمی اشتغال میں یوں کھوئے رہے کہ قوتِ لایموت سے صرف تعلق باقی رکھا، دوسرے تمام رشتوں اور رسم دل بستگی و دل جوئی کو اپنی ذاتی زندگی میں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ آپ کو پانچ مرتبہ حج وزیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔

مولانا صرف ایک ادیب اور شاعر ہی نہیں تھے، وہ دین وسیاست کے ساتھ عملی زندگی میں بھی ربط رکھتے تھے اور دوسری تحریکوں سے دلچسپی رکھنے کے دوش بدوش علمی و دینی اداروں کی تاسیس میں بھی سرگرمی دکھاتے تھے۔ ۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء کو مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی جاری کیا، جو آج بھی ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اسی طرح مبارکپور میں تصنیف وتالیف کے لیے دائرۂ ملیہ قائم کیا۔ اس ادارہ کے ذریعہ آپ کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں۔ جدید تعلیم کے لیے ۱۰ر اپریل ۱۹۷۶ء کو انصار گرلس اسکول

مبارکپور اور ۱۴۰۰ھ میں مدرسہ حجازیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔

قاضی صاحب کے اساتذۂ احیاء العلوم میں کوئی ادیب وشاعر، صحافی وانشاپرداز اور مصنف ومرتب نہیں تھا، مگر انھوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد مہارت سے اس تصور کو عملاً سچ کر دکھایا کہ اگر انسان میں شاہین کا تجسس اور چیتے کا جگر ہے نیز عزم وحوصلہ کی کمی نہیں ہے تو وہ چھوٹی جگہ رہتے ہوئے بھی مرحلۂ وہم وگماں سے گزر کر رجال علم کی صف میں اپنی جگہ بنا سکتا ہے اور معاشرہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلا سکتا ہے۔ مولانا کی ایک ایک سطر اپنے اندر علمی وتعلیمی نشاط، تاریخی وکتابی جذبۂ شوق، بلند حوصلگی، عالی ہمتی، خودسازی وعہد سازی کا تموج واہتزاز رکھتی ہے۔

مورّخِ اسلام مبارکپوریؒ کے زرنگار قلم سے پچاس کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ سب سے پہلی کتاب ''اسلامی نظام زندگی'' ۱۹۴۹ء میں بمبئی سے شائع ہوئی اور سب سے آخری کتاب وفات سے چند روز پہلے ۱۹۹۶ء میں ''خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات'' شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی۔ ان کی اکثر کتابیں دوبارہ شائع ہورہی ہیں۔ آپ کی کتاب ''عرب وہند عہد رسالت میں'' اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا ترجمہ عربی اور سندھی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ''رجال السند والہند'' کا اُردو ترجمہ منتظر اشاعت ہے۔ آپ کی زندگی میں بعض کتابیں شائع نہیں ہوسکی تھیں، جن کی اشاعت کی اب تیاری ہو رہی ہے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ائمہ اربعہ
(۲) اسلامی نظامِ زندگی
(۳) افاداتِ حسن بصری
(۴) اسلامی شادی
(۵) اسلام میں قربانی کی حقیقت اور صفات مومن

(۶) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ

(۷) آثار و اخبار

(۸) بناتِ اسلام کی دینی و علمی خدمات

(۹) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں

(۱۰) تاریخ اسماء الثقات (عربی)

(۱۱) تذکرہ علمائے مبارکپور

(۱۲) تدوین سیر و مغازی

(۱۳) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول (عربی)

(۱۴) الحکومات العربیہ فی الہند والسند (عربی)

(۱۵) حج کے بعد

(۱۶) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان

(۱۷) خلافتِ امیہ اور ہندوستان

(۱۸) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان

(۱۹) خیر القرون کی درسگاہیں

(۲۰) خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات

(۲۱) الخطبات والرسائل العربیہ (عربی)

(۲۲) دیارِ پورب میں علم اور علماء

(۲۳) دعاءِ ماثورہ

(۲۴) رجال السند والہند الی القرن السابع (عربی)

(۲۵) سوانح امام جوزی

(۲۶) صالحات

(۲۷) طبقات الحجاج

(۲۸) الطبابۃ عند العرب قبل انتشار الطب الیونانی (عربی)
(۲۹) العرب والہند فی عہد الرسالۃ (عربی)
(۳۰) العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین (عربی)
(۳۱) علیؓ وحسینؓ
(۳۲) علمائے اسلام کے القاب وخطابات
(۳۳) عرب وہند عہد رسالت میں
(۳۴) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں
(۳۵) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک
(۳۶) قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے سفرنامے
(۳۷) کاروان حیات (خودنوشت سوانح)
(۳۸) مآثر ومعارف
(۳۹) مسئلہ خلق قرآن کی سیاسی حیثیت
(۴۰) معارف القرآن
(۴۱) مسلمانوں کے ہر طبقہ میں علم اور علماء
(۴۲) مئے طہور (مجموعۂ کلام)
(۴۳) محمد کے زمانہ کا ہندوستان مع ہندوستان صحابہ کے زمانہ میں
(۴۴) مطالعات وتعلیقات
(۴۵) مکتوبات امام احمد ابن حنبلؒ
(۴۶) نسخہ شفاء
(۴۷) الہند فی عہد العباسیین (عربی)
(۴۸) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
(۴۹) ہندوسند کے قدیم علماء (رجال السند والہند عربی کا اردو ترجمہ)۔
(۵۰) ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت

مولانا مرحوم کے ان مستقل تصنیفی کاموں کے علاوہ سینکڑوں علمی، دینی اور تاریخی مقالات ومضامین ''البلاغ'' بمبئی، ''معارف'' اعظم گڑھ، ''برھان'' دہلی، ''صدقِ جدید'' لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند اور دیگر اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان بکھرے ہوئے علمی ودینی جواہر پاروں کو کتابی شکل دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مولانا کی علمی وقلمی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ حکومت ہند نے ۱۹۸۵ء میں صدرِ جمہوریہ ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۴ء ۱۹۸۶ء میں صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اعترافِ علمی میں دیگر تحائف اور نشانِ پاکستان دیا، اسی کے ساتھ پاکستانی دانشوروں کی طرف سے ''محسن سندھ'' کے خطاب سے بھی نوازے گئے۔

مولانا انجمن تعمیراتِ ادب، لاہور کے معتمد، مدرسہ مفتاح العلوم ہندوستانی مسجد بھیونڈی مہاراشٹر، انصار گرلس انٹر کالج مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش، جامعہ حجازیہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش کے بانی، دارالسلام ادری ضلع مئو اتر پریش کے نگراں، ادارہ التراث العربی کویت کے مشیر علمی، جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کے صدر، دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر کے صدر، انجمن خدام النبی بمبئی کے رکن، رویتِ ہلال کمیٹی بمبئی کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق اعزازی، برہان دہلی کے اعزازی مدیر، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ حسینیہ لال دروازہ ضلع جونپور اتر پریش اور جامعہ اشرفیہ نیا بھوج پور (بہار) کے رکن مجلس شوریٰ بھی بنائے گئے۔

اللہ نے مولانا کے علم، اولاد اور مال میں بڑی برکت دی ہے، جو کسی کسی کے ہی حصے میں آتی ہے۔ یہ مولانا کے دینی اخلاص، علمی انہماک، باطنی طہارت، تزکیۂ نفس اور دنیا بیزاری کا نتیجہ ہے۔ علمی دنیا کا یہ بطل عظیم اور رجل کریم یکشنبہ ۲۷ رصفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ رجولائی ۱۹۹۶ء کو شب ۱۰ ربجے علائق دنیا سے رشتہ توڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو رحمت وانوار کی بارشوں میں رکھے۔ آمین

اولاد واحفاد

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ دنیاوی نعمتوں کے اعتبار سے بھی خوش نصیب تھے۔ مولانا مرحوم کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں، جن میں چھ اولاد ذکور اور دو اولاد اناث تھیں۔ مولانا کے دو بچے شریف انور اور انور جمال صغرسنی ہی میں فوت ہو گئے۔ مولانا نے علم ودینداری کی جو روایات آگے بڑھائیں، ان کی اولاد میں بھی تعلیم و تعلم اور دین ودیانت کی وہ وراثت پروان چڑھی اور سب کے سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم یافتہ اور صاحب صلاحیت ہیں۔ بلکہ یہ سلسلہ اب اولاد سے گذر کر احفاد تک بھی آ گیا ہے اور ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی بہترین مثال پیش کر رہا ہے۔

(۱) مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ مرحوم کے سب سے بڑے فرزند مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ تھے۔ یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ان کی تاریخ ولادت ہے۔ بڑے ذہین وفطین وخوش مزاج تھے۔ ابتدائی اُردو کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کرنے کے بعد دو سال تک دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث مکمل کر کے ۱۹۵۸ء میں سند فراغ حاصل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر اپنے والد مرحوم کے ۱۹۵۱ء میں قائم کردہ مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ اس دوران آپ کی ذہانت وصلاحیت سے متاثر ہو کر حکومتِ مصر کے قونصل جنرل عبدالمنعم النجار نے مشہور عالمی درسگاہ جامعہ ازہر میں سرکاری وظیفہ پر داخلہ کے لیے زور دیا، لیکن مولانا قاضی اطہر اسلامی تہذیب وشرافت کی اقدار پر دل وجان قربان کیے ہوئے تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر سخت ذہنی اذیت ہوتی تھی کہ جامعہ ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے اسلامی لباس سے عاری اور بے ریش ہو جایا کرتے تھے اور اپنے رہن سہن میں یہود ونصاریٰ کا نمونہ

بن جاتے تھے، اس لیے مولانا کو وہاں بھیجنے میں سخت تکدر وتامل تھا۔ مگر جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو مولانا نے اپنے فرزند کے علمی وفنی کمالات اور دینی حمیت میں اضافہ کے لیے نشاط وانشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل کرادیا۔ پانچ برس تک لائق اساتذہ سے علم دین کی تکمیل کر کے ۱۹۶۷ء میں مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوئے اور حکومتِ سعودی عرب کی وزارتِ اسلامی امور کی طرف سے گھانا مغربی افریقہ میں مبعوث بنا کر دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے مامور کیے گئے۔ مغربی افریقہ میں مولانا خالد کمال کی علمی ودینی اور اصلاحی وتبلیغی سرگرمیوں نے قومی ودینی زندگی میں بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر حج سے روکا۔ مولانا خالد کمال نے گھانا میں چودہ برس تک اہم دینی وعلمی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے انگریزی میں ''اطہر'' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ حکومتِ سعودی عرب نے مولانا خالد کمال کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ تبادلہ کردیا، جہاں وہ اپنی وفات ۵/دسمبر ۱۹۹۹ء تک برسرکار رہے۔ آپ نے پندرہ بار حج بیت اللہ ادا کیا تھا۔

نیوزی لینڈ میں مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کر کے، اس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی۔ اس کی تعمیر وتزئین کے لیے مولانا خالد کمال نے یورپ اور امریکہ کا دورہ کر کے مالیات کی فراہمی کی تھی۔

مولانا خالد کمال میں بڑی خوبیاں تھیں، وہ ادیب وشاعر اور اسلامی دانشور بھی تھے۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں والد صاحب کی طرح قرطاس وقلم کی امانت انھیں حاصل ہوگئی تھی۔ ان کے مضامین نظم ونثر جو ''البلاغ'' اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے، ان سے علمیت اور ادبیت کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا بڑے ہنس مکھ اور محفل کو زعفران زار بنادینے والی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جہاں بھی ہوتے اپنی موجودگی کا

احساس دلاتے رہتے تھے۔ انھیں اداروں کو ترقی دینے اور انھیں قومِ مسلم کے لیے کارآمد بنانے کا بہت اچھا سلیقہ معلوم تھا۔ ۵/دسمبر ۱۹۹۹ء کو نیوزی لینڈ میں غریب الوطنی کی موت آئی وہیں پیوند خاک ہوئے:

مرتبہ بخشنے شہادت کا
موت پردیس ہی میں آدھمکی

مولانا خالد کمال مبارکپوری کے ایک لڑکے فوزان طارق اور باقی اولاد میں لڑکیاں ہیں۔ مولانا کی تمام اولاد متاہل زندگی گزار رہی ہیں اور سب کی سب نیوزی لینڈ میں مقیم ہیں، وطن آنا جانا رہا کرتا ہے۔

فوزان طارق کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں ہوئی، پھر نیوزی لینڈ میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی اور عربی پڑھنے کے لیے قاہرہ بھی گئے۔ فوزان طارق اس وقت نیوزی لینڈ میں سرکاری صیغۂ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

(۲) مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے دوسرے صاحبزادے قاضی حاجی ظفر مسعود صاحب ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۴۱ء ۴/جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ ہے۔ انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور سے پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد ایم پی انٹر کالج مبارکپور سے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ پھر دینی و مذہبی تعلیم کی لیے مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے پہلی پوزیشن میں عالم کا امتحان پاس کیا۔ دو مرتبہ شرف حج بیت اللہ حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں فخر المحدثین علامہ سید فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہو کر خصوصی سند حدیث سے نوازا۔ قاضی ظفر مسعود کی علمی و دینی سرگرمیوں سے کئی میدان سرسبز ہیں۔

انھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص تعلق حاصل ہے۔ مطالعہ کے موضوعات میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ ہے۔ مبارکپور میں لڑکیوں کی پہلی

انگریزی درسگاہ انصار گرلس انٹر کالج کے بانیوں میں سے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی انجمنوں، لائبریریوں اور اداروں کو وجود میں لانے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ انھیں موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب از بر ہیں اور ان کے استعمال میں بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انھوں نے مولانا قاضی اطہر کے سلسلے میں کئی اشاریے ترتیب دیے ہیں۔ جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کا بہتر فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ۹/اولادوں کی ولدیت کا شرف بخشا ہے۔ جن میں صرف ایک لڑکے مولوی قاضی فرحان سلمہٗ ہیں۔ ان کی ولادت ۱۱/نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی۔ ان کی ابتدائی اُردو اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور فراغت ایشیا کی شہرۂ آفاق درسگاہ دارالعلوم دیو بند سے ہوئی۔ گھر پر عائلی زندگی گزار رہے ہیں اور کاروبار میں اپنے والد کی مدد کر رہے ہیں۔

(۳) مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ کے تیسرے فرزند مولانا قاضی سلمان مبشر مبارکپوری (ولادت یکم جنوری ۱۹۵۱ء) ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم احیاء العلوم میں پانے کے بعد ایک سال کے لیے دارالعلوم دیو بند گئے اور وہاں سے ۱۹۷۲ء میں سند فراغ لینے کے بعد ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں کلیۃ الدعوۃ واصول الدین کی تکمیل کر کے حکومتِ سعودی عرب کی وزارت اسلامی امور کی طرف سے مبعوث بنا کر غانا مغربی افریقہ میں مامور کیے گئے۔ وہاں فیملی کے ساتھ ۱۴/برس رہے اور دینی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۹۲ء میں سعودی حکومت نے تبادلہ کر کے ہندوستان بھیجا اور مختلف مدارس میں انھوں نے تعلیم دی۔ اِس وقت دارالعلوم حسین آباد انجان شہید ضلع اعظم گڑھ میں استاذِ حدیث ہیں۔ آپ نے چھ مرتبہ حج کیا۔ اپنے والد مورّخِ مبارکپوریؒ کے علمی و دینی کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف افراد وادارہ سے مسلسل رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی جن کتابوں کے ایڈیشن ختم ہو گئے ہیں، ان کی

اشاعت ثانی اور جو کتابیں منتظر اشاعت ہیں ان کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کی تگ ودو میں اپنے وقتِ عزیز اور زرِ کثیر کو لگا رہے ہیں۔ جواہر القرآن کی ترتیب میں ہمہ تن مصروف ہیں، مورّخِ مبارکپوری نے قرآن کریم کی تفسیر متواتر چالیس برس تک لکھی تھی، جو روز نامہ ''انقلاب'' بمبئی کی روزانہ کی اشاعت میں چھپتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے۔ مولانا قاضی سلمان مبشر کے حبالۂ عقد میں مورّخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے حقیقی ماموں حضرت مولانا محمد یحییٰ رسولپوری کی صاحبزادی نزہت خاتون ہیں۔ جن کے بطن سے پانچ اولاد ہیں، جن میں تین اولاد ذکور اور دو اولاد اناث ہیں۔ بڑے صاحبزادے قاضی فیصل نے ابتدائی تعلیم غانا (مغربی افریقہ) میں حاصل کی اور اس کے بعد ۱۹۸۸ء سے اپنے تایا مولانا خالد کمال کے سایۂ شفقت میں رہ کر نیوزی لینڈ کے مختلف اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی۔ وکٹوریہ یونیورسٹی ولنگٹن سے بی ایس سی، کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ قابلیت کی سند حاصل کر کے اسی شعبہ میں ملازمت کر لی۔ پانچ سال کے بعد کمپنی نے انھیں اپنی نئی برانچ سڈنی (آسٹریلیا) میں کارِ منصبی کی انجام دہی کے لیے بھیج دیا، جہاں اب تک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ برسر کار ہیں۔ دوسرے صاحبزادے قاضی محمد ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم غانا میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ یہاں ۲۰۰۳ء میں ایم.اے. ویسٹ ایشیا اسٹڈی میں ٹاپ کیا اور مڈل کے مستحق ہوئے۔ اس وقت آسٹریلیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تیسرے لڑکے قاضی ریان احمد ہیں، جنھوں نے غانا میں پڑھنے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور کے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ سے بی کام کیا۔

(۴) مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد (متولد یکم جمادی الآخر ۱۳۷۳ھ) ہیں۔ جنھوں نے مدرسہ احیاء العلوم میں اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کیا اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ سے بی.اے. کیا۔

اس کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا۔ اس وقت انصار گرلس انٹر کالج میں امورِ مفوضہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی پرورش و پرداخت میں آٹھ اولادیں ہیں، جن میں ۲؍ذکور اور ۶؍اناث ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے قاضی عدنان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور سند فراغ مظاہر العلوم سہارن پور سے حاصل کی۔

(۵) اَمَۃُ الرحمٰن ام سلمٰی (پ یکم مارچ ۱۹۴۸ء مطابق ۱۹؍ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ) مولانا قاضی اطہر کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ جو اپنے نانہالی رشتے میں محمد آباد گوہنہ ضلع مئو کے رہنے والے ماسٹر مصباح الدین محمد رافع سے منسوب ہیں۔ اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ ماسٹر مصباح الدین مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی زوجہ سائرہ خاتون مرحومہ کے ماموں زاد ہیں۔ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی. ایس. سی کر کے گورکھپور یونیورسٹی سے ایم. ایس. سی. کیا۔ ۱۹۶۷ء سے اسلامیہ انٹر کالج فیروزآباد میں بائیلوجی کے لکچرار رہے ہیں۔ اب ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مع اہل وعیال فیروزآباد میں قیام ہے۔

مولانا قاضی اطہرؒ کے نواسے سعدالدین ولد ماسٹر مصباح الدین نے فیروزآباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فیض درس اٹھایا۔ اس کے بعد منی پال (کرناٹک) سے ڈینٹل کا کورس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے نیوزی لینڈ گئے۔ تکمیل تعلیم کر کے وہیں طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۶) مولانا کی چھوٹی بیٹی شمیمہ عائشہ (پ ۵؍شعبان ۱۳۶۹ھ) رضوان احمد علیگ نوادہ مبارکپور کے عقد مناکحت میں ہیں۔ جو مولانا کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ رسولپوری کے سگے نواسے ہیں۔ انھوں نے مبارکپور میں تحصیل علم کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی راہ لی اور وہاں رہ کر بی. اے. کیا۔ اس کے بعد ملک سعود یونیورسٹی ریاض (سعودیہ عربیہ) میں تکمیل درس کی۔ ۶؍اولاد میں ۴؍اولاد نرینہ اور ۲؍اولاد اناث ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے صفوان احمد ہیں۔ انھوں نے بمبئی میں الکٹرک انجینیر نگ کا کورس کر کے سعودیہ کی

الکٹرک کمپنی میں ملازم ہیں۔ دوسرے لڑکے شیبان ہیں اور برہان پور (ایم.پی.) میں بی.یو.ایم.ایس.کا میڈیکل کورس کر رہے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا قاضی اطہر کے اخلاص نیت کے اثرات کو اللہ نے اولاد و احفاد اور قریب کے رشتہ تک میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ خداوند قدوس کی بہت بڑی دین ہے۔

قمر الزماں مبارکپوری
یکم رمضان ۱۴۲۸ھ
۱۴ر ستمبر ۲۰۰۷ء

سلام

مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

سلام اُس ذات پر جس کا لقب ہے فخرِ انسانی
سلام اُس ذات پر آئی جو بن کر ظلِّ سُبحانی

سلام اُس ذات پر جو باعثِ تکوینِ عالم ہے
سلام اُس ذات پر جس کے سبب کونین کا دَم ہے

سلام اُس ذات پر جس کا تبسّم رُوحِ میخانہ
سلام اُس ذات پر جس کی نگاہیں جام و پیمانہ

سلام اُس ذات پر جس کی ادا صبحِ حنیفانہ
سلام اُس ذات پر جس کی ادائیں شامِ میخانہ

سلام اُس ذات پر جس کی صباحت فخرِ کنعانی
سلام اُس ذات پر جس کی ہیں زلفیں سلکِ نورانی

سلام اُس ذات پر روئے جو اُمّت کی خطاؤں پر
سلام اُس ذات پر جس نے دُعائیں دیں جفاؤں پر

سلام اُس پر جو چمکا کفر کی کالی گھٹاؤں میں
سلام اُس پر جو نغمہ بن گیا روتی فضاؤں میں

سلام اُس پر جو اٹھا ہاتھ میں تیغِ دو دم لے کر
سلام اُس پر جو آیا ساتھ بار انِ کرم لے کر

سلام اُس پر جو جلوہ گر ہوا روشن جبیں ہوکر
سلام اُس پر جو آیا رحمۃ اللعالمیں ہو کر!

سلام اُس پر جو سویا بھی تو حالِ قوم پر روکر!
سلام اُس پر جو راتیں کاٹ دیتا خاک پر سوکر

سلام اُس پر جو دیتا ہے فقیروں کو بھی دارائی
سَلام اُس پر جو دیتا ہے مریضوں کو مسیحائی

سلام اُس پر جو ہے شمعِ ہُدا انوارِ سُبحانی
سلام اُس پر جو ہے تفسیرِ رحمت، فیضِ ربّانی

سلام اُن پر ہو اور اُن کے صحابہ کی جماعت پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے فدا کاروں کی تربت پر

سلام اُن پر ہو اور اُن کے گلوں کی پاک نکہت پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے لگائے باغِ جنت پر

سلام اُن پر ہو اور اُن کی ادا پر مرنے والوں پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے کنارے سارے ہالوں پر

سلام ان پر ہو اور ان کے فدا پُر جوش لوگوں پر
سلام ان پر ہو اور ان کے کفن بردوش لوگوں پر

مسلم کی دعا

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی پہلی نظم جو ماہنامہ ''**الفرقان**'' بریلی بابت جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ کے صفحہ ۳۲ پر شائع ہوئی۔ مولانا اُس وقت مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور کے طالب علم تھے۔

الٰہی پھر وہی ساقی وہی میخانہ ہو جائے
شبستانِ جہاں توحید کا کاشانہ ہوجائے
حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہو جائے
ہر اِک فردِ بشر اسلام کا پروانہ ہو جائے

الٰہی! پھر پتنگوں میں اُمنگ و سوز پیدا کر
الٰہی! پھر رُخِ اسلام پر دُنیا کو شیدا کر

خدا یا! پھر زمانہ کی ہوا اِک دم پلٹ جائے
حجابِ خوابِ غفلت پھر مسلمانوں سے ہٹ جائے
خدایا! تختۂ باطل جہاں سے پھر اُلٹ جائے
بلا کا رِشتۂ باطل دلِ مسلم سے کٹ جائے

الٰہی! قطرۂ نیساں صدف میں پھر دمک اُٹھے
الٰہی! گوہرِ ایماں سے پھر دنیا چمک اُٹھے

دلِ مسلم کو پھر تو جوشِ ایمانی سے تڑپا دے
ذرا اک بار پھر اسلام کے شیروں کو بھڑا دے
حرارت وہ عطا کر جو پہاڑوں کو بھی پگھلا دے
ذرا آواز گلّہ باں کی پھر گلّوں میں پہنچا دے

الٰہی پھر رہِ اسلام میں قربان ہو جائیں
فدا کارِ بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ ہو جائیں

خدایا! پھر کوئی بو بکرؓ سا انسان پیدا کر
مسلمانوں میں پھر تو باحیا عثمانؓ پیدا کر
جلالِ حضرتِ فاروقؓ کی سی آن پیدا کر
جنابِ حیدرِ کرّارؓ سا ذیشان پیدا کر

الٰہی! قرنِ اوّل دورِ حاضر کو بنا دے تو
الٰہی! خیرو برکت کا زمانہ پھر دکھا دے تو

الٰہی! غازیِ اسلام خالدؓ کو اُٹھا دے پھر
جنابِ عمرو ابن عاصؓ کو ہم سے ملا دے پھر
جنابِ سعدؓ گہری نیند سوتے ہیں جگا دے پھر
کہاں ہیں بوعبیدہؓ اے خدا اُن کو دِکھا دے پھر

ہمیں اب تختۂ فرعونیت کو پھر اُلٹنا ہے
ہمیں اطہر! بتوں کی سلطنت کو پھر پلٹنا ہے

پیش لفظ

از: مولانا عبید الرحمٰن صاحب قمر مبارکپوری

مسلمانوں کے ملی وقومی محاسن ومفاخر میں تاریخ وتذکرہ کا فن نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس کے ذریعہ اسلامی و دینی کارناموں اور علمی وفنی ورثہ کو سلف سے خلف تک پہنچایا ہے اور ایسا مربوط تعلق قائم کیا ہے، جس کی کوئی کڑی ٹوٹی نہیں ہے۔ تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری درحقیقت فن اسماء الرجال کا ایک وسیع شعبہ ہے، جس میں آگے چل کر بڑی وسعت پیدا ہوئی اور علماء نے اسلامی بستیوں اور خاندانوں کے حالات قلم بند کیے۔ چناں چہ مآثر الکرام، تذکرۂ علمائے بلگرام، سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان، آثار الاوّل فی تراجم علمائے فرنگی محل، مناقب غوثی، تذکرۂ علمائے سہسوان، کاملان رام پور، تذکرۂ مشائخ بنارس، تجلی نور، تذکرۂ مشاہیر جونپور، تذکرۂ علمائے ہند، تذکرۂ علمائے حال اور تراجم علمائے اہل حدیث وغیرہ صدہا کتابیں ہندوستان میں لکھی گئیں۔ جن میں یہاں کے علمی ودینی شہروں اور خاندانوں کے حالات اور علماء وفضلاء کے تراجم درج ہیں۔ ان کتابوں کی افادیت وضرورت مسلم ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے ہمارے قصبہ مبارکپور اور اس کے اطراف کے علماء وفضلاء اور بزرگوں کا ایک جامع تذکرہ مرتب کیا ہے، جو وثیقہ اور سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سطر سطر اہل علم وتحقیق کے لیے بڑی قیمتی ثابت ہوگی اور ماخذ بنے گی۔ مبارکپور قدیم زمانہ سے مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے اور یہاں ہر طبقہ میں مشاہیر علماء وفضلاء پیدا ہوئے ہیں۔ اس کتاب سے یہاں کی دینی وعلمی خدمات اور علماء کے کارناموں کا بخوبی علم ہوگا اور خاص بات یہ ہے کہ مصنف کے محتاط قلم نے کسی تذکرہ میں جانب دارانہ لغزش نہیں کھائی ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ تذکرۂ علمائے مبارکپور کے نام سے تاریخ وتذکرہ کی ایک مستند اور صاف ستھری کتاب ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔

مقدمہ

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

الحمدلله رب العالمين والصلوٰة والسلام على
رسوله الكريم وآلهٖ واصحابهٖ اتباعه اجمعين۔

شیرازِ ہند پورب کے مردم خیز قصبات میں ایک علمی ودینی اور صنعتی قصبہ مبارکپور بھی ہے، جو قاسم آباد کے نام سے اپنے اقبال وادبار کا ایک دَور پورا کر کے مبارکپور کے نام سے تاریخ کے نئے دَور میں داخل ہوا اور کڑا مانک پور کے مشہور روحانی خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم و چراغ حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۲؍شوال ۹۶۵ھ نے شہنشاہ ہمایوں نصیر الدین محمد بن بابر متوفی ۷؍ربیع الاوّل ۹۶۳ھ کے دورِ سلطنت میں اسے دوبارہ اپنے نام سے آباد کیا۔ بعد میں راجہ مبارک شاہ مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن بھی ہوئے۔ مگر راقم الحروف کا خاندان جو ان کے ہمراہ مانک پور سے یہاں آیا، یہیں مستقل آباد ہو کر حکومتِ وقت کی طرف سے نیابتِ قضا کا عہدہ سنبھالتا رہا اور راجہ مبارک شاہ کے بعد اس قصبہ میں گویا ان کا نائب بن کر رہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس دیار میں یہ قصبہ جس قدر قدیم اور مردم خیز ہے، اسی قدر مسلمان مورّخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس کی طرف سے بے اعتنائی کی ہے۔ اسی لیے یہاں کی کسی قسم کی علمی ودینی سرگرمی یا کسی علمی ودینی شخصیت کا حال نہیں ملتا۔ حالاں کہ یہاں پر اسلامی ودینی خدمات کے مختلف گوشوں میں جس قدر زیادہ اور اہم کام ہوا ہے، اطراف کی کسی بستی میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ اس تقصیر کے نتیجے میں اس کے علماء وفضلاء اور مشائخ اور ان کے کارنامے تاریخ کی لوح پر ابھر نہ سکے اور مسلمان

اپنے اسلاف کے ایک بڑے طبقہ کی خدمات سے بے خبر رہے۔

اس عبرت ناک اور ساتھ ہی حیرت ناک حقیقت کا احساس مجھے طالب علمی کے زمانے ہی سے رہا اور اس زمانے کی حیثیت کے مطابق قصبہ کے علماء وفضلاء اور اعیان ومشاہیر کے حالات تلاش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تقسیم ملک کے بعد سہ روزہ ''زمزم'' لاہور سے ترکِ تعلق کر کے ہفتہ وار ''انصار'' کی ادارت کے سلسلے میں بہرائچ جانا ہوا اور وہیں جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ میں تذکرۂ مشاہیر اعظم گڑھ ومبارکپور کے نام سے غیر مرتب ونامکمل معلومات جمع کرتا رہا۔ بعد میں خیال ہوا کہ خود مبارکپور کے علماء ومشاہیر کے حالات کی تلاش وجستجو بہت زیادہ دقّت طلب اور وقت طلب ہے۔ اس لیے پہلے اپنے وطن اور اہل وطن کے حق کی ادائیگی کی کوشش کرنی چاہیے۔ چناں چہ پچیس سال کی تلاش وتحقیق کے بعد جو کچھ مل سکا ''تذکرۂ علمائے مبارکپور'' کے نام سے مرتب کیا جارہا ہے۔ کسی بے آب وگیاہ میدان میں چمن بندی آسان نہیں ہے۔ میں نے اس شجرۂ مبارکہ کو بڑی محنتوں کے بعد ''شجر سایہ دار'' بنایا ہے۔

میرے آباواجداد کی بسائی ہوئی بستی کے اربابِ فضل وکمال کی یہ خدمت اس شدتِ احساس کا نتیجہ ہے کہ ان بزرگوں کے خاندانوں کا استقبال میرے خاندان نے کیا۔ ان کو اپنے جوار میں جگہ دے کر ان کی دینی وعلمی خدمت کی، بلکہ آج تک کسی نہ کسی حد تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان مخدوموں اور بزرگوں کا یہ حق میرے اوپر ہے کہ میں ان کے علمی ودینی کارناموں اور ان کی اسلامی وملی خدمات کی امانت ناظرین تک پہنچاؤں۔ میں نے اس حق کی ادائیگی میں دیدہ ودانستہ خیانت اور تقصیر نہیں کی ہے، بلکہ ایک غیر جانب دار مورّخ اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے یہ خدمت انجام دی ہے۔ مذہبی اختلاف اور ذات وبرادری کی سطح سے بلند ہو کر یہ کام کیا ہے اور ان علماء وفضلاء اور مشائخ کی تذکرہ نویسی میں نہ قدیم خانقاہی حلقہ کی طرح کشوف وکرامات اور القاب سے کام لے کر ان کو مافوق البشر بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ آج کل کے ادیبوں اور

انشاپردازوں کی طرح قلم کی جولانی وسحرکاری سے ان کوافسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ جس سیدھی سادی زندگی کے مالک تھے، ان کے تذکروں میں وہی سیدھا سادا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

میں نے اس کتاب کی تالیف کے لیے معلومات حاصل کرنے میں بڑی محنت کی ہے اوراپنے بزرگوں کے حالات وتراجم کی تلاش میں دن اوررات کی قید سے آزاد رہ کر آبادیوں اور ویرانوں کا چکر کاٹا ہے۔ محلوں اور جھونپڑوں میں آیا گیا ہوں اور دوروزدیک ہر جگہ سے مطلب کی بات حاصل کی ہے۔ ذمہ داری اور جذبۂ تشکر کے ماتحت جن حضرات نے تراجم کی فراہمی میں مدد کی ہے، ان کے نام بھی دے دیے ہیں۔ اس کتاب میں ان ہی حضرات کے تراجم درج کیے گئے ہیں، جن کوموت نے تاریخ کا عنوان بنادیا ہے اور جوسلف کے زمرہ میں شامل ہوکر ہماری طرف سے اس قرآنی دعا کے مستحق بن چکے ہیں:

”ربنا اغفرلنا ولا	اے ہمارے رب! ہماری مغفرت
خوانِنا الذین سبقونا	فرما اور ہمارے بھائیوں کی جو ہم
بالایمان ولا تجعل فی	سے پہلے ایمان میں سبقت لے
قلوبنا غلاًللذین آمنوا	جاچکے ہیں اور ہمارے دلوں میں
ربنا انك رؤف رحیم۔“	ایمان والوں کے لیے بغض وعداوت
(سورہ حشر۔آیت ۵۹)	نہ ڈال۔تو بیشک رؤوف ورحیم ہے۔

مبارکپور کی علمی ودینی تاریخ کے تین ادوار ہیں، پہلا دَور یہاں کی آبادی حدود ۹۵۰ھ سے تیرہویں صدی کے نصف آخر تک، اس دَور کے علماء، فضلاء اورمشائخ کے نام اورحالات بہت کم مل سکے ہیں۔ دوسرا دَور تیرہویں صدی کے اواخر سے لے کر چودہویں صدی کے اواخر کا سوسالہ دَور مبارکپور کی علمی، دینی اورادبی زندگی کے حق میں بہت ہی عہد آفریں اور بڑا مردم خیز ہے۔ اس دَور کے مبارکپور کو بجا طور پر ”نیساپور ہند“

کہا جا سکتا ہے۔اس دَور میں مولانا عبدالرحمٰن محدث، مولانا عبدالسلام، مولانا عبدالعلیم، مولانا احمد حسین، مولانا محمد شریف، مولانا ظفر حسن عینی، ملا رحمت علی، مولانا ابو محمد عبدالحق، مولانا محمد احمد، مولانا الٰہی بخش، مولانا محمد شکر اللہ وغیرہ آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب تھے اور ان میں ہر ایک اپنی ذات سے انجمن تھا۔ان کی تدریسی و تعلیمی خدمات نے ہزار ہا علماء و فضلاء پیدا کیے اور ان کے تصنیفی کارنامے ہندوستان سے گزر کر عرب و عجم میں پھیلے۔اسی دَور میں ہم نے آنکھ کھولی ہے اور ان بزرگوں میں سے اکثر حضرات کو دیکھا ہے اور ان کی علمی و دینی زندگی سے حصہ پایا ہے۔

تیسرا دَور اُن حضرات کے تلامذہ و متوسلین کا ہے، جو چل رہا ہے اور آج یہاں جو علمی و دینی روشنی نظر آ رہی ہے، اُن ہی چراغوں کا فیض ہے۔

ہر دَور میں علمائے اسلام نے اپنے شہروں اور بستیوں کی تاریخ لکھی ہے، جس میں وہاں کی ابتدائی تاریخ اسلامی فتوحات، علماء و مشائخ اور ان کے علمی و دینی آثار و علائم کو بیان کیا ہے۔اس طرح مسلمانوں کی مشہور و ممتاز بستیوں پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ ''تاریخ بغداد''، ''تاریخ دمشق''، ''تاریخ اصفہان''، ''تاریخ جرجان'' وغیرہ اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔جن کی وجہ سے سلف کا دینی و علمی اور روحانی ربط و تعلق خلف سے قائم رہا اور مسلمانوں کا خاص فن اسماء الرجال اور سوانح نگاری ہر ملک اور ہر دَور میں نمایاں ہوا۔ چناں چہ ہمارے ہندوستان میں بھی اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔امام ابوعبداللہ حاکم نیسا پوری متوفی ۴۰۵ھ نے تاریخ نیسا پور لکھنے کے بعد اپنے ایک تلمیذ رشید سے فرمایا تھا:

''اعلم بان خراسان	خراسان اور ماوراء النہر کے ہر شہر
وما وراء النهر لكل بلد	کی وہاں کے عالم نے تاریخ
تاريخ صنفه عالم ههنا	لکھی، مگر میں نے دیکھا کہ

ووجدت نیسابور مع	نیساپور میں علماء کی کثرت
کثرة العلماء بهالم	کے باوجود اہل علم نے یہاں
یصنفوا فیه شیئًا	کی کوئی تاریخ نہیں لکھی،
فدعانی ذالك الی ان	اسی بات نے مجھے تاریخ
صنفت تاریخ نیسابور	نیساپور لکھنے کی دعوت دی،
فتامله لم یسبقه الی	تم اسے غور سے دیکھو، اس
ذالك احدٌ۔''	کام کو مجھ سے پہلے کسی نے
(تذکرۃ الحفاظ۔ج:۳۔ص:۲۳۰)	نہیں کیا ہے۔

امام حافظ ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۴۲۷ھ نے تاریخ جرجان کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''ولم ار احداً من	میں نے نہیں دیکھا کہ میرے
مشائخنا رحمهم الله	مشائخ میں سے کسی نے علمائے
صنف فی ذکر علماء	اہل جرجان کے ذکر میں کوئی
اهل جرجان اوارّخ لهم	کتاب لکھی ہے، یا اُن علماء کی
تاریخاً علی توافر	کثرت اور اُن کے
علمائها وتظاهر	کارناموں کی شہرت کے
شیوخها وفضلائها	باوجود اُن کی کوئی تاریخ
فاحببتُ ان اجمع فی	مرتب کی ہے۔ اپنی
ذالك مجموعاً علی قدر	بے سروسامانی کے باوجود مجھ
جهدی وطاقتی مع قلة	کوشوق ہوا کہ اپنے مقدور بھر
بضاعتی وعرض	کوشش کرکے اُن کے احوال
لی جمعه حین	وکوائف کو جمع کردوں۔

تفانی العلماء الذین	ان علماء کا انتقال ہونا جن کے علم پر
یوثق بعلمهم ویعتمد	اعتبار کیا جاتا تھا اور ان کے
علی معرفتهم، ولم	معرفت پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ جب
اتمکن من کتبهم	اس خیال میں غرق ہوا تو پتہ
فاستمد منها اذکان	چلا کہ میں جن کی تحریر واطلاع پر
اهلها قدا ضاعوها لقلة	اعتماد کرسکتا تھا، اُنھوں نے اپنی
غباتهم وفتور نیاتهم	عدم توجہی اور ناقدری کی وجہ سے
فاقتصرت علی ماحضر	اُن علماء کے ذکر کو ضائع کردیا
واحذت بما تیسّر	ہے۔ اس لیے مجھے جو کچھ آسانی
وقدمت العذر حتی إن	سے مل سکا انھیں سے اخذ
قصرت فیه تعقیراً؟	واستفادہ کیا۔ میں معذرت
اوشذ عنی شئ کنت	چاہتا ہوں اگر اس میں کچھ کوتاہی
فی ذالك معذوراً۔''	ہوگئی یا کوئی انہونی چیز آگئی ہو تو مجھ
(تاریخ جرجان۔ ص:۴۔	کو معذور سمجھا جائے۔
مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد)	(سلمان)

شیخ غلام علی آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام فی تراجم فضلائے بلگرام'' میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''در صوبہ اودھ محروسہ بلگرام	صوبۂ اودھ میں قصبہ بلگرام قدیم زمانہ
از قدیم منشائے فضلائے	سے علماء وفضلاء کا مرکز ہے۔ بیشمار
کرام ومظہر علمائے عظام	اہلِ دانش اس شہر سے اُٹھے اور مجلس
است وفراوان دانش از یَن	درس وافادہ کو کمالِ خوبی سے آراستہ
شہر برخاستہ ومجلس افادہ	کیا۔ مگر کسی کو ان اکابر کے حالات

واستفادہ بہ کمال خوبی آراستہ اما کسے بہ استفادہ احوال اکابر توفیق نہ یافت، لاجرم قدماء بیشتر بہ ہمسنانی "منهم من لم نقصص" سبیلِ گمنامی پیمودند منهم من قصصنا علیک درعرصہ معارف جلوہ نمودہ۔"	لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ناچار بہت سے پُرانے اہل علم وفضل "منهم من لم نقصص" (جن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا) کی ہم رکابی میں گوشۂ گمنامی میں چلے گئے اور صاحبانِ علم کی تھوڑی سی جماعت ہی "منهم من قصصنا علیك" (جن کے احوال لکھے گئے) کی متابعت میں، تاریخ وتذکرہ کی روشنی میں آئی۔ (قمر)
(مآثر الکرام۔ج:۱۔ص:۲۲۳)	

مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نے "مآثر الکرام" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"اگر علماء وفضلاء ودیگر مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل قصبات کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے۔ کاش مولانا آزاد کی طرح دوسرے اہل قصبات بھی اس بات کا خیال رکھتے اور اپنے اپنے قصبہ کے علماء وفضلاء وصوفیاء ودیگر مشاہیر کے حالات قلم بند کرڈالتے تو ہندوستان کی تاریخ کو اس سے بڑی مدد ملتی۔ ہندوستان میں بکثرت ایسے قصبات ہیں کہ اگر وہاں کے حالات یا تاریخ لکھی جائے تو ایسی مفید معلومات اس سے حاصل ہوسکتی ہیں، جس کا بڑی سے بڑی مبسوط تاریخوں میں پتہ نہیں۔" (ص:۷)

"قاضی شیخ محمد مچھلی شہری متوفی ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۳ء) نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد اعظم گڑھ میں گورنمنٹ کی ملازمت کرلی۔ جس حاکم بندوبست کے ماتحت تھے، وہ آپ کے علم وخلوص کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے دورو پیہ یومیہ پر تاریخ ضلع اعظم گڑھ لکھوانا شروع کرائی، یہ کام بڑا مشکل تھا۔

قدیم خاندانی شجرے اور پرانے شاہی کاغذات کا پتہ چلا کر ان کو زبانی روایات سے تطبیق دینے کے بعد اپنے محل پر لگانا پڑتا تھا۔ یہ کتاب اتنی مقبول سمجھی گئی کہ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ ہو کر مسٹر ''جمیسن رابرٹ ایڈ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اُردو کا اصل مسوّدہ خود قاضی صاحب نے تلف کر دیا۔'' (تراجم علمائے اہل حدیث ہند۔ ج:۱۔ص:۳۷۶)

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ علمائے اسلام کو اس موضوع کی اہمیت وضرورت کا کس قدر احساس رہا کرتا تھا اور وہ اپنے علاقہ کے علمی ودینی رجال کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

قاضی اطہر مبارکپوری
جمعہ یکم جمادی الاوّل ۱۳۹۴ھ
مطابق ۲۴ رمئی ۱۹۷۴ء

مبارکپور کی اجمالی تاریخ

قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں بجانب شمال و مشرق مسلمانوں کی بہت بڑی اور قدیم صنعتی، دینی، علمی اور مردم خیز بستی ہے۔ اس کی موجودہ آبادی کی بنیاد تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت راجہ سید شاہ مبارک مانک پوری متوفی ۲/شوال ۹۶۵ھ رحمۃ اللہ علیہ نے بعہد سلطان ہمایوں رکھی۔ جو اپنے زمانے کے مشہور چشتی خانوادہ حامدیہ مانک پور کے روحانی بزرگ تھے۔ اعظم گڑھ گزیٹیر کے مصنف مسٹر ڈی ایل ڈرک بردکمان آئی سی ایس. نے لکھا ہے کہ قصبہ مبارکپور کا طول البلد مشرق و مغرب میں ۸۳/درجہ ۱۸/دقیقہ اور عرض البلد شمال وجنوب میں ۲۶/درجہ ۶/دقیقہ ہے[1] یہ قصبہ اعظم گڑھ سے شمال مشرق کی طرف ۸/میل پر واقع ہے اور اعظم گڑھ سے ایک خام (اب پختہ) سڑک کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔ یہ قصبہ ذیل کے مواضعات کی زمین پر آباد ہے۔ مبارکپور خاص، سکٹھی، شاہ محمد پور اور املو۔ قصبہ کی قدیم تاریخ کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کا نام قاسم آباد تھا۔ جو زوال وانحطاط سے کافی دوچار ہو چکا تھا۔ بعد میں راجہ مبارک کے نام پر آباد ہوا۔ جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے۔ اس نئے نام کے بعد اس مقام نے اہمیت حاصل کر لی۔ مگر مسلمان مورّخوں کے یہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ اس سے پہلے یہ قصبہ متمول تھا۔ سرکاری کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پہلے زمانے میں دس ہزار سے بارہ ہزار تک آبادی تھی[2]

---

[1] مگر مولانا محمد یحیٰی صاحب رسولپوری کی تحقیق میں اس کا طول البلد ۸۳/درجہ ۲۰/دقیقہ اور عرض البلد ۲۶/درجہ ۵/دقیقہ ہے جیسا کہ انہوں نے یہاں کے نقشۂ افطار وسحر میں اس کی تحقیق فرمائی ہے۔

[2] مردم شماری ۱۹۷۱ء کی رو سے خاص ٹاؤن ایریا کی آبادی ۲۵/ہزار سے زائد ہے۔ ٹاؤن ایریا کی نئی عمارت ۱۵/مئی ۱۹۶۳ء کو بنی تھی۔ ۱۵/اگست ۱۹۷۴ء میں میونسپلٹی بنی۔ ۱۹۹۱ء میں آبادی ۴۵۳۸۹/ ہوئی اور ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۵۱۰۸۰/ ہے۔

جس میں ایک چوتھائی پارچہ باف مسلمان تھے، ساتھ ہی کچھ دولت مند ہندو تاجر تھے۔ قصبہ کے مسلمان زیادہ ترجذباتی ہیں[1]

اس کے بعد یہاں کے صنعتی، تجارتی اور معاشی حالات اور سرکاری امور سے متعلق باتیں تفصیل سے درج ہیں اور یہاں کی خاص اور قدیم ترین صنعت پارچہ بافی اور ریشمی کپڑوں کی صنعت کے بارے میں اہم معلومات اور مذہبی جھگڑوں کی تفصیلات ہیں۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصبہ پہ دو دَور گزرے ہیں۔ قدیم دَور قاسم آباد کے عروج وزوال پر مشتمل ہے اور جدید دَور مبارکپور کی موجودہ آبادی سے متعلق ہے اور اس کے دونوں ادوار میں مسلمان مورّخوں اور تذکرہ نویسوں نے یہاں کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔

ضلع اعظم گڑھ کے حدود میں جن میں یہ قصبہ بھی واقع ہے، پہلے زمانے میں چار قومیں آباد تھیں۔ سیوری، بھر، راج بھر، اور چیرو، مگر ان میں راج بھروں کو غلبہ واقتدار حاصل تھا۔ ان میں چار مشہور راجے گزرے ہیں: (۱) راجہ اسیل دیو مائل میں، (۲) راجہ اجودھیا رائے کوڑیا میں، (۳) راجہ پری چھات نظام آباد میں اور (۴) راجہ گرگ دیوسگڑی میں۔ اس زمانے میں موجودہ مبارکپور کا علاقہ راجہ گرگ دیو کی عملداری میں رہا ہوگا۔ راج بھر بڑی خوشحال قوم تھی۔ اس کے قدیم آثار اب تک قصبہ کے اردگرد سریاں، ملک شدنی، رسولپور، اساور، سنکٹھی، گجہڑا، بمہور وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کی اینٹوں، برتنوں اور مورتیوں کے ٹکڑے، سکّے اور دفینے ماضی قریب تک ملتے تھے۔ یہ علاقہ پانچویں صدی کے آخر میں اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہوا اور سید سالار مسعود غازی متوفی ۴۸۸ھ کے امراء ومجاہدین نے یہاں پہلی بار قدم رکھا۔ اعظم گڑھ گزیٹیر میں ہے کہ سید سالار مسعود غازی کی فوجیں بہرائچ جاتے ہوئے بھگت پور میں چند دن رکی تھیں۔ یہ مقام مبارکپور کے شمال مغرب میں ۸ر میل پر واقع ہے اور ہر سال یہاں

---

[1] اعظم گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔ ص: ۱۶۰ تا ۱۶۱۔ ذکر مبارکپور۔

غازی میاں کا میلہ لگتا ہے۔ نیز ان علاقوں میں ملک حضرات کے متعدد مزارات ہیں۔ جن کے بارے میں عام روایت ہے کہ یہ سید سالار مسعود غازی کے امراء ورفقا کی قبریں ہیں۔ سالار پور کے نام سے قصبہ کے مغرب میں ایک علاقہ بھی مشہور ہے۔ اس کے بعد چھٹی صدی کے آخر میں سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا۔ پھر سلطان شہاب الدین غوری نے قنوج اور بنارس پر قبضہ کرکے بنارس سے نیپال کے سرحدی علاقوں کو زیر کیا اور یہ علاقے اس طور سے مسلمانوں کے زیر تصرف آئے کہ یہاں کے راجوں نے سلطان قطب الدین ایبک کی اطاعت منظور کر لی۔ غلام خاندان کی یہ سلطنت ۶۸۹ھ تک رہی۔ اس دور میں کڑا مانک پور مشرقی علاقوں کا دارالحکومت بنایا گیا۔ بلکہ اس سے آگے لکھنوتی اور بنگال کو دہلی کی سلطنت کی طرف سے مرکزیت حاصل تھی اور ۵۹۲ھ سے ۶۸۹ھ تک یہ تمام مشرقی علاقے بشمولیت ضلع اعظم گڑھ ومبارکپور دہلی کی سلطنت سے وابستہ رہے۔ اس دور میں یہاں اسلام اور مسلمانوں کا چرچا زیادہ ہوا اور سید سالار مسعود غازی کے دور کا بیج اس دور میں اُگنا شروع ہوا۔ اس کے بعد ۷۲۰ھ تک دہلی کے تخت پر خلجی سلاطین بیٹھے۔ ان کے دور میں بھی کڑا مانک پور مشرقی علاقہ کا مرکزی مقام رہا۔ یہاں علماء، فضلاء، مشائخ، اہل اللہ آباد ہوئے، جنھوں نے اطراف وجوانب میں اسلام کا نام بلند کیا۔ اسی دور میں کڑا مانک پور چچا بھتیجے کی جنگ کا میدان بنا۔ یعنی جلال الدین اور اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین کے درمیان جنگ ہوئی اور بھتیجے نے چچا کو ملاقات کے بہانے سے بلا کر دریائے گنگا کے بیچ میں قتل کردیا۔ اس کے بعد ۸۱۶ھ تک تغلق خاندان دہلی میں حکمران رہا۔ اس کے دور میں مشرقی مرکز کڑا مانک پور علمی اور دینی وروحانی حیثیت کے ساتھ ساتھ صنعتی اور تجارتی حیثیت سے بھی مرکزیت حاصل کر گیا۔ خاص طور پر پارچہ بافی صنعت نے یہاں بڑی ترقی کی۔ مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی میں کڑا مانک پور اور اس کے ماتحت علاقوں کے بارے میں لکھا ہے:

''وتصنع بها الثياب	ان علاقوں میں نہایت عمدہ قسم کے
الرفيعة، ومنها تجلب	کپڑے تیار کیے جاتے ہیں اور
الى دهلي وبينهما سيرة	یہاں سے اٹھارہ دن کی مسافت
ثمانية عشر يوما۔''[1]	پر دہلی بھیجے جاتے ہیں۔

تغلق دَور میں اس صنعت کو کافی فروغ دیا گیا۔ فضل اللہ عمری نے ''مسالک الابصار'' میں لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے دَور میں صرف شاہی کارخانوں میں چار ہزار پارچہ باف ریشمی اور دوسری اقسام کے کپڑے تیار کرتے تھے۔ اس کے سواسو سال بعد کڑا مانک پور کے حضرت راجہ سید مبارک شاہ نے مبارکپور آباد کیا اور یہاں کے بعض خاندانوں کو وہاں لے جا کر مستقل طور سے بسایا اور مبارکپور کو کڑا مانک پور سے علمی، دینی اور روحانی تعلق کے ساتھ ساتھ صنعت پارچہ بافی کا بھی تعلق رہا۔ اسی دَور میں خواجہ بایزید بن شیخ خلیل نامی ایک بزرگ جونپور آئے اور جونا خان نے ان کو کوئریا پار، کبیر پور اور چک میر جاگیر میں دیا۔ ان کے پوتے شیخ محمد اعظم بن شیخ جمال الدین بن خواجہ بایزید نے محمد آباد میں سکونت اختیار کی اور جب سلاطین مشرقیہ جونپور کا دَور آیا تو وہ ان سے وابستہ رہے۔ آخری دَور میں شیخ غلام فرید محمد آبادی اسی خاندان میں مشہور بزرگ عالم ہوئے ہیں[2] غالباً اسی دَور میں چریاکوٹ میں عباسی شیوخ آباد ہوئے۔ جن میں بڑے بڑے علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔ آخری دَور میں مولانا عنایت رسول چریاکوٹی اور ان کے بھائی مولانا فاروق چریاکوٹی اسی خاندان سے تھے۔ تغلق دَور میں دیارِ پورب میں ایک تازہ دم اور نئی سلطنت عالمِ وجود میں آئی۔ جس کے بعد یہ سارا علاقہ اربابِ علم وفضل اور اہل کمال سے معمور ہو گیا اور پورب کے شہر وقریات مسلمانوں کے تمدنی وفکری اور صنعتی مرکز بن گئے۔ جس میں موجودہ ضلع اعظم گڑھ اور مبارکپور کا علاقہ بھی شامل ہے۔

---

[1] رحلہ ابن بطوطہ۔ ج:۲۔ص:۲۵۔ طبع مصر۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مظہر الاحدیہ۔ ص:۱۵۱-۱۵۲۔ مطبع کاظمی پریس کانپور ۱۳۳۲ھ

صورت یہ ہوئی کہ ۷۹۶ھ میں دہلی کی حکومت نے خواجہ جہاں ملک سرور کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جونپور کی امارت دی، مگر بعد میں اس نے سلطان الشرق کا لقب اختیار کر کے جونپور میں شرقی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ جس میں چھ سلاطین ہوئے: (۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور ۸۰۲ھ، (۲) سلطان مبارک شاہ شرقی ۸۰۴ھ، (۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی ۸۴۴ھ، (۴) سلطان محمود شاہ شرقی ۸۶۲ھ، (۵) سلطان محمد شاہ شرقی ۸۶۲ھ، (۶) سلطان حسین شاہ شرقی ۸۸۱ھ۔ شرقی سلطنت مغرب میں کول اور رابرتی تک، مشرق میں بہار اور ترہت تک اور شمال میں بہرائچ تک تھی، اس کی مشرقی حدود میں قاسم آباد بھی شامل تھا، جو تیموری دور میں مبارکپور کے نام سے مشہور ہوا۔ شاہانِ شرقیہ بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے۔ خاص طور سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دورِ سلطنت دیارِ پورب کے حق میں فصل بہار تھا۔ اس زمانے میں جونپور دہلی ثانی اور دارالعلم کے لقب سے ملقب ہوا۔ اسی سلطان کے دور میں حضرت شیخ محمد بن خضر فاروقی جونپوری کا خاندان سلطان پور عرف بھیرا میں آکر آباد ہوا۔ جسے سلطان موصوف نے مبارکپور سے متصل لہرا تک جاگیر عطا کی تھی۔ اس خاندان میں بڑے بڑے علماء، فضلاء اور مشائخ پیدا ہوئے۔ ملا محمود جونپوری، شاہ ابوالغوث گرم دیوان اور ان کے صاحبزادے شاہ ابواسحاق اسی خانوادہ سے تھے۔ ۸۸۳ھ میں جونپور کی شرقی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور لودھیوں کا دَور آیا، جو ۹۳۲ھ تک قائم رہا۔ اس پچاس سالہ دَور میں بلادِ پورب کی دینی و علمی رونق قائم رہی اور لودھیوں نے یہاں اپنے آثار چھوڑے۔ غازیپور میں نصیر خاں لوحانی حاکم اور حضرت شیخ محمود بن حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری میر عدل تھے۔ سکندر لودھی کے نام سے سکندر پور آباد ہوا۔ جو دیارِ مشرق میں جونپور کے بعد پھولوں کا سب سے بڑا گلستاں بنا۔ سلطان ابراہیم لودھی کے نام پر ابراہیم پور یعنی سپاہ آباد ہوا۔ مبارکپور کے مشرق میں لدھوائی نامی بستی بھی لودھیوں کا پتہ دیتی ہے۔ سکندر پور سے تین میل کے فاصلے پر مشرق میں زاہدی پور میں حضرت مخدوم شاہ رکن الدین رکن عالم زاہدی

کا مزار ہے۔ اسکندر لودھی کے دَورِ حکومت میں وہاں تشریف لائے تھے۔ وہاں اسکندر لودھی کا ایک چھوٹا سا قلعہ دریائے گھاگرا کے متصل تھا اور اس سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اس کی تعمیر کردہ ایک شاندار مسجد ہے، جواب بیچ دریائے گھاگرا میں پڑ گئی ہے، لیکن عمارت ہنوز موجود ہے۔

۹۳۲ھ میں بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی میں تیموری (مغل) سلطنت کی بنیاد رکھی اور سلطان ظہیر الدین محمد بابر کا لقب اختیار کر کے ۹۳۷ھ تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان نصیر الدین محمد ہمایوں (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوا۔ اسی کے دور سلطنت میں حضرت راجہ سید مبارک شاہ مانک پوری متوفی ۲ر شوال ۹۶۵ھ نے قاسم آباد کے کھنڈر پر مبارک پور کی بنیاد رکھی۔ اعظم گڑھ گزیٹیر میں ہے کہ مبارک پور کے موجودہ زمینداروں کے مورث اعلیٰ راجہ مبارک تھے[1] یہ بیان صحیح نہیں۔ راجہ صاحب کی وفات مانک پور میں ہوئی اور وہیں دفن کیے گئے۔ مبارک پور میں نہ وہ رہے اور نہ ان کا کوئی خاندان رہا۔ بلکہ ان کے ساتھ ہمارا خاندان کڑا مانک پور سے آ کر یہاں آباد ہوا۔ ایک روایت کے مطابق یہ خاندان راجہ صاحب کے مورثِ اعلیٰ سید شہاب الدین گزدیری کے ہمراہ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں دہلی سے کڑا مانک پور آیا اور بعد میں راجہ مبارک کے ساتھ مبارک پور آ کر مستقل طور سے رہ بس گیا اور منصب قضا پر نسلاً بعد نسلٍ فائز رہا۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کچھ مدت تک شیر شاہ سوری کے زیر تصرف تھا اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) تک یہاں اس کے بیٹے اسلام شاہ کی حکومت رہی۔ نیز سلطان محمد عادل حاکم بنگال کے بیٹے بہادر شاہ کی طرف سے یہاں کوئی حاکم ۹۶۴ھ (۱۵۵۶ء) تک موجود تھا[2]

شاہ جہاں کے دَور میں (۱۰۳۶ھ تا ۱۰۶۸ھ) مبارک پور میں ایک بہت بڑے

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔ ص: ۲۶۱۔

[2] اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔ ص: ۱۶۱۔

زمیندار و رئیس شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری تھے، جن کو بعد میں ایک روایت کے مطابق اعظم گڑھ کے بانی راجہ اعظم شاہ نے ایک مقامی راج بھر زمیندار سے مل کر قتل کرایا تھا۔ ان کے پانچ قلعے تھے اور بڑے رعب وداب کے مالک تھے۔ اس زمانے میں بھیرا میں حضرت شاہ ابوالخیر متوفی ۱۰۵۹ھ تھے، جن کے تعلقات شاہ جہاں اور نواب شائستہ سے بہت گہرے تھے۔ ان کی تین شادیوں میں سے پہلی شادی محمود جونپوری کی بہن سے اور دوسری شادی شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں فاروقیان بھیرا میں سے ایک بزرگ مخدوم شیخ رشید بن شیخ سعید بن مخدوم بن شیخ مشید بن مخدوم شیخ بڑے بن شیخ محمودؒ نے مبارکپور کے جنوبی جانب آبادی سے متصل سکونت اختیار کی اور اپنے نام پر اس محلے کا نام رشید آباد رکھا، جو بعد میں رواج نہ پاسکا۔ ان کے صاحبزادے لطف اللہ کے دولڑکے شیخ محمد اعظم اور شیخ عباد اللہ تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی نسل سے یہاں کے فاروقی شیوخ ہیں۔ شاہجہانی دور میں مبارکپور کی نئی آبادی پر سینکڑوں سال گزر چکے تھے اور روز بروز ترقی ہورہی تھی اور صنعتی آبادی ہونے کی وجہ سے دور و نزدیک کے مسلمان یہاں آکر آباد ہورہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس دَور میں مبارکپور کی آبادی پرانی بستی اور پورہ خواجہ سے گزر کر مغرب کی سمت بڑھ رہی تھی اور سکٹھی کی زمینداری میں محلہ پورہ صوفی بہادر اسی دور میں آباد ہوا تھا۔ اللہ خدائی نامی کتاب کے ایک قلمی نسخہ میں ''بیاض خاطر میاں عبدالرحیم بن والی نورباف ساکن سکٹھی پورہ صوفی بہادر'' لکھا ہوا ہے۔ نیز اس پر بعد میں ایک تملیک اس طرح درج ہے:

''جان محمد پسر عبدالواحد ساکن پورہ صوفی بہادر ۱۲۴۴ فصلی''۔

جس طرح مبارکپور ایک خاص شخصیت کے نام پر آباد ہوا، اسی طرح صوفی بہادر کسی خاص شخصیت کا نام تھا۔ شاہجہانی دور میں صوفی بہادر نامی ایک پرجوش اور بہادر فاتح تھے۔ جنھوں نے ۱۰۴۶ھ میں بھوج پور کی جنگ میں جو چھ ماہ تک جاری رہی، ایک قلعہ فتح کیا تھا۔ ''عملِ صالح'' میں ہے:

”دو زبردست خان و صوفی	اور زدر آور خان وصوفی بہادر سردار
بہادر حسب الامر سردار بفتح	کے حکم سے کالا پور کا قلعہ فتح
قلعہ کالا پور شتافتہ بعد از محاصرہ	کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ محاصرہ
یک ماہ آں را بہ کشش و کوشش	کے بعد اس کو طاقت آزمائی اور
تمام مسخر گردانیدند۔“[1]	کوشش سے فتح کرلیا۔ (قمر)

اس جنگ میں عبداللہ خان بہادر فیروز جنگ اور باقر نجم ثانی حاکم الہٰ آباد اور گورکھپور کے زمیندار و رئیس فدائی خاں شامل تھے۔ شاید ان ہی صوفی بہادر کے نام پر یہ بستی بسائی گئی تھی، جو بعد میں قصبہ کا ایک محلہ بن گئی۔ باقر خاں نجم ثانی جہاں گیر کے دَور میں حاکم بنارس تھے۔ اسی دَور میں خواجہ محمد صالح بنارس خاص کے حاکم ہوئے، جنھوں نے ۱۰۲۷ھ میں شاہی مسجد بحکم جہاں گیر بنائی اور ان کے نام پر پورہ خواجہ آباد ہوا۔ شاید ان ہی کے نام پر مبارک پور میں پورہ خواجہ اور خواجہ تالاب (کھجوا) بھی ہے۔ شاہجہانی دَور میں مبارک پور کے قریب گجہڑا میں ایک بزرگ سید کمال الدین تشریف لائے۔ جن کے صاحبزادے نے بعہد سلطان عالمگیر ۱۰۹۹ھ میں گجہڑا میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی۔ دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل میں تین افراد پر مشتمل ایک قافلہ بعہد سلطان جہاں گیر رسولپور میں آباد ہوا۔ جس میں مولانا عبدالعلیم اور مولانا احمد حسین پیدا ہوئے۔ ۱۱۳۰ھ سے ۱۲۷۳ھ تک یہ علاقہ نوابانِ اودھ کے زیر تصرف رہا اور اعظم گڑھ چکلہ ان اطراف کا مرکز تھا۔ سلطان محمد شاہ نے آغاز جلوس ۱۱۳۰ھ میں برہان الملک وزیر الممالک نواب سعادت علی خان جنگ بہادر کو اودھ کا صوبہ دار بنایا۔ اس کا اصل نام محمد امین پسر مرزا نصیر شمس الدین تھا۔ اس نے یہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ تیسرے نواب اودھ شجاع الدولہ کے زمانے میں سلطان محمد شاہ نے انگریزوں سے بکسر میں جنگ کے بعد شرائط صلح کی رو سے غازی پور کو انگریزوں کے حوالے کردیا اور نواب سعادت خان متوفی ۱۲۲۹ھ کے دور میں مبارک پور میں زبردست شیعہ سنی

---

[1] عملِ صالح۔ ج:۲۔ ص:۱۸۲۔

ہنگامہ ہوا۔ ایک شخص قتل کیا گیا اور مقدمہ نواب سعادت علی تک پہنچا۔ اس کی تفصیل واقعات وحادثات مبارکپور میں درج ہے۔ اسی دور میں مبارکپور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں شامل ہوگیا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی (DALHOUSIE) اور نواب سعادت علی خان کے درمیان ایک معاہدہ کی رو سے ۱۰/نومبر ۱۸۰۱ء (۲/رجب ۱۲۱۶ھ) میں چکلہ اعظم گڑھ مع پرگنہ ماہل، مئوناتھ بھنجن ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کرکے برطانیہ کے نئے ضلع گورکھپور سے متعلق کردیے گئے[1] ۱۸۱۳ء میں مبارکپور پر فسادیوں کے جم غفیر نے حملہ کیا اور خوں ریز جنگ ہوئی اور جانبین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس میں بعض راجے بھی آئے تھے۔ قصبہ کے مسلمانوں نے اس جنگ میں ایک عرضداشت حاکم گورکھپور کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اسی طرح اس دور میں قصبہ کے کئی مقدمات گورکھپور عدالت میں گئے تھے۔ بیس سال کے بعد مبارکپور ضلع غازیپور کے ماتحت ہوگیا۔ ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) کی ابتدا میں دیوگام، نظام آباد، ماہل، کوڑیا، تلہنی، اترولیا اور گوپال پور کے پرگنوں کو گورکھپور سے الگ کرکے جونپور میں شامل کیا گیا اور سگڑی، چکیسر، گھوسی، سورج پور، بلہابانس قریات متوپور چریا کوٹ، محمد آباد مئوناتھ بھنجن اور نتھوپور کے پرگنہ جات کو غازیپور میں ملا دیا گیا۔ اس نظام کے ماتحت مبارکپور بارہ سال تک ضلع غازیپور میں رہا۔ اس کے بعد ۱۸/دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) میں اعظم گڑھ کو مستقل ضلع قرار دیا گیا اور مبارکپور اس میں شامل ہوا۔ ضلع اعظم گڑھ کے پہلے کلکٹر کا نام مسٹر تھامسن (Mr. THOMSON) تھا، جس کی نامزدگی ۱۸۳۲ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۸۶۱ء تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ پرگنہ مئوناتھ بھنجن کا تبادلہ چریا کوٹ سے تحصیل محمد آباد میں ہوا۔[2] ۱۹۸۰ء میں مئوناتھ بھنجن کو مستقل ضلع بناکر مبارکپور کو ضلع اعظم گڑھ میں رکھا گیا ہے اور اعظم گڑھ کے مشرقی علاقہ خیرآباد، کرہاں، محمد آباد، چریا کوٹ، مئو، ادری، کوپا گنج، پورہ معروف اندارا، بڑا گاؤں، گھوسی، دوہری گھاٹ پر مشتمل ضلع مئو بن گیا ہے۔

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔ ص: ۱۲۳۔

[2] تفصیل کے لیے اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔ ص: ۱۲۳۔

ملحقات وسواد مبارکپور

بڑی آبادیوں اور شہروں کے ملحقات وسواد کی طرح اس قصبہ سے ملحق و متصل کئی بستیاں ہیں، بعض میں کئی محلے ہیں۔ اس موقع پر سواد مبارکپور کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ یہاں کے علماء وفضلاء بھی مبارکپوری ہیں۔ یہ قصبہ قدیم روایت کے مطابق ۲۸ محلوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں ۱۴ر محلے مبارکپور خاص میں اور چودہ محلے سواد میں ہیں اور ان سب کا علمی، دینی، تجارتی، معاشی، تمدنی تعلق مبارکپور سے ہے اور ان کا شمار بھی اسی میں ہوتا ہے۔ ان میں چند بڑے اور مشہور محلے یا بستی یہ ہیں:

سکٹھی

قصبہ سے متصل شمال مغرب میں مسلمان زمینداروں کی قدیم آبادی ہے۔ غالباً سلطان جہاں گیر کے زمانے میں ڈوبی ضلع جونپور کے رگ بنسی راجپوتوں میں سے ضیاء الدین اور نصیر الدین مسلمان ہوگئے اور دونوں قصبہ مبارکپور کے مغرب میں آکر آباد ہوگئے۔ حاکم وقت کی طرف سے ان کو جاگیر عطا ہوئی۔ اس کے بعد نصیر الدین نے اس سے آگے سکونت کی، جن کے نام سے غالوہ نصیر الدین پور مشہور بستی ہے۔ چوں کہ یہاں قدیم زمانے میں سیکٹ کے درخت بہت زیادہ تھے، اس لیے اس بستی کا نام سکٹھی پڑ گیا۔ یہ درخت میں نے کوکن میں دیکھا ہے، مہوا کے درخت کے مانند ہوتا ہے۔ سکٹھی کے اکثر باشندے ضیاء الدین کی اولاد سے ہیں۔ بعض خاندان جیراج پور، اسنا، سلطانپور، محمد پور اور گبھڑا وغیرہ کے بھی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں کے کئی لوگوں نے بھور کے رجب علی کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے پینے نامی انگریز افسر اور تحصیلدار محمد آباد کے حکم سے سکٹھی کو لٹوایا اور پھنکوایا گیا۔ ضیاء الدین

کی اولاد میں آخری دَور میں خان محمد خان متوفی ۲۷؍مارچ ۱۹۱۷ء مشہور آدمی تھے، جن کی اولاد میں علم و حکمت کا چرچا رہا۔ یہاں مولوی رجب علی اور مولوی حکیم الطاف حسین گزرے ہیں۔

سرائے مبارک

مبارکپور قصبہ کے شمال مغرب میں سکٹھی کے آگے سرائے مبارک نامی بستی ہے۔ غالباً یہ نام راجہ مبارک کی نسبت سے ہے اور اس کی آبادی انھیں کے دَور کی ہے۔ جس طرح اسی زمانہ میں میر علی عاشقان کے نام پر سرائے میر (مرتضٰی پور) آباد ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں کے حسین بخش اور برکت علی بھیم سنگھ ساکن سونابر کے شریک تھے۔ یہاں بعض شیوخ خاندان آباد ہیں۔ ایک بزرگ کا مزار ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیوان مصطفٰے شاہ بانیِ مصطفٰے آباد کے بھائی ہیں۔

مصطفٰے آباد

سرائے مبارک کے شمال میں دو فرلانگ پر مصطفٰے آباد شیوخ کی مشہور بستی ہے، جو حضرت دیوان شاہ مصطفٰے کے نام سے مشہور ہے اور ان کی خانقاہ اور مزار یہاں موجود ہے۔ یہ آبادی پہلے جوگیا بیر نامی علاقے میں تھی، جو یہاں سے شمال میں دو فرلانگ پر واقع ہے، بعد میں موجودہ آبادی ہوئی۔ شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے خسر شیخ غلام رسول یہیں کے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں کے شیخ فتح قلندر اور باقر علی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آخری دَور میں اس بستی میں مولانا محمد شریف صاحب مصطفٰے آبادی پیدا ہوئے۔

حسین آباد

قصبہ کے شمال میں پندرہ منٹ کی مسافت پر حسین آباد ہے۔ اس کا قدیم نام ''اودے بھان پور'' ہے، جو اب تک سرکاری کاغذات میں آتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی زیادہ تر آبادی شیخ فقیراللہ کی اولاد سے ہے۔ جو مئو سے یہاں آئے، وہ پہلے موضع ملک شدنی میں آباد ہوئے۔ ان کی شرافت و بزرگی دیکھ کر گوجر پار کے زمیندار اودے بھان سنگھ نے ان کو اپنی زمینداری میں آباد کیا اور ایک تحریر لکھ دی، جس میں مسلمانوں کے لیے بہت سی مراعات تھیں۔ شیخ فقیراللہ کی چار اولاد ہوئی۔ محمد قاسم، محمد مومن، نبی محمد اور محمد محمود۔ ان چاروں کی اولاد خوب پھلی پھولی اور ان میں دینداری اور علم کا چرچا رہا۔ نوابی اودھ کے دور میں شیعہ گردی کے چکر میں یہاں کے محمد حسین مہتر نے شیعہ مذہب قبول کرلیا تھا۔ مگر ان کے بعد یہ مذہب پروان نہ چڑھ سکا۔ انھیں کے نام پر اسے حسین آباد کہتے ہیں، اس کا نام حسین گنج بھی ملتا ہے۔ چناں چہ ۱۸۱۳ء کی جنگ میں مسلمانانِ قصبہ نے گورکھپور کی عدالت میں جو عرضداشت پیش کی تھی، اس میں ایک نام ''شیخ لال محمد ساکن حسین گنج'' ہے۔ ۱۹۰۴ء کے بلوہ میں حسین آباد کے چار مسلمان بھی سزایاب ہوئے تھے۔ شیخ عبدالعلی بن قائم بن فتح محمد، شیخ محمد علی بن مومن بن فقیراللہ، شیخ عبدالرحمٰن بن بہادر، امیر علی خاں بن شبراتی بن بدھو خاں۔ یہاں کے مرحومین علماء میں مولانا عبدالصمد بن محمد اکبر بن مومن بن فقیراللہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ دسویں ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۹ء میں حسین آباد کے شمال میں ہندو مسلم بلوہ ہوا تھا، جس میں قصبہ کے چار مسلمان شہید ہوئے تھے۔

چیونٹہی

قصبہ کے پچھّم چیونٹہی فی الحال رذیل پیشہ ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل ہے۔اس کا اصل نام مرتضیٰ آباد ہے۔ غالبًا یہ مصطفےٰ آباد کی معاصر بستی ہے۔''احسن الانساب بنوالعباس چریا کوٹ'' میں نواب حسن علی خاں بن شیخ محمد اسلم بن شیخ غلام محی الدین کے بارے میں ہے کہ:

''شیخ محمد اسلم منعقد شد بدختر شیخ	شیخ محمد اسلم کی شادی شیخ محمد پناہ
محمد پناہ عباسی چریاکوٹی از یشاں	عباسی چریاکوٹی کی بیٹی سے ہوئی۔
یک پسر نواب حسن علی خاں بہ	جن سے ایک بیٹے نواب حسن علی
ظہور آمدہ کہ خدا شد بدختر شیخ	پیدا ہوئے۔ جن کا نکاح شیخ
محمد عیوض صدیقی ساکن مرتضیٰ	محمد عیوض صدیقی ساکن مرتضیٰ آباد
آباد عرف چیونٹہی متصل	عرف چیونٹہی متصل مبارکپور کے
مبارکپور''۔الخ (ص:۹۶)	ساتھ ہوا۔ (قمر)

سرّیاں

قصبہ کے مشرقی شمالی گوشے میں چند فرلانگ پر سریاں نامی بستی ہے۔یہاں قدیم زمانے میں راج بھر قوم کی بہت بڑی اور خوشحال آبادی تھی۔اس کے آثار نمایاں ہیں۔اس جگہ کو اینٹور کہتے ہیں۔اس کے پاس موضع ملک شدنی ہے۔یہاں قصبہ کی سب سے قدیم تاریخی یادگار ملک شدنی کا مزار ہے۔ کہتے ہیں گورکھپور اور کچھار کی طرف جانے والے قافلوں کے لیے یہاں کئی سرائیں تھیں، جن میں مسافر ٹھہرتے تھے۔ بعد میں کثرتِ استعمال سے سریاں ہوگیا۔ یہاں کے قدیم علمی ددینی خانوادہ

شیخ عبدالوہاب سے علمی ودینی سلسلہ چلا۔ نیز ایک بزرگ شیخ کتوارومئو سے آکر سریاں میں آباد ہوئے، یہاں ان کی اولاد پھلی پھولی۔ شیخ عبدالوہاب، حافظ شاہ نظام الدین، مولانا شاہ محمد، مولانا ممتاز علی، مولانا عبدالحفیظ اور مولانا نظام الدین یہاں کے علماء وفضلاء میں سے تھے۔

نوادہ

سریاں اور رسولپور کے درمیان بڑی بستی ہے۔ اس میں تین محلے ہیں، نوادہ خاص، بہلول پورہ اور چاندپورہ، یہ بھی قدیم آبادی ہے۔ اعظم گڑھ گزیٹر میں غازی میاں کے میلے کے سلسلے میں نوادہ کا ذکر ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ایک بزرگ شیخ کمال الدین تھے، جن کا کنواں ان ہی کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ یہاں مولانا کرامت علی جونپوری کے دوممتاز مرید تھے، ایک حافظ عبدالرحمٰن بن عبدالکریم جو بچپن ہی سے بہت نیک اور پرہیزگار تھے، حتیٰ کہ سریاں کی درگاہ دیکھنے نہیں جاتے تھے۔ دوسرے حافظ عباداللہ بن کھدیرو، جن کا وصال مکہ مکرمہ میں ۱۳۲۰ھ میں ہوا۔ آخری دور میں حافظ ضیاء اللہ بن شیخ چھوٹک یہاں کے مشہور بزرگ تھے۔ شاہ ابواسحاق صاحب لہراوی کے نواسے مولانا علی احمد صاحب بھیروی متوفی ۱۳۱۲ھ سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ۵رشعبان ۱۳۵۴ھ کو ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رسول پور

قصبہ کے شمال مشرق میں سریاں اور نوادہ سے دوفرلانگ پر رسولپور املو کی زمینداری میں ہے۔ اس کے اتر جانب راج بھر قوم کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں

اور اس علاقے کو کوٹ کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اس جگہ جنگل تھا، ابھی جلدی تک جنگلی درخت موجود تھے۔ موجودہ بستی دسویں صدی کے آخر یا گیارہویں صدی کے اوّل کی ہے۔ کھورہٹ کے قریب سے تین بھائی شیخ زین، شیخ جمال اور شیخ کھید و ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ غالب آبادی ان ہی تینوں کی اولاد پر مشتمل ہے۔ ادری اور معین آباد متصل ابراہیم پور کے بھی بعض خاندان ہیں۔ یہاں کی سرزمین سے مولانا عبد العلیم، مولانا احمد حسین، مولانا محمد شعیب اور مولانا محمد یحیٰ جیسے سرآمدۂ روزگار اٹھے ہیں، جن کے علم و فضل سے بڑا فیض پہنچا۔

املو اور لوہیا

قصبہ کے مشرق میں ایک میل پر املو کی مشہور آبادی ہے، جو اپنے آثار سے قدیم معلوم ہوتی ہے۔ یہاں مسلم زمینداروں کی اکثریت ہے۔ دوسرے طبقوں کے مسلمان بھی ہیں۔ اس کے تین محلے ہیں، املو خاص، پورہ محبت اور پورہ محمود۔ یہ محلّہ شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری کے نام پر ہے۔ ان کی ایک کوٹ بھی یہاں تھی۔ ان کی چوتھی نسل میں شیخ محی الدین تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے، شیخ ابراہیم، شیخ چمرو اور شیخ غلام پیر۔ ان تینوں کی اولاد یہاں خوب پھلی پھولی۔ شیخ محمود قریشی بائسی کے معاصرین میں شیخ داراب بن شیخ دار تھے، ان کی اولاد بھی املو میں ہے۔ یہاں پیرزادہ شاہ محمد ماہ کا خاندان آخری دور تک علم و فضل کا گہوارہ رہا۔ ان کو موضع ملک شدنی رسولپور بیورا (کھورا) جاگیر میں ملے تھے۔ ۱۸۳۶ء کے نقشہ کشتواری میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اس خاندان میں آخری دور میں شاہ رشید عالم، شاہ مقصود عالم، اور مولوی حکیم شاہ فیاض عالم مشاہیر علماء میں تھے۔ املو کا ذکر اعظم گڑھ گزیٹیر میں ہے۔ یہاں ایک بزرگ شاہ غریب کا مزار ہے۔ قصبہ اور اطراف میں سب سے پہلے اس بستی سے

مسلک اہل حدیث کو فروغ ہوا اور مولوی عبداللہ جھاؤ نے مدتوں یہاں رہ کر اس سلسلہ میں کام کیا۔ یہ مقام مجاہدین بالاکوٹ کا بھی مرکز تھا۔ اکبر غازی، الٰہی بخش اور جہاں گیر یہاں کے مجاہدین میں ہیں۔ نیز متعدد علماء و محققین پیدا ہوئے۔ مولانا ابومحمد عبدالحق املوی مترجم ''تلبیس ابلیس''، مولانا نذیر احمد، مولانا قمرالدین ندوی وغیرہ مشہور عالم ہیں۔ شیخ فرحت حسین یہاں کے مشہور بہادر آدمی تھے۔ ان میں اور رام بلی سنگھ گوجر پار میں چشمک رہتی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اعظم گڑھ جیل میں فوت ہوئے۔ املو کے متصل لوہیا مسلمانوں کی مشہور بستی ہے۔

چکیا

املو کے جنوب میں شیخ احمد کی چھاؤنی تھی اور اس علاقے میں ان کی زمینداری کا چک تھا، بعد میں یہاں مستقل آبادی ہوگئی۔ یہاں کے زمیندار شیخ داراب کی نسل سے ہیں۔ سرکاری کاغذات میں اس کا نام چک شیخ احمد ہے۔ اس کے قریب نور پور، آدم پور اور پیارے پور وغیرہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔

اساور

قصبہ کے جنوب مشرق میں اساور مسلم زمینداروں کی بستی ہے۔ یہاں بھی راج بھر قوم کے بہت سے آثار ہیں۔ یہاں دو شہید واڑے ہیں، جن کا روضہ اب بھی شکستہ حال میں موجود ہے۔ ایک امر سے (عمر شیخ) شہید اور دوسرے سیکھندی (شیخ ہندی) شہید۔ اس کے قریب تختاجِ (تخت و تاج) نامی ایک علاقہ ہے۔ اس نام سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

لہرا، گجہڑا، فخرالدین پور

قصبہ کے جنوب میں سڑک کے پچھّم طرف یہ تینوں بستیاں قریب قریب واقع ہیں۔ جن میں مسلمان زمینداروں کی آبادیاں زیادہ ہیں۔ لہرا مشائخ بھیرا کا موروثی تھا۔ حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر کے خانقاہ اور مدرسہ بنوایا اور اس کا نام وحدت آباد رکھا۔ ان کے صاحبزادے شاہ ابواسحاق بھی یہیں رہے۔ ان کے تلامذہ میں مبارکپور کے کئی حضرات ہیں۔ گجہڑا میں مسلمان زمیندار اور بعض شیوخ آباد ہیں۔ یہاں پر شاہجہانی دور میں بندگی شیخ کمال الدین اور ان کے صاحبزادے قاضی محمد صالح گزرے ہیں۔ جنھوں نے ۱۰۹۹ھ میں یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی اور اسی سے متصل فخرالدین پور کی بستی ہے۔ ان علاقوں میں راج بھروں کی آبادی تھی، جس کے نشانات اب بھی ملتے ہیں۔

بمھُور

قصبہ کے مغرب جنوب میں دو میل پر بمھور نامی بستی ہے، جو اترا اور دکھن دو محلّوں میں تقسیم ہے۔ اصل لفظ غالباً ''بامہور'' ہے۔ بیرونی نے ''کتاب الہند'' میں اجین اور ماہورہ کے درمیان بامہور نامی ایک شہر کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں عام آبادی مسلمان زمینداروں کی ہے۔ یہ لوگ بڑوکھر (بڑا گھر) سے یہاں آکر آباد ہوئے، جو شمال میں کچھ دور پر ایک بڑی آبادی تھی۔ اس کے شمال میں دریائے ٹونس کے کنارے راج بھر قوم کی آبادی تھی، جس کے نشان اب تک موجود ہیں۔ رجب علی اور ان کے ساتھی یہاں کے مشہور بہادر تھے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت کا ضلع سے خاتمہ کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے برطانوی حکومت نے اہل بمھور کو باغی قرار دے کر ان کو لوٹا

اور آگ لگائی۔ یہاں قدیم وجدید دونوں قسم کی تعلیم کا رواج ہے۔ مولوی اشرف علی اور مولوی حافظ سجاد علی، مولانا شبلی ندوی وہاں کے اہل علم میں سے تھے۔ بمہور کے آس پاس حاجی پور، ککرہٹا، ڈھکوا، وغیرہ مسلم بستیاں ہیں۔

مبارکپور اور اس کے سواد کے باشندوں کے لیے قدیم زمانے سے مستقل ذرائع معاش و معیشت ہیں۔ قصبہ میں ریشمی کپڑے کی صنعت بہت قدیم ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں یہاں کے ریشمی کپڑے برطانیہ اور عرب ممالک تک جاتے تھے۔ سواد میں گزشتہ صدی تک نیل کی کاشت اور تجارت بھی عام تھی۔ جگہ جگہ نیل کے گودام اب بھی موجود ہیں، شکر سازی بھی ہوتی تھی۔ الغرض صنعت، زراعت، تجارت اور ملازمت وغیرہ وسائل معاش و معیشت ہیں۔

قصبہ اور اس کے ملحقات میں مسلمانوں کو ہمیشہ سے شان و شوکت حاصل رہی اور اس کے لیے ان لوگوں نے بڑی بڑی قربانیاں پیش کی ہیں۔ اندرون قصبہ کے تمام محلے کسی نہ کسی مسلمان شخصیت کے نام پر ہیں۔ اسی طرح یہاں کے بہت سے علاقے اور حلقے مسلم ناموں سے منسوب ہیں، جن میں مردوں کی طرح عورتوں کے نام بھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کئی مسلم خواتین شان و شوکت کی مالک تھیں۔ خاص قصبہ کے اندر محلوں میں علی نگر، پورہ خواجہ، پورہ صوفی بہادر، شاہ محمد پور، پورہ خضر، پورہ دیوان، محلّہ حیدر آباد اور مقامات میں راجہ صاحب، خواجہ تالاب (کھجوا)، شاہ محمودی (سمودھی)، پورہ دیوان کا باغ، راجہ بھانٹ کا گاڑا وغیرہ مردوں سے منسوب ہیں، جو اپنے زمانے میں اہمیت کے مالک تھے۔ اسی طرح محلوں میں پورہ رانی، پورہ دلہن اور مقامات میں عائشہ تالاب (استلاؤ) پانا آیا کی تکیہ، ڈومنی دائی کی مسجد وغیرہ ایسی خواتین کے ناموں سے نسبت رکھتی ہیں، جن کو خصوصیت اور شہرت حاصل تھی اور قصبہ کے باہر رسولپور، حسین آباد، مصطفےٰ آباد، رسولپور بیورا، کھنورا، سرائے مبارک، فخر الدین پور، داؤد پور، سالار پور، نور پور، وغیرہ ممتاز مسلمانوں کے نام پر ہیں۔ اس بارے میں بھی مبارکپور ضلع کے دوسرے مقامات سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

مذہبی فتنے

آخری دور میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ قصبہ کے عام مسلمانوں میں اپنے دفاع اور دینِ اسلام کی برتری کا شدید احساس پیدا ہو گیا اور یہ لوگ کسی بھی مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنے لگے۔ گزیٹیر میں ہے کہ قصبہ کی آبادی زیادہ تر جذباتی پارچہ بافوں پر مشتمل ہے اور مذہبی دشمنی کی آگ ان میں اور قصبہ کے اطراف و جوانب کے ہندوؤں میں ہمیشہ سلگتی رہتی ہے۔ وقتاً فوقتاً دونوں فرقوں کے درمیان خطرناک قسم کے تصادم اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے ۱۸۱۳ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۹۴ء اور ۱۹۰۴ء میں بڑے فسادات ہوئے اور ان فسادات کی نوعیت اور وجہ ایک ہی قسم کی تھی [1]

یہاں کے عام مسلمانوں میں اپنے دفاع اور جذباتیت کی ابتدا ایسے ناگوار حالات کا نتیجہ تھی، جو نوابی اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی پیداوار تھے۔ ۱۲۲۹ھ (۱۹/اپریل ۱۸۱۳ء) میں یہاں ایک نہایت سخت اور خوں ریز جنگ ہوئی۔ اس وقت دہلی میں اکبر شاہ بن شاہ عالم کی گری پڑی سلطنت تھی۔ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کا دورِ حکومت تھا اور مبارک پور ۱۲/سال پہلے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت رہ کر ضلع گورکھپور میں شامل تھا۔ یہ جنگ پورہ دلہن میں مکان رمضان علی شاہ کے پاس ہوئی تھی، جس میں ۳۵/۶۳ مسلمان شہید ہوئے اور تقریباً تین سو بلوائی مارے گئے اور آخر میں نو دن، نو رات تک مبارک پور لوٹا اور جلایا گیا۔ اُس زمانے کے حساب سے تقریباً پچاس لاکھ روپے کا مال و اسباب لوٹا گیا۔ اس واقعہ کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو حفاظت خود اختیاری کے جذبے نے جذباتی بنا دیا اور بعد میں ہر ایسے موقع پر انھوں نے بہادری دکھائی۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب بھور کے رجب علی مرحوم اور ان کے دو ہزار ساتھی

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔ ص: ۱۶۱۔

مبارکپور کے ہندو مہاجنوں اور تھانے کو لوٹنے کے ارادے سے قصبہ پر چڑھ آئے تو ان کو اطلاع دی گئی کہ یہاں سترہ سو بندوقیں، نو من بارود اور گولیاں تیار ہیں، اس کے بعد وہ واپس چلے گئے[1] بشن دیال سنگھ، گنگا بشن جے پال سنگھ و ہرپال سنگھ ساکنان موضع مگھرا ضلع فیض آباد اپنے آدمی لے کر قصبہ کے پورب پوکھرا پر آئے اور سارا میدان ان کے آدمیوں سے بھر گیا، سوائے بندوق اور تلوار کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ان کو بھی قصبہ والوں نے دعوتِ مقابلہ دی اور مہاجنوں کو لوٹنے سے پہلے ان سے نمٹنے کو کہا تو وہ سب کے سب واپس چلے گئے۔ اس کے بعد بارہ گیاں کے باشندے بھیم سنگھ ساکن سونابر کی ماتحتی میں قصبہ کی طرف بڑھے اور حسین آباد کے باغ میں ٹھہرے، ادھر سے بھی گولہ بازار میں نقارہ بجا اور بیشمار آدمی مقابلے کے لیے پہنچے اور لوگوں کا انبوہ کثیر دیکھ کر بارہ گیاں والے واپس چلے گئے[2] بعد میں ایسے ناگوار حالات سامنے آتے رہے کہ جذبے میں شدت آتی گئی۔ پھر زمیندارانہ رقابت اور ذاتی مفاد نے کئی بار مسلمانوں کے جذبات کا غلط استعمال کیا اور اپنے حریف کو شکست دینے کے لیے مذہب کے نام پر جنگ کرائی۔ چناں چہ ۱۹۰۴ء (۱۳۲۳ھ) میں گوجر پار اور مبارکپور میں جو کچھ ہوا اور جو تباہی آئی وہ ایک مسلمان زمیندار اور ہندو زمیندار کی رقابت کا بدترین مظاہرہ تھا۔ ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۴ء میں گئو رکھشنی تحریک سے اس قصبہ میں بڑی بے چینی پھیلی۔ ان ناگوار حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کے غیر مسلم مبارکپور والوں کو دشمن سمجھنے لگے اور ان کے بارے میں معاندانہ ذہنیت کام کرنے لگی۔

مسلمانوں کے اس جذبہ، حوصلہ اور جواں مردی و بہادری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی حد تک ان کا ذہن لڑائی جھگڑے سے مانوس ہو گیا اور ان کی جواں مردی اور بہادری آپس میں جنگ وجدال کرانے لگی۔ چناں چہ ان ہی ایام میں کئی مرتبہ شیعہ سنّی جھگڑے ہوئے اور آپس میں چھوٹے چھوٹے معاملات پر کشت وخون کی باری آئی۔ آخر میں جب یہاں

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۶۴۔

[2] ان واقعات کی تفصیلات ''واقعات وحادثات مبارکپور'' از: ص: ۶۰ تا ۷۳ درج ہیں۔

مختلف مسلک کی باری آئی تو وہی پرانی ذہنیت اور جذباتیت اس میں کام کرنے لگی۔ چناں چہ بعد میں بریلوی و دیوبندی کی لڑائی، شیعہ سنّی کے جھگڑے اس ذہنیت کی پیداوار ہیں اور اب معاملہ اس سے آگے گزر چکا ہے۔ ایک ہی فرقہ کے لوگ آپس میں لڑائی جھگڑا اور شر و فساد برپا کرتے ہیں۔ یہ قصبہ اس المیہ میں دوسری بستیوں سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے سخت نقصان میں ہے۔ برطانوی حکومت اس صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لیے ۱۸۱۳ء کی جنگ کے بعد جب مبارک پور میں تھانہ قائم ہوا تو عام طور سے یہاں مسلمان داروغہ اور تھانیدار رکھے جاتے تھے۔ اس سے پہلے تھانہ محمد آباد کے ماتحت صرف چوکی تھی۔ یہاں کے مسلمان تھانیداروں میں چند لوگوں کے نام یہ ہیں: مرزا کرم علی بیگ، میر جان علی جونپوری، خواجہ حبیب اللہ خاں، مرزا مکھو بیگ، مرزا ولی بیگ، میر رحمت علی، روشن علی، سید مبارک اشرف ساکن صوبہ بہار، مرزا محمد آغا جمعدار چوکی مبارک پور۔ ان میں سے بعض اہلِ قصبہ میں بے حد مقبول تھے۔ مرزا ولی بیگ سات برس تک یہاں رہے۔ یہ مبارک پور میں مجالس محرم منعقد کراتے تھے اور باہر سے اچھے اچھے مرثیہ خواں بلاتے تھے۔ ۶؍صفر ۱۲۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ میر رحمت علی علم طب جانتے تھے اور انھوں نے یہاں مطب جاری کر کے صدہا مریضوں کو شفایاب کیا۔

بعض اوقات باہر کے حکام و اعیان اور علماء یہاں کے مسلمانوں کے معاملات میں مدد کیا کرتے تھے اور حکومت و حکام سے مل کر ان کے معاملات طے کراتے تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں روضہ شاہ پنجہ میں ایک برقنداز سپاہی مارا گیا، جس کا مقدمہ اعظم گڑھ عدالت سے جونپور گیا، کیوں کہ ان دنوں یہاں کا انگریز جج وہیں تھا۔ اس مقدمہ میں مولانا کرامت علی صاحب کے ذریعے مفتی ولایت حسین، سید ناصر علی، ڈپٹی منصور علی خاں نے جو رؤسائے اعلیٰ و اراکین جونپور تھے، مقدمے کی پیروی کر کے مسلمانوں کو بری کرایا اور مفتی ولایت حسین نے مبارک پور کے لوگوں کی دعوت کی۔ ایک مرتبہ مبارک پور میں مولانا امانت اللہ صاحب غازیپوری نے کلکٹر کے پاس جا کر یہاں کے ایک سنگین معاملے میں بات چیت کی تھی۔

تکوینی حوادث

ان مذہبی فتنوں کے ساتھ ساتھ اس قصبہ میں بہت سے تکوینی حوادث بھی پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے یہاں کی معیشت پر نہایت خراب اثر پڑا اور آبادی کا معتد بہ حصہ دوسرے ملکوں اور شہروں میں جا کر آباد ہو گیا۔ ۱۸۰۴ء، ۱۸۳۸ء، ۱۸۶۸ء، ۱۸۷۸ء، ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۷ء میں سخت قحط پڑا۔ گزیٹیر کے بیان کے مطابق ۱۸۹۶ء کے قحط میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک روپے میں صرف ساڑھے دس سیر چاول، بارہ سیر گیہوں، سترہ سیر جو، پندرہ سیر چنا بکتا تھا[۱] ایک اخباری خبر کے مطابق اس زمانے میں ایک روپے کی جوار پونے آٹھ سیر، چاول پونے چھ سیر، ارد سات سیر، مہوا دس سیر، لتری ساڑھے آٹھ سیر بکتی تھی[۲] ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء (۱۳۲۱ھ و ۱۳۲۲ھ) میں بڑا طاعون آیا، جس میں مبارکپور ویران ہو گیا۔ بچے کھچے لوگ دوسرے علاقوں میں بھاگ گئے۔ اس طاعون کے بعد مولانا عبدالعلیم صاحب رسولپوری نے ''کتاب الشہادت'' لکھی اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری نے ''خیر الماعون فی منع الفرار عن الطاعون'' تحریر کی اور مدرسہ احیاء العلوم سے متعلق یتیم خانہ قائم ہوا۔ اس کے ساتھ یہاں صنعتی زوال آیا۔ ۱۸۹۶ء و ۱۸۹۷ء میں طاعون اور قحط نے ایک ساتھ تباہی برپا کی۔ اس دور میں ۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء میں گئو رکھشنی کا ہنگامہ ہوا۔ پھر ۱۹۰۴ء میں قحط و گرانی آئی، ساتھ ہی بڑا طاعون آیا۔ ان ناگفتہ بہ حالات نے یہاں کی معیشت وصنعت کو تباہ کر دیا اور لوگ بستی چھوڑ چھوڑ کر باہر جانے لگے۔ باشندگانِ قصبہ کے بلاد ہند اور ایشیائی ممالک میں منتقل ہونے کی ایک بڑی وجہ معاشی بدحالی ہے۔

---

[۱] اعظم گڑھ گزیٹیر۔ ص: ۴۷۔

[۲] اخبار لبرل اعظم گڑھ ۲۴ رنومبر ۱۸۹۶ء۔

ہندوستان کے مختلف شہروں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں یہاں کے لوگ بہت زیادہ ہیں اوران میں ان کی مستقل آبادیاں ہیں۔اس معاملہ میں یہ قصبہ ضلع کے دیگر مقامات سے ممتاز ہے۔ان حوادث وفتن میں قصبہ وسواد قصبہ کے تمام مسلمان شامل ہیں۔اس لیے یہاں کے ہر علاقے کے لوگ باہر ملتے ہیں۔

مذاہب اور فرقے

قصبہ وسواد قصبہ کے عام مسلمان قدیم زمانہ سے سنی حنفی مسلک پر عامل تھے۔ مگر آخری دور میں دوسرے مذاہب کو بھی فروغ ہوا اور یہاں کے مسلمان متعدد مسلکوں کے پیرو ہو گئے۔

سب سے پہلے نوابانِ اودھ کے زمانے میں تشیع کو رواج ہوا۔ انھوں نے تقریباً ۱۴۲ رسال حکومت کی، جس میں ۸۶ رسال تک مبارکپور اور اعظم گڑھ کے علاقوں پر ان کی حکومت رہی۔ انھوں نے اپنے دور میں لہو ولعب کے ساتھ شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کی طرف خاص توجہ کی۔ نوابی اودھ کا ہر نواب اور حکمراں پر جوش داعی و مبلغ تھا اور اس کے لیے بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا۔ نواب آصف الدولہ (۱۱۸۷ھ تا ۱۲۱۲ھ) کا خاص کارنامہ ہے کہ انھوں نے شیعیت کی اشاعت میں پوری کوشش کی۔ ان کے نائب نواب حسن رضا خاں بڑے مذہبی آدمی تھے۔ ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنّی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں۔ جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیر جو شاہان مغلیہ سے چلی آتی تھی ضبط کر لی گئی [۱] اودھ کی سلطنت نے خاص طور سے آس پاس کے اضلاع وقصبات پر اور بعض اوقات دُور دَراز مقامات پر مذہبی لحاظ سے اثر ڈالا۔ چناں چہ جونپور اور دیگر مقامات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقّن کو پہنچ جاتا ہے [۲] اسی لیے دیار پورب کے بہت سے علماء وفضلاء کی اولاد بعد میں شیعہ ہو گئی۔ جیسا کہ اس کے نسب ناموں سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ نواب آصف الدولہ کے دور میں رمضان علی شاہ نے مبارکپور میں اپنا مشہور امامباڑہ تعمیر کیا، جو بعد میں ''مکان'' کے نام سے

۱؎ گلِ رعنا۔ ص: ۱۵۳۔

۲؎ مقدمہ مآثر الکرام۔ ص: ۱۴۔

مشہور ہوا۔ ان ہی ایام میں متعدد مبلغین یہاں آئے اور انھوں نے شیعیت کی تبلیغ و تعلیم کا کام انجام دیا اور امام باڑے تعمیر کیے۔ چراغ علی شاہ نے قصبہ کے مغرب میں شاہ کا پنجہ نامی روضہ بنوایا اور سیف علی شاہ نے بھی ایک امام باڑہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ مبلغین باہر سے قصبہ میں تشیع کی تبلیغ و تعلیم کے لیے آتے تھے۔ اس زمانے میں بازار میں ''قدم رسول'' کے نام سے ایک عظیم الشان عمارت بنی۔ نیز قصبہ اور سواد قصبہ میں بہت سے امام باڑے، دالان اور چوک تعمیر ہوئے اور معافیاں دی گئیں اور خاص بات یہ رہی کہ تقریباً ہر امام باڑہ کے متولی سنی فرقے کے لوگ بنائے گئے۔ اس دور کے عام سنی بھی تعزیہ داری، ماتم و مرثیے میں آگے آگے رہتے تھے۔ بلکہ آج تک سنیوں کا ایک طبقہ اس میں پوری دلچسپی رکھتا ہے۔

''الناس علی دین ملوکھم''۔ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ (ثمر)

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ شیعہ سنی دونوں مل کر تعزیہ داری اور ماتم کرتے تھے۔ مگر سنیوں میں اپنی سنیت کا احساس بھی شدید قسم کا رہتا تھا۔ چناں چہ نواب سعادت علی خاں کے دور میں تبرّا کہنے پر ایک شخص کا قتل ہوا اور نواب موصوف تک مرافعہ ہوا۔ اسی طرح ایک مرتبہ عین عشرہ محرم کو بازار کے قدم رسول میں اسی بات پر شدید قسم کا جھگڑا ہوا۔ نیز ۱۸۱۳ء کی جنگ کی بنا چوک اور مندر کا جھگڑا تھی۔ ان واقعات کی تفصیل ''واقعات وحادث مبارکپور'' میں موجود ہے۔

۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) سے پہلے قصبہ میں اسماعیلی بوہرہ فرقہ کا رواج ہوا۔ جو درحقیقت شیعہ کی ایک شاخ ہے۔ مکان رمضان علی شاہ کے مدرسہ کے ایک مدرّس مولوی نثار علی سرائے میری شیعی حج کو نکلے۔ اس زمانے میں حجاج کے جہاز سورت سے بھی جاتے تھے۔ انھوں نے سورت میں قیام کے دوران اسماعیلی فرقہ کے داعی مطلق طیب زین الدین سے بحث و مباحثہ کے بعد اسماعیلی مذہب اختیار کرلیا اور وہیں سے مبارکپور واپس آکر اس کی تبلیغ و تعلیم کی اور چند شیعہ خاندانوں کو بوہرہ بنایا۔ وہ ۱۸۱۳ء کی

جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ سنیوں، شیعوں اور بوہروں میں شادی بیاہ کا کچھ نہ کچھ سلسلہ باقی تھا، مگر اب تقریباً ختم ہے۔ شیعیت اور اسماعیلیت کے بعد یہاں مسلک اہل حدیث کو فروغ ہوا۔ ہماری تحقیق میں اس علاقہ میں اس مسلک کے علم بردار حضرت شاہ ابواسحاق لہراوی متوفی ۱۲۳۴ھ ہیں۔ جن پر اپنے استاد مولانا محمد فاخر الہ آبادی متوفی ۱۱۶۴ھ کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ مولانا محمد فاخر شیخ محمد حیات سندھی مدنی متوفی ۱۱۶۳ھ کے تلامذہ میں سے تھے۔ وہ عمل بالسنہ کے ساتھ فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان کے مالک تھے۔ کتاب وسنت اور اپنے اجتہاد و تفقہ پر عمل کرتے تھے۔ شاہ ابواسحاق صاحب کا انداز بھی تقریباً یہی تھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب ''نور العَینَین فی اِثباتِ رفعِ الیدین'' میں کیا ہے۔ پھر اس مسلک کو مولوی عبداللہ جھاؤ الہ آبادی کی وجہ سے خاص تقویت پہنچی۔ جنھوں نے تیرہویں صدی کے آخر میں املو کو اپنی تبلیغ و تعلیم کا مرکز قرار دیا تھا۔

مولانا عبداللہ جھاؤ الہ آبادی مئو آئمہ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں شاہ اسحاق صاحب دہلوی متوفی ۱۲۶۲ھ سے پڑھا۔ بقول صاحب ''نزہۃ الخواطر'' وہ قلیل الدرس کثیر التصنیف تھے اور ان کی کتاب میں توحید کی شیرینی اور شہد کی مٹھاس ہے تو دوسرے امور میں حنظل کی تلخی بھی ہے۔

وہ اپنے مخالفوں کے بارے میں شدید تعصب رکھتے تھے اور ان کا شدید رد کرتے تھے۔ ظاہری نصوص پر عمل کرتے تھے اور حنفیہ، شافعیہ اور دیگر مذاہب والوں کی تکفیر کرتے تھے۔

مولانا ابوالطیب شمس الحق صاحب نے بھی ان کے بارے میں یہ تصریح کی:

> ''اشاعت سنت میں ان کے بڑے مناقب ہیں۔ اگر ان کے اندر بعض مسائل میں شدت اور سختی نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔'' (نزہۃ الخواطر۔ ج: ۷۔ ص: ۳۰۵)

مولانا عبداللہ صاحب ''جھاؤ'' کے لقب سے ان علاقوں میں مشہور تھے۔ انھوں

نے مدتوں املو میں رہ کر اطراف و جوانب میں اس مسلک کی تبلیغ کی اور مئو تک ان کا اثر پھیلا۔ بعد میں مولوی حکیم امان اللہ وغیرہ نے مبارک پور میں اس مسلک کو آگے بڑھایا۔ تراجم علمائے اہل حدیث میں ہے کہ مولانا عبداللہ کچھ مدت بعد اعظم گڑھ تشریف لے گئے، پھر موضع املو آئے، یہاں بھی جماعتیں بنائیں، املو سے بنگال کا قصد فرمایا۔[1]

اس مسلک میں کئی علمائے کبار اور مصنفین عظام پیدا ہوئے۔ ان سب کے آخر میں یہاں دیو بندی مکتب خیال کو فروغ ہوا۔ دراصل یہ کوئی نیا مسلک نہیں تھا، بلکہ حنفیت کے ایک طبقے کی اصلاحی تحریک تھی۔ جس کا تعلق زیادہ تر رسم و رواج اور بدعات کے رد سے تھا۔ فقہی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں تھا، البتہ زیادہ تر اختلاف کتاب کی عبارتوں میں رہا۔ اس مسلک کی ابتدا ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کی بنیاد کے بعد ہوئی۔ ابتدا میں مولانا محمود صاحب اور مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب نے اپنے ساتھیوں کو لے کر اس کے لیے کام کیا۔ اس کے بعد ۱۳۳۶ھ سے مولانا شکر اللہ صاحب اس تحریک کے داعی و مبلغ بنے اور بڑی سرگرمی اور کامیابی سے قصبہ اور اطراف میں اس کی اشاعت کی۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے معرکے ہوئے اور سخت حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔

---

[1] تراجم علمائے اہل حدیث۔ ابو یحییٰ نوشہروی۔ ج: ا۔ ص: ۳۴۱۔

روحانی سلسلے

راجہ سید مبارک شاہ کے مورثِ اعلیٰ حضرت راجہ حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ راجگان چشت میں پہلے بزرگ ہیں، جنھوں نے سلاطین مشرقیہ کے دور میں جونپور آکر اس دیار میں اس سلسلے کو فروغ دیا اور یہاں کے علمائے فحول ان کی بیعت وارادت میں آئے۔ جن میں مولانا حسن بن طاہر جونپوری ۹۰۹ھ مولانا الٰہ داد جون پوری ۹۲۳ھ خسر راجہ مبارک شاہ مولانا بہاء الدین جونپوری ۹۱۱ھ مولانا دانیال بن حسن جونپوری ۹۹۲ھ زیادہ مشہور ہیں۔

ان حضرات سے سلسلۂ چشتیہ کو اِس دیار میں خوب فروغ ہوا۔ خود راجہ مبارک شاہ بانی مبارکپور بقول صاحب گنج ارشدی ''اس سلسلے کے قدوۂ اہل اللہ وپیشوائے عرفاء اللہ تھے'' اور ''واکثر اولیائے کُمّال مرید وخلیفہ آنحضرت بودند'' (اور اکثر اولیائے کاملین اُن کے مرید وخلیفہ تھے) خاص طور سے ان کے صاحبزادوں میں راجہ سید مجتبیٰ اور ان کے صاحبزادے راجہ سید احمد حلیم اللہ مانک پوری ۱۰۴۰ھ کا روحانی فیض بہت عام ہوا۔ راجہ سید احمد حلیم اللہ دیوان محمد رشید جونپوری ۱۰۸۳ھ کے شیخ ومرشد ہیں اور انھوں نے اطراف جونپور میں روحانی خدمت انجام دی۔ چناں چہ ''گنج ارشدی'' میں ان کے ایک محمد آبادی مرید کا ذکر موجود ہے۔ آخری دور میں راجگان چشت میں کئی حضرات ان اطراف میں آباد ہوگئے۔ اس سے پہلے یہ حضرات یہاں آتے جاتے تھے اور مستقل قیام مانک پور ہی میں کرتے تھے۔ راجہ سید ابراہیم مانک پوری بھی اس دیار کے چشتی مشائخ میں سے تھے۔ ملا محمود جونپوری کے دادا شیخ بڑے صاحب ان کے مرید تھے۔ راجہ سید غلام نظام الدین عرف راجہ خیر اللہ مانک پوری ۱۱۲۸ھ بانی خیر آباد حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے سلسلۂ چشتیہ کے شیخ ہیں۔ ان کے بھائی راجہ غلام معین الدین عرف راجہ دانی

۱۱۳۰ھ جونپور میں قیام پزیر تھے اور وہیں دفن ہوئے۔ راجہ خیر اللہ کے بیٹے راجہ مردان علی اور راجہ دانی کے بیٹے غلام احمد تھے۔ یہ سب حضرات بارہویں صدی کے آخر تک اس دیار میں مشیخت وروحانیت کے علم بردار رہے اور ان سے سلسلۂ چشتیہ کو فروغ ہوا۔ مبارکپور اور اس کے حدود گویا مانک پور کے راجگان چشت کے دیار تھے۔ خود راجہ مبارک شاہ بانی مبارکپور نے یہاں رہ کر اس سلسلے کے فیوض وبرکات عام کیے۔ راجہ صاحب کی مسجد کے عقب میں جو قناتی مسجد ہے، وہی راجہ صاحب کی خاص مسجد ہے۔ اس میں وہ عبادت وریاضت کرتے تھے۔ ان کے ہمراہ مانک پور سے جو خانوادہ یہاں آکر آباد ہوا، اس میں یہ سلسلہ جاری وساری تھا۔ شیخ علی، شیخ امام بخش، اور شیخ حسام الدین شاہ کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں وہ اس سلسلے کے اکابر میں سے تھے۔ حضرت مولانا کرامت علی جونپوری متوفی ۱۲۹۰ھ کے مریدین ومتوسلین بھی قصبہ اور اطراف میں تھے، خاص طور سے نوادہ اور سریاں میں ان کا فیض زیادہ عام ہوا۔ ایک روایت کے مطابق وہ یہاں اکثر آتے تھے۔ ایک مرتبہ موضع پاہی میں وعظ فرمارہے تھے کہ نماز کا وقت ہوگیا، ہندو مسلمان سب ہی موجود تھے، آپ نے نماز اور اذان کا اعلان کیا اور اذان دی گئی۔ اس دن سے پاہی میں اذان کا رواج ہوا۔ وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ ومرید تھے۔ ان کے دو ممتاز مرید حافظ عباد اللہ نوادوی متوفی ۱۳۲۰ھ اور حافظ ضیاء اللہ نوادوی متوفی ۱۳۵۴ھ تھے۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی متوفی ۱۳۱۳ھ کا حلقۂ بیعت وارادت بھی اس علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ جو مولانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی کے مشہور تلامذہ میں تھے اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب دہلوی کے خلیفہ تھے۔ نیز شاہ غلام علی دہلوی سے کسب فیض کیا تھا۔ منشی حبیب اللہ صاحب ساکن محلّہ کٹرا اور شیخ علیم اللہ صاحب املوی ان کے مریدوں میں تھے اور شیخ محمد طیب گرہست کو ان کے والد نے حضرت مولانا فضل رحمٰن کی خدمت میں لے جاکر

مرید کرایا تھا اور ان کے حق میں دعا کرائی تھی اور قصبہ میں مولانا شمس الدین صاحب حسینی کے ننہال کے بزرگ حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔

آخری دور میں حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی رائے بریلوی متوفی ۱۳۲۶ھ کے سلسلے میں ان اطراف سے کئی علماء وفضلاء شامل ہوئے۔ جن میں مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری بھی شامل ہیں۔ شاہ ضیاء النبی نے دہلی میں شاہ عبدالغنی بن ابوسعید سے پڑھ کر دیگر کتب درسیہ مفتی سعد اللہ مراد آبادی وغیرہ سے لکھنؤ میں پڑھیں اور طریقت خواجہ احمد بن محمد یٰسین نصیر آبادی سے حاصل کی۔ نیز خواجہ فیض اللہ اورنگ آبادی کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا عبدالعلیم رسولپوری نے مولانا مفتی محمد نعیم فرنگی محلی سے بیعت کی تھی۔ مولانا امانت اللہ بن مولانا فصیح غازیپوری گزشتہ صدی میں یہاں آتے جاتے تھے۔ خیال ہے کہ ان کے حلقۂ ارادت میں کچھ لوگ رہے ہوں گے۔ پہلی بار نومبر ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) یہاں آئے تھے اور بعد نماز جمعہ راجہ صاحب کی مسجد کے فرش پر ان کا وعظ ہوا تھا۔ اس وقت یہاں ایک جدید تعمیر شیوالہ کا جھگڑا چل رہا تھا اور گارنر بہادر کلکٹر مبارکپور میں تھا۔ مولوی صاحب پالکی پر سوار ہو کر اس سے ملنے گئے اور اس سلسلے میں گفتگو کی[1]۔

مولانا سید محمد ظاہر رائے بریلوی متوفی ۱۲۷۸ھ اور مولانا حکیم سید فخر الدین رائے بریلوی ۱۲۷۳ھ میں مبارکپور میں

حضرت احمد شہید کے خلیفہ مولانا سید محمد ظاہر (ولادت ۱۱۹۸ھ وفات ۱۲۷۸ھ) بڑے خوش تقریر اور صاحب کمالات بزرگ تھے۔ علومِ دین کے ساتھ اُردو، ہندی اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ''تحریم الحرام'' ''قاطع البدعۃ''، ''خیر المسالک'' اور ''وحدۃ الوجود'' کے نام سے چند رسالے بھی سپردِ قلم فرمائے۔

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور، ص ۶۰، ۷۰ و یادداشت قلمی شیخ عبدالمجید۔

''الشیخ العالم الکبیر محمد ظاہر بن غلام جیلانی بن محمد واضح بن محمد صابر بن آیۃ اللہ بن علم اللہ الحسنی حسینی البریلوی احد العلماء الربانین''۔

(نزہۃ الخواطر۔ ج ۷۔ ص: ۲۴۵)

یو پی کے مشرقی اضلاع میں آپ کے سیکڑوں مرید تھے اور آپ کے پر اثر مواعظ سے لوگ بدعت سے متنفر اور سنتِ نبوی کے دلدادہ ہو جاتے تھے۔

مولانا سید فخر الدین بریلوی متوفی ۱۳۲۶ھ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دادا نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر اپنی کتاب ''مہر جہانتاب'' میں یوں کیا ہے:

''ہم لوگ مولانا محمد ظاہر صاحب کے ساتھ ان کے حلقۂ مریدین میں بنارس، غازیپور، اعظم گڑھ و جونپور کے سفر میں تھے۔ ایک شام جگدلیش پور (سلطانپور) کے زمیندار کے پاس بیٹھے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء کی خبر پہنچی، راجہ (غالباً کنور سنگھ) نے کہا کہ اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے اور مسافر خانہ نامی گاؤں میں ٹھہرے........ ہم لوگ جونپور آ کر مولوی امام بخش صاحب کے مہمان ہوئے۔ وہاں سے اعظم گڑھ گئے، جہاں لوگ قصیدہ شاہ نعمت اللہ کرمانی کے بموجب نئے انقلاب کی پیشین گوئی کر رہے تھے:

از پیشترك هر شدنی را بسخنها
واگویا کنانند و نقاره نوا زند

مستقبل میں پیش آنے والے حالات کو پہلے ہی اپنی باتوں میں ظاہر فرما دیتے ہیں اور خبردار کرنے کی غرض سے نقارہ بجا دیتے ہیں۔ (قمر)

مبارکپور میں مولانا سید محمد ظاہر وعظ فرمانے سے پہلے مجھ سے تلاوت قرآن کراتے اور پھر [illegible] تے تھے۔ بیشمار لوگوں نے ان سے

بیعت کی اور گناہوں سے توبہ کی۔ اسی دوران مولانا کرامت علی، مولوی فیض اللہ مئوی، مولوی غلام رسول (ولایتی نزیل رسڑا)، مولوی طاہر (معروفی)، مولوی محمد مہیمن فرزند مولوی سخاوت علی سے ملاقات ہوئی۔ پھر غازیپور گئے اور مولوی غیاث الدین تحصیلدار کے یہاں دس دن ٹھہرے''[1]

ان تمام روحانی سلسلوں کے باوجود قصبہ میں مشائخ کچھوچھہ کا سلسلۂ بیعت وارادت ہر طرف عام تھا اور کہنا چاہیے کہ سب سے زیادہ فروغ اسی کو حاصل تھا۔ مبارکپور اور سکٹھی کے عام سنی مسلمان ان کی عقیدت ومحبت سے سرشار تھے۔ ہمارے بچپن تک ان حضرات کی تشریف آوری کے ایام میں عموماً کاروبار بند کر کے ان کے معتقدین ومریدین ہمہ تن دل وجان سے ان کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ بعد میں دیوبندی مکتب خیال کے لوگ مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ ہمارے علم میں قصبہ اور ملحقات قصبہ میں مولانا مرحوم سے بیعت وارادت کا شرف سب سے پہلے مولانا احمد حسین صاحب رسولپوریؒ کی زوجۂ محترمہ رحیمہ بنت حافظ نظام الدین متوفیہ ۱۳۷۸ھ کو حاصل ہوا۔ مولانا احمد حسین صاحب مولانا تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کے دورِ شباب میں ان سے کانپور میں تعلیم حاصل کر کے اپنی زوجہ کو اپنے استاذ کے سلسلۂ بیعت میں داخل کیا اور خود شاہ ضیاء النبی صاحب سے نسبت رکھتے تھے۔ اس کے بعد قصبہ کے کئی حضرات مولانا تھانوی کی تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے اور آخر میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے سلسلہ کو اس مکتب خیال کے لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

[1] رسالہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۸۱ء۔ ص: ۳۷۱ تا ۳۷۲۔ (مہر جہانتاب۔ ص: ۱۷۷)

مکاتب و مدارس

دیارِ پورب کے دیگر علاقوں کی طرح مبارکپور اور اس کے سواد میں ماضی قریب تک خانگی مکاتب و مدارس موجود تھے، جن میں قرآن شریف، اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم ہوتی تھی۔ بہت سے گھروں کی عورتیں محلّہ اور پڑوس کے بچوں، بچیوں کو تعلیم و تربیت دیتی تھیں اور حفاظ اپنے مکانوں پر حفظ قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ ان ذاتی مکاتب اور شخصی مدارس سے بہت زیادہ فیض پہنچتا تھا اور پوری بستی میں علمی اور دینی فضا بنی رہتی تھی۔ اس دور میں میاں صاحب لقب کا ایک طبقہ تھا، جو فارسی دانی میں شہرت رکھتا تھا اور اپنے طور پر فارسی کی اونچی تعلیم دیتا تھا۔ میاں صاحب جان محمد، میاں صاحب عبداللہ، میاں صاحب عبدالواحد، میاں صاحب یار علی وغیرہ اپنے اپنے زمانے کے فارسی کے مشہور معلم و مدرّس تھے اور اونچی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ ان کے یہاں سے تعلیم پا کر مدرسہ حنفیہ جونپور اور مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور وغیرہ میں جاتے تھے۔ سریاں میں حافظ نظام الدین کا خانگی مدرسہ خاص شہرت رکھتا تھا اور وہاں سے بہت سے حفاظ اور کئی علماء پیدا ہوئے۔ حافظ لعل محمد الہ آبادی متوفی ۱۳۳۷ھ (مارچ ۱۹۱۸ء) حافظ عبداللطیف امام جامع مسجد متوفی ۱۳۳۴ھ (۲۵ رفروری ۱۹۱۵ء) اپنے اپنے طور پر تعلیم دیتے تھے۔ حافظ ہدایت اللہ صاحب متوفی ۱۳۳۵ھ (۱۶ ردسمبر ۱۹۱۶ء) کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے حفاظ شاگرد ایک سو سے زیادہ ہی تھے۔ مولوی ولی محمد عرف مولوی گودا اور مولوی حکیم عبداللہ فارسی کے اونچے اساتذہ میں تھے اور باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ ان گھریلو مدارس سے جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی تعلیم دیتی تھیں، بہت فیض پہنچتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مفت تعلیم کے ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کی بہترین تربیت ہو جاتی تھی۔ طلبہ و طالبات اپنے اساتذہ اور استانیوں کی نگرانی میں اخلاق و شرافت اور

امورِ خانہ داری بھی سیکھتے تھے اور ان کے یہاں سے لکھنے پڑھنے کے ساتھ اخلاق و کردار سے مرصع اور معاش و معیشت سے واقف ہو کر نکلتے تھے اور نسلاً بعد نسلٍ اس علمی رشتے کا احترام کرتے تھے۔ استاذ محمد حسن الاعظمی مبارکپوری ازہری نے ''فتح الہند وقصۃ باکستان'' کے صفحہ ۲۰-۲۱ پر یہاں کے ان مدارس ومکاتب کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان کے طور طریقے اور نظام تعلیم وتربیت سے بحث کی ہے۔ افسوس کہ یہاں کے قدیم علماء وفضلاء کی طرح قدیم مدارس کے حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں اور نوابی اودھ سے پہلے کی درسگاہوں اور ان کے اساتذہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ البتہ اس دور میں ہم کو حضرت شاہ ابواسحاق لہراوی ۱۲۳۴ھ کا مدرسہ نظر آتا ہے۔ جس میں کم از کم ان کے تین مبارکپوری تلامذہ نے اکتساب علم کیا۔ لہرا میں آج تک ایک جگہ ''مدرسہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ غالباً یہی شاہ ابواسحاق صاحب کا مدرسہ تھا۔ جس کی بنیاد ان کے والد ماجد حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان ۱۱۷۸ھ نے رکھی تھی اور وہ اس میں باقاعدہ درس دیتے تھے۔ نوابانِ اودھ کی عمل داری کے بعد یہ پہلا مدرسہ تھا، جو ان کے اثرات سے محفوظ رہ کر جاری وساری تھا۔ بعد میں یہاں نوابانِ اودھ کے مسلک کو فروغ دینے کے لیے ان کے دعاۃ ومبلغین ومعلمین آئے۔ جنھوں نے شیعیت کی تبلیغ کے ساتھ اس کی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا۔ چناں چہ اس دور میں رمضان علی شاہ، سیف علی شاہ، چراغ علی شاہ وغیرہ یہاں کے مبلغ ومعلم تھے، جنھوں نے اماباڑوں کے ساتھ مدرسوں کا اجراء کیا اور ان میں باہر سے اساتذہ ومعلمین لاکر رکھے۔ امامباڑہ رمضان علی تعمیر کردہ بعہد شجاع الدولہ ۱۲۰۹ھ جو مکان کے نام سے مشہور تھا، اس میں بہت بڑا مدرسہ تھا، جس میں باہر کے کئی مدرّس تھے۔ مولوی علی حسن ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کا جو اسی مقام پر ہوئی تھی، حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس امامباڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان بھی تھے اس میں ایک بڑے متبحر عالم، فاضلِ بے مثل بنام مولوی نثار علی مرحوم ساکن قصبہ

سرائے میر برادر زادہ شیخ جان علی صاحب مرحوم خوش نویس، علوم عربی
وفارسی کا درس دیتے تھے اور اسی امامباڑے میں قیام پزیر تھے''[1]

مولوی نثار علی صاحب اسی جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے ۱۲۲۹ھ میں شہید ہوئے۔ نیز اسی جنگ میں امامباڑہ کے اندر دو اور عالم شہید ہوئے تھے۔ ایک مولوی محمد نشان اور دوسرے میر معظم حسین۔ غالباً یہ دونوں صاحبان بھی اسی مدرسہ میں مدرّس تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے جو عرضداشت گورکھپور عدالت میں پیش کی گئی تھی، اس میں امامباڑہ کے اندر شہید ہونے والوں کے نام درج تھے، ان میں یہ دونوں صاحبان بھی ہیں۔ عرضداشت میں ہے کہ ''مسمیان مولوی نشان و میر معظم حسین مسافر ان کہ دار د بودند'' غالباً یہ باہر سے یہاں تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے یا بلائے گئے تھے۔ آج تک یہ مدرسہ باب العلم کے نام سے جاری ہے اور یہاں دُور دُور تک کے طلباء آتے ہیں اور شیعہ جماعت کے زیر تصرف چل رہا ہے، قصبہ کا یہ سب سے قدیم مدرسہ ہے۔ اس زمانے میں ایک اور مدرسہ لالن مہتر کے امامباڑے میں تھا۔ جس میں بشارت علی نامی مدرّس لڑکوں کو درس دیتے تھے۔ وہ نگپور جلال پور ضلع فیض آباد کے تھے[2] اس صدی کی ابتداء میں بازار کی مسجد میں ایک مدرسہ تھا، جس میں مولوی سلامت اللہ صاحب اُردو، عربی، فارسی کا درس دیتے تھے۔ ۱۳۱۴ھ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث نے دارالتعلیم کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، جس کے پہلے مدرّس وہی تھے۔ یہ مدرسہ آج بھی اچھی حالت میں چل رہا ہے اور اہل حدیث مکتب خیال کا ترجمان ہے۔ ۱۳۱۷ھ میں احناف نے ایک مدرسہ مصباح العلوم کے نام سے جاری کیا۔ جس کے مدرّسِ اوّل مولانا محمد محمود صاحب معروفی متوفی ۱۳۷۰ھ اور مدرّسِ دوم مولانا محمد صدیق صاحب گھوسوی تھے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد دیوبندی اور غیر دیوبندی کا اختلاف پیدا ہوا اور

---

[1] واقعات و حادثات مبارکپور۔ ص: ۱۷۔

[2] واقعات و حادثات مبارکپور۔ ص: ۲۳۔

مولانا محمد صدیق صاحب مدرسہ کو پرانی بستی میں لے گئے اور اپنے مدرسہ کا نام مصباح العلوم ہی رکھا، جو بریلوی نقطۂ نظر کا حامل رہا اور پرانا مدرسہ جو پورہ صوفی میں قائم ہوا تھا احیاء العلوم کے نام سے اپنی جگہ پر چلتا رہا جو دیوبندی نظریہ پر جاری رہا۔ بعد میں ان دونوں مدرسوں نے بڑی ترقی کی اور تعلیمی میدان میں شاندار خدمات انجام دیں۔ قصبہ کے چاروں مدارس اس وقت بھی اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اور سب میں مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ بھی پڑھتے ہیں۔ ان مدرسوں کی شاخ کے طور پر یا مستقل طور پر سواد قصبہ میں بھی کئی مدرسے چل رہے ہیں، جس کی شاندار عمارتیں اور مستقل مدرّسین ہیں۔ سریاں، رسولپور، نوادہ، املو، حسین آباد اور سکٹھی میں ایسے مدارس کامیابی سے چل رہے ہیں۔ موجودہ صدی کی ابتداء میں یہاں کے اکثر طلباء مقامی مکاتب و مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور، مدرسہ حنفیہ جونپور، مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ وغیرہ جاتے تھے۔ اس زمانے میں پورب کی دو دَرسگاہیں بہت مشہور تھیں، مدرسہ حنفیہ جونپور اور مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور اور دونوں میں قابل اساتذہ درس دیتے تھے۔ اس لیے مبارکپور کے طلباء عام طور سے ان ہی دونوں کی طرف رخ کرتے تھے، مگر بعد میں ہر مکتب فکر کے طلبہ اپنے اپنے مدرسے میں آخری تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسماعیلی بوہرہ کا ایک مکتب مسجد جہاں گیر پورہ دیوان میں تھا۔ جس کے مدرّس میاں صاحب عبداللہ شفا تھے۔

علمی اور درسی سلسلے

تیرہویں صدی میں کئی علمی سلسلے اپنے فیوض و برکات کی بدولت خوب چلے اور پورے ملک میں ان کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ مبارکپور میں بھی ان کے فیوض آئے اور یہاں کے علماء نے ان سے کسب فیض کیا۔ ان میں ولی اللٰہی سلسلہ خاص طور سے بہت مقبول ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ۱۱۷۶ھ نے ہندوستان میں دین وعلمِ دین کی تجدید واحیاء کی طرح نو ڈالی اور کتاب وسنت کو اصل قرار دے کر فقہ حنفی کو توسع واجتہاد کی روشنی میں اختیار کیا، ساتھ ہی احسان وتصوف کی چاشنی بھی باقی رکھی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ۱۲۴۸ھ، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ۱۲۳۰ھ، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب ۱۲۳۳ھ نے کام کو آگے بڑھایا۔ شیخ عبدالوہاب سریانویؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واپسی پر ان کے فتاویٰ کا معتدبہ حصہ اپنے ساتھ لائے۔ نیز مولانا عبداللہ جھاؤ مبلغ مسلک اہل حدیث وتلمیذ مولانا شاہ اسحاق دہلوی نے یہاں اپنا سلسلہ جاری کیا۔ آگے چل کر خانوادۂ ولی اللٰہی کے علوم ومعارف دو حلقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک حلقہ نے کتاب وسنت کے ساتھ فقہ وتصوف کو بھی باقی رکھا اور ۱۲۸۲ھ میں اپنا مرکز دارالعلوم دیوبند کو بنایا اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ۱۲۵۶ھ تلمیذ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی، حاجی امداداللہ صاحب ۱۲۹۷ھ، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب نے اس کی سرپرستی کی۔ ہمارے علم میں یہاں اس حلقہ کے سب سے پہلے دو عالم ہوئے، ایک مولانا احمد حسین رسولپوری، جنھوں نے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مولانا اشرف علی تھانوی سے تفسیر جلالین، مشکوٰۃ، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ہدایہ پڑھی اور ان کی زوجہ محترمہ مولانا سے بیعت ہوئیں۔ مولانا تھانوی، مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے

ارشد تلامذہ میں تھے اور شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ۱۲۹۷ھ کے روحانی فیوض و برکات کے جامع تھے اور دوسرے مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب مبارکپوری ہیں۔ جنھوں نے مدرسہ فیض عام کانپور میں مولانا احمد حسن کانپوری سے تعلیم حاصل کی، جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے صحبت یافتہ تھے۔ اس کے بعد یہاں کے دیوبندی علماء اس سلسلے سے منسلک ہوئے۔

ولی اللّٰہی سلسلہ کا دوسرا حلقہ وہ ہے، جس نے کتاب وسنت کے ساتھ فقہی تقلید کا جوڑ پسند نہیں کیا اور استنباط واجتہاد کی راہ اختیار کی۔ اس کے ترجمان مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی ۱۳۲۰ھ تلمیذ مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی تھے۔ مبارکپور میں اس حلقے کے متعدد علماء پیدا ہوگئے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا عبدالحق املوی، مولانا بخشش احمد (محمد احمد) صاحب لہراوی اور مولانا شاہ محمد صاحب سریانوی نے براہِ راست مولانا نذیر حسین صاحب سے پڑھا اور موخرالذکر کے علاوہ سب کے سب مسلک اہل حدیث کے جید علماء و مصنفین میں شمار ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے تراجم علمائے اہل حدیث کے مقدمہ میں حضرت میاں نذیر حسین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس درسگاہ سے ایک اور نامور تربیت یافتہ ہمارے ضلع اعظم گڑھ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم مبارکپوری تھے، جنھوں نے تدریس وتحدیث کے ساتھ ساتھ جامع ترمذی کی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' عربی میں لکھی[1] ان حضرات کے بعد اہل حدیث مسلک کے علماء نے اس حلقہ کے اساتذہ وشیوخ سے استفادہ کیا۔

علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے معقولاتی ومنقولاتی سلسلے سے بھی یہاں کے اہل علم وابستہ رہے۔ اطراف مبارکپور میں اس سلسلے کے پہلے فیض یافتہ عالم مولانا شاہ محمد علی بھیروی تھے۔ جنھوں نے مدراس جاکر حضرت ملا عبدالعلی بحرالعلوم سے تعلیم حاصل کی تھی۔ علمائے رسولپور کو اس سلسلہ سے خاص تعلق رہا ہے۔ مولانا عبدالعلیم رسولپوری نے مولانا

---

[1] مقدمہ تراجم علمائے اہل حدیث۔ ص: ۳۷۔

مفتی محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی ۱۳۰۴ھ سے تکمیل کر کے مفتی محمد نعیم صاحب سے بیعت کی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث نے مولانا محمد سلیم پھریہادی سے پڑھا، جو معقولات میں مولانا مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ نیز مبارکپور کے مشرق و مغرب میں علمائے فرنگی محلی کی دو مشہور درسگاہیں تھیں، جن میں کئی علمائے مبارکپور نے تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ حنفیہ جونپور کے پہلے مدرس مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی والد مولانا عبدالحئی فرنگی محلی تھے۔ پھر ۱۲۷۷ھ میں مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی نے ان کی جگہ پائی اور مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کو مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی نے ۱۲۷۷ھ میں جاری کیا۔ بعد میں علمائے رسولپور اس کے صدر مدرّس ہوتے رہے اور مشرق میں فرنگی محل کی علمی میراث ان کے ہاتھوں مدتوں اہل علم میں تقسیم ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ خود علمائے فرنگی محل نے ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ مولانا محمد شعیب رسولپوری سے مدرسہ چشمۂ رحمت میں مولانا مفتی عبدالقادر صاحب فرنگی محلی اور مولانا عزت اللہ صاحب فرنگی محلی نے تعلیم حاصل کی۔ الغرض مدرسۂ حنفیہ جونپور اور مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کے ذریعے علمائے مبارکپور نے فرنگی محل کا فیض پایا۔

معقولات میں علمائے خیرآباد کا سلسلہ بھی یہاں خوب چلا اور اہل مبارکپور اس سے مستفید ہوئے۔ اس کے بانی مولانا فضل امام صاحب خیرآبادی ۱۲۴۳ھ ہیں جو دہلی کے صدر الصدور تھے۔ ان کے صاحبزادے مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی بحالت اسیری ۱۲۷۸ھ میں جزیرۂ انڈمان میں فوت ہوئے۔ ان کے تین شاگردوں سے اس سلسلے کو خوب فروغ ہوا۔ ان کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی ۱۳۱۶ھ اور مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری ۱۳۲۶ھ اور مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی اس کے ترجمان تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب مدرسۂ عالیہ رامپور میں زیادہ رہے اور مولانا ہدایت اللہ صاحب مدرسہ حنفیہ جونپور میں مدرّس ہوئے۔ مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری نے پہلے جونپور میں مولانا ہدایت اللہ خان صاحب سے ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد رسالہ مع غلام یحییٰ،

حاشیہ بحر العلوم اور بعض دوسری کتابیں پڑھیں۔ پھر مدرسہ عالیہ رامپور میں مولانا عبدالحق صاحب سے مسلم الثبوت مع شرح مولانا موصوف، حمد اللہ اور شمس بازغہ پڑھی۔ مولوی فقیر اللہ صاحب مبارکپوری نے مدرسہ حنفیہ میں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا محمد شعیب صاحب رسولپوری اور مولانا محمد طفیل صاحب املوی نے بھی مولانا عبدالحق صاحب سے تعلیم پائی تھی اور مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی نے مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی سے پڑھ کر اس فن میں یکتا و بے مثل ہوئے۔ مولانا شکر اللہ صاحب نے سیتاپور میں سلسلۂ خیرآباد کے معقولی عالم مولانا عبداللہ دانیال وغیرہ سے پڑھ کر ریاست مینڈھو میں مولانا ماجد علی صاحب جونپوری ۱۳۵۵ھ سے تعلیم پائی، جو معقولات میں مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ نیز انھوں نے الٰہ آباد میں مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی سے پڑھا، جو مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ہم کو علمائے خیرآباد کی تصانیف میں سے مرقات، شرح ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعیدیہ، الجواہر الغالیہ کی تعلیم دی ہے۔ علمائے رسولپور پر سلسلۂ فرنگی محلی اور سلسلۂ خیرآباد کا رنگ نمایاں رہا۔

ہمارے ضلع میں علمائے چریاکوٹ کا معقولی سلسلہ بھی خیرآباد سے کم نہیں تھا۔ اس گہوارے میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی، اسطرلاب، اکر، مرایا، مناظرہ کے ساتھ موسیقی، عربی ادب، عبرانی ادب اور اُردو ادب کی مدتوں رکھوالی ہوئی ہے اور نامی گرامی علماء پیدا ہوئے ہیں۔ آخری دور میں مولانا عنایت رسول چریاکوٹی ۱۳۲۰ھ اور ان کے بھائی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی ۱۳۲۷ھ اس خوانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا محمد فاروق صاحب کے مبارکپوری تلامذہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث، مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری، مولانا ظفر حسن صاحب عینی فاروقی، مولانا محمد شعیب صاحب رسولپوری، مولانا شاہ محمد صاحب سریانوی اور مولوی فقیر اللہ صاحب مبارکپوری قابل ذکر ہیں۔

ان مستقل علمی سلاسل کے علاوہ کچھ شخصی سلسلے بھی مبارکپور میں چلے جو آگے چل کر ولی اللّٰہی سلسلے میں مل گئے ہیں۔ مثلاً مولانا سخاوت علی جونپوری ۱۲۷۴ھ اور مولانا کرامت علی جونپوری ۱۲۹۰ھ دونوں حضرات مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا احمد علی چریا کوٹی کے شاگرد اور سید احمد شہید بریلوی سے بیعت تھے اور مولانا سخاوت علی جونپوری کے شاگرد مولانا حسام الدین مئوی ۱۳۱۰ھ تھے۔ جن سے حافظ عبدالرحیم صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث اور مولانا عبدالسلام نے پڑھا اور مولانا کرامت علی جونپوری مبارکپور میں بسلسلۂ تبلیغ وارشاد آتے تھے۔ مولانا محمد شکور مچھلی شہری ۱۳۰۰ھ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی سے فیوض حاصل کر کے معقولات میں مولانا فضل امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ ان کے بھتیجے مولانا قاضی شیخ محمد مچھلی شہری نے ان سے اور مولانا سخاوت علی جونپوری وغیرہ سے پڑھا تھا۔ مولانا شیخ محمد مچھلی شہری کا فیض مبارکپور میں یوں جاری ہوا کہ حافظ عبدالرحیم صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے ان سے حدیث میں سند مسلسل بالاولیہ حاصل کی۔ نیز مولانا محمد شکور صاحب کے تلامذہ میں مولانا قاضی محمد سلیم صاحب مچھلی شہری ۱۲۶۶ھ دارالقضا محمد آباد کے قاضی القضاۃ تھے اور مبارکپور میں ان کے نائبین ان کی رہنمائی میں دینی خدمات انجام دیتے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم کے ہاتھ کے فرامین راقم کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ ان کا انتقال اعظم گڑھ میں ہوا ہے۔

مولانا ظہورالحسن صاحب فاروقی رامپوری ۱۳۴۲ھ نے مولانا ارشاد حسین صاحب اور مولانا مفتی محمد سعد اللہ صاحب مرادآبادی ۱۲۹۴ھ سے پڑھا تھا جو کہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی، شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی اور مفتی صدرالدین صاحب دہلوی وغیرہ سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے اور مولانا حافظ وزیر احمد صاحب رامپوری نے مولانا شاہ محمد شاہ رامپوری تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا فضل امام خیرآبادی سے پڑھا تھا اور

ان دونوں حضرات سے مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری، مولانا محمد شعیب صاحب رسولپوری اور مولانا محمد طفیل صاحب املوی نے پڑھا۔ علمائے مبارکپور نے صرف ہندوستان کے علمی خانوادوں اور علمی شخصیتوں سے ہی اکتساب فضل وکمال نہیں کیا، بلکہ ان کے شیوخ واساتذہ میں علمائے عرب بھی ہیں، جن سے انھوں نے دینی علوم اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی سے حدیث پڑھی، جنھوں نے علامہ محمد شوکانی ۱۲۵۰ھ کے تلامذہ شیخ احمد بن محمد شوکانی، شیخ حسن بن عبدالباری الاہدل اور شیخ محمد ناصر الحازمی سے پڑھا تھا۔ مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری اور مولانا محمد شعیب صاحب رسولپوری نے شیخ محمد طیب عرب صاحب مکی سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان ہی کی نظر کیمیا اثر نے مولانا احمد حسین صاحب کو عربی زبان کا صاحب دیوان شاعر بنا دیا۔ ملا رحمت علی صاحب اسماعیلی نے سورت میں شیخ محمد علی بن شیخ فیض اللہ ہمدانی یمنی سے عربیت حاصل کی جو عربی کے اچھے اور زود گو شاعر تھے۔ موجودہ زمانے میں یہاں کے علماء نے جامعہ ازہر قاہرہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور نجف اشرف عراق کے عرب اساتذہ وشیوخ سے پڑھا ہے۔ جن میں حجازی، عراقی، شامی، مصری، افریقی وغیرہ شامل ہیں۔ قصبہ میں ان علمی سلسلوں کے علاوہ اثنا عشری اور اسماعیلی شیعوں کے بھی علمی سلاسل جاری تھے۔ نوابان اودھ کے دور میں یہاں بہت سے سنی خاندان شیعہ ہوئے اور ان کی تعلیم کے لیے خاص طور سے باہر سے علماء بھیجے گئے۔ چناں چہ چراغ علی شاہ پنجابی، سیف علی شاہ، رمضان علی شاہ، مولوی نثار علی سرائے میری، مولوی بشارت علی فیض آبادی، میر معظم حسین اس دور کے شیعی علماء ومدرسین ہیں، جنھوں نے اپنی تدریسی سرگرمی دکھائی۔ رمضان علی شاہ کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ نونہرہ ضلع غازیپور کے مولانا سید رمضان علی بن مولانا نجف علی ۱۲۷۴ھ ہیں، جنھوں نے اپنے والد اور دوسرے علماء سے پڑھا تھا۔ ان کے والد مولانا سید نجف علی غازیپوری نے لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل سے پڑھ کر مجتہد العصر سید دلدار علی

صاحب سے تکمیل کی تھی۔اس طبقہ میں اس زمانہ میں مولوی نزہو مبارکپوری تھے،جنھوں نے شاہ ابواسحاق لہراوی سے تعلیم حاصل کی تھی اور استاد وشاگرد میں گہرے روابط وتعلقات تھے۔بعد میں یہاں کے شیعی علماء نے ناظمیہ کالج لکھنؤ، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ، جوادیہ کالج بنارس، جامعہ سلطانیہ لکھنؤ وغیرہ کے اساتذہ سے پڑھا اور بعضوں نے نجف اشرف میں عراق کے شیوخ سے تحصیل وتکمیل کی۔

اسماعیلی بوہروں میں گزشتہ دور میں تین اہل علم تھے،مولوی نثار علی سرائے میری جنھوں نے اس مسلک کو قبول کرکے یہاں رائج کیا، دوسرے شیخ عبدالحکیم اور تیسرے ملا رحمت علی۔آخر الذکر نے ممبئی اور سورت میں اسماعیلی علماء واساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ جن میں بعض عرب علماء ومشائخ بھی تھے۔باشندگانِ مبارکپور کی ایک بڑی تعداد ۱۸۵۷ء کی جنگ،خشک سالی، بے روزگاری اور طاعون کے علاوہ مختلف وجوہات کی بنا پر ملک اور بیرون میں آباد ہوئی اور برہان پور، مالیگاؤں، دھولیہ، بھیمڑی، بمبئی، حیدرآباد، عدن، حجاز، ملائشیا، انڈونیشیا وغیرہ میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی ان میں بھی علماء فضلا، شعراء اور ادباء پیدا ہوئے۔جنھوں نے اپنے اپنے شہر اور ملک کے اساتذہ سے استفادہ کیا،مگر ان کے بارے میں ہماری معلومات نہایت ہی محدود ہیں۔

علمائے مبارک پور کے تصنیفی کارنامے

اس ضلع میں بہت سے مردم خیزہ قصبات ودیہات ہیں۔ مگرکسی ایک قصبہ میں اتنے زیادہ مصنف پیدانہیں ہوئے، جتنے کہ مبارکپوراورسوادمبارکپور میں گزرے ہیں اور اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے ضلع کا تصنیفی سرمایہ ایک پلے پر رکھا جائے اور علمائے مبارکپور کے تصنیفی کارنامے دوسرے پلے پر رکھے جائیں تو ان کا پلہ بھاری ہوجائے گا۔ یہاں کے علماء میں تدریس وتعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا خاص ذوق رہا ہے جودوسرے مقامات کے اہل علم سے ان کوممتاز کرتا ہے اور اس اعتبار سے ہم اس بستی کو بجاطور پر ''نیسا پور ہند'' کہہ سکتے ہیں۔ حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیرت، رجال، سوانح، ادب، زہدورقائق، طب، مناظرہ، ہیئت وغیرہ کے موضوعات پر یہاں کے مصنفوں نے عربی، فارسی، اُردواور گجراتی زبانوں میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی متعدد عربی تصانیف ہندوستان سے گزرکر پورے بلادعرب بلکہ عالم اسلام میں مقبول ہوئیں اوراہل علم اپنی تصانیف میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس وقت بھی مبارکپور میں ''صاحب تصانیف کثیرہ'' علماء وفضلاء موجود ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں کے علمائے اہل حدیث اورعلمائے رسولپورممتاز ہیں، جن میں تقریباً ہر عالم نے درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس فضیلت میں یہاں کے علماء باوقار مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں علم وتحقیق اور تلاش وتدقیق کی پوری روح پائی جاتی ہے۔ جولکھا اپنے علم وفن پر اعتماد کے ساتھ لکھا، صرف نقل واخذ پر اکتفاء نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں مستندعلوم ومعلومات کا خزانہ ہیں۔ خاص طور سے مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث، مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی

محمد حسن الاعظمی مبارکپوری ازہری اور قاضی اطہر مبارکپوری کی عربی تصانیف عرب ممالک اور عالم اسلام میں مقبولیت تامہ رکھتی ہیں۔ یہاں کی عربی تصانیف پر عرب ممالک کے علماء، ادباء اور شعراء نے شاندار تقریظیں اور قصائد لکھے ہیں اور عربی مجلّات وجرائد میں ان پر پُر مغز تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی نے ''تحفۃ الاحوذی'' پر علامہ سید محمود طرازی مدنی نے ''رجال السند والہند'' اور ''دیوان احمد'' پر اور حجاز کے مشہور محقق عالم الاستاذ عبدالقدوس انصاری مدیر مجلّہ المنہل جدہ اور شیخ محمد حسن علوی مالکی مکی نے ''العقد الثمین'' پر عربی زبان میں تقاریظ وقصائد لکھے ہیں اور عرب علماء ومصنّفین نے یہاں کی کتابوں سے اخذ واقتباس کیا ہے۔ متعدد شارحین احادیث ''تحفۃ الاحوذی'' اور ''مرعاۃ المفاتیح'' سے استفادہ کرتے ہیں۔ حال میں مصر کے ایک عالم شیخ عبدالوہاب عبداللطیف نے احادیث کا ایک مجموعہ بنام ''مختارات الاحادیث والحکم النبویہ'' شائع کیا ہے، اس کے ماخذ میں ''تحفۃ الاحوذی'' بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''وانفع شروح التی رجعت الیها تحفة الاحوذی للمبارك الفوری الهندی المتوفی ۱۳۵۳ھ''۔ (ص ۱۱)

اسی طرح مصر سے ایک کتاب ''الصلات القدیمة فی الهند والعرب'' شائع ہوئی ہے، جس کے ابتدائی ابواب ''رجال السند والہند'' سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ''تحفۃ الاحوذی'' کو مدینۂ منورہ کے ایک تاجر کتب نے دس جلدوں میں مصر میں طبع کرایا ہے اور بیروت کے تاجروں نے اس کا عکس لے کر چھاپا ہے۔ غالباً پورے ہندوستان میں یہ امتیاز یہاں کی کتاب کو حاصل ہے کہ اس کا عربی ترجمہ عرب مترجم نے کیا ہے۔ چناں چہ ''عرب وہند عہد رسالت میں'' نامی کتاب کا ترجمہ جامع ازہر کے ایک مصری فاضل ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزت نے کرکے اس کا نام ''الهند والعرب فی عهد الرسالة'' رکھا ہے جو الهیئة المصریه العامة للکُتّاب قاہرہ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح استاذ موصوف نے ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' نامی کتاب کا عربی ترجمہ

"حکومات العرب فی السند والھند" نام سے شائع کیا ہے۔ "سیرت البخاری" کا ترجمہ بھی عربی میں ہو رہا ہے۔ راقم کے بہت سے تاریخی مقالات کا عربی ترجمہ سرکاری رسالہ "ثقافۃ الہند" دہلی میں شائع ہوا ہے اور ایک مقالہ "من النارجیل الی النخیل" جدہ کے مشہور علمی و ادبی مجلّہ "المنہل" میں تین قسطوں میں شائع ہوا ہے اور بعض مقالات کے ترجمے انگریزی اور گجراتی زبانوں میں ہوئے اور انگریزی تصانیف میں ان کے حوالے دیے گئے۔ استاد محمد حسن الاعظمی مبارکپوری ازہری کی بہت سی عربی تصانیف قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوئی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت مصر نے جامع ازہر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر مشہور فاطمی حاکم امیر تمیم کا دیوان شائع کیا، جسے استاذ موصوف نے مرتب کیا ہے، پھر ۱۹۵۴ء میں مصر سے شائع ہوا۔ ان ہی کی جدوجہد سے شاہ فاروق کے دور میں جامع ازہر میں پہلی بار اُردو زبان کی تعلیم جاری ہوئی اور وہی اس کے پہلے معلم ہوئے۔

یہاں کے مصنّفین نے ایسے نادر اور اہم موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن پر لکھنے کی شدید ضرورت تھی۔ اسی لیے یہاں کی بہت سی کتابیں قبول عام و تام کے مرتبے کو پہنچیں۔ کہا جاتا ہے کہ امت کے ذمے امام ترمذی کا قرضہ تھا، جسے "تحفۃ الاحوذی" لکھ کر مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپوری نے ادا کیا۔ اُردو کیا عربی زبان میں بھی امام بخاری کی سیرت پر کوئی جامع کتاب نہیں تھی۔ مولانا عبدالسلام نے سیرتِ بخاری لکھ کر اس کمی کو پورا کیا۔ نیز انھوں نے صنعت و حرفت کے اچھوتے موضوع پر "تاریخ المنوال واہلہ" لکھ کر مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی تاریخ میں شاندار اضافہ کیا۔ شہادت اور اس کے اقسام پر اُردو زبان میں مولانا عبدالعلیم رسولپوری کی "کتاب الشہادت" ایک نادر چیز ہے۔ برزخ کے حالات میں مولانا احمد حسین رسولپوری نے "سبیل الآخرت" جیسی اہم کتاب تصنیف کی، جس کے متعدد اڈیشن ہندو پاک میں نکل چکے ہیں۔ مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی نے فلسفہ اور علم کلام میں "الافاضۃ القدسیہ" اور "نسیم الکلام" جیسی

اہم کتابیں لکھیں۔ مولانا عبیداللہ رحمانی نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح خاص انداز پر ''مرعاۃ المفاتیح'' لکھی ہے۔ استاذ محمد حسن ازہری نے اپنی سینکڑوں عربی واُردو تصانیف وتوالیف کے ذریعہ اسماعیلی مذہب کو ستر سے ظہور میں لا کھڑا کیا۔ ان کی سینکڑوں تصانیف میں ''المعجم الاعظم'' عربی اُردو لغت کی اہم ترین کتاب ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اسلامی ہند کی قدیم تاریخ پر عربی اور اُردو میں متعدد معیاری کتابیں لکھیں اور پچھلے تمام مورخوں کو بارِ قرض سے سبکدوش کیا۔ ملا محمد یونس شکیبؔ مبارکپوری نے اسماعیلی مذہب کی اہم اور بنیادی کتاب ''دعائم الاسلام'' کو پہلی بار عربی سے اُردو گجراتی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر مبارکپور کی تصانیف دنیا میں مقبول ہو کر متعدد بار طبع ہوئیں اور یہاں کی عربی کتابیں حجاز، مصر وشام اور بغداد کے مشہور کتب خانوں میں ملتی ہیں اور ان کی فہرستوں میں ان کے نام ملتے ہیں، بلکہ یورپ اور امریکہ تک جاتی ہیں۔

شعروادب

ان کے علاوہ یہاں کے بعض شعراء وادباء کے مختصر دواوین اور ادبی تصانیف ہیں۔ جیسے دیوان احمد (عربی) از مولانا احمد حسین رسولپوری، نعت محبوب از میاں صاحب عبداللہ شفا، قصائد نعتیہ از حافظ نظام الدین رضا، دیوان زماں، دیوان شہد پورام کیف[1]، نمود سحر از شرر مصباحی، صدرنگ از قمر الزماں مبارکپوری، اور "نورِ سرور" از مولانا محمد عثمان ساحر، نیز اُردو جرائد ومجلّات میں یہاں کے شعراء وادبا اور علماء کے اشعار ومقالات شائع ہوتے ہیں۔ یہ قصبہ شعروادب کا گہوارہ بھی رہا ہے اور یہاں ہر دور میں اچھے اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں کی اُردو شاعری میں منشی حبیب اللہ حبیب، حافظ نظام الدین رضا، مولوی غلام عباس وغیرہ قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربی شاعری میں مولانا احمد حسین رسولپوری مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی اور ملا رحمت علی کے نام نمایاں ہیں۔ اس موقع پر ہم یہاں سے شائع ہونے والی ادبی کتاب "صدرنگ" کے مقدمے سے یہاں کی ادبی وشعری تاریخ درج کرتے ہیں:

یہ قصبہ ہمیشہ سے عربی علوم وفنون کا مرکز رہا ہے اور تشنگان علوم مشرقیہ زمزمِ علم سے سیراب ہونے کے لیے ہر سال یہاں ملک کے ہر ہر گوشے سے جوق در جوق آتے ہیں۔ یہاں کے چار مدارس اسلامیہ دارالعلوم اشرفیہ، احیاء العلوم، دارالتعلیم اور باب العلم مخصوص ومرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور مبارکپور کی معاشرت کے یہی عناصر اربعہ بھی ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے نظریات وعقائد از دمِ پیدائش تا وقتِ مرگ ان ہی چاروں محوروں کے گرد رقص کرتے رہتے ہیں۔ ان مدارس عربیہ کے علاوہ جس نے مبارکپور کی شہرت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے، وہ ہے یہاں کی مشہور صنعت پارچہ بافی۔

---

[1] کیفیات کیف۔

اس سرزمین پر سانس لینے والے ہزاروں انسان ایسی زرتار ردائیں بنتے ہیں کہ سبک اندام حسینانِ ہند کے شانوں کو تارِ حریری کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہونے پاتا۔ فنکارانِ مبارکپور کے ہاتھوں کی بنی ہوئی بنارسی ریشمی ساڑیوں کا رنگ، چمک دمک، یکسانیت، ہمواری اور تناسب کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے کسی بنکر کے کھردرے ہاتھوں نے بُنا ہے، بلکہ وہ یہ سوچے گا کہ اس پارچۂ دل فریب کی لطافت یقیناً کسی الف لیلوی شاہزادی کی نرم ونازک انگلیوں کے لمس کی ہی رہینِ منت ہوسکتی ہے۔

اس مبارکپور نے جو علماء وفضلاء کا دینی مرکز، فنکاروں کا مولد اور اہلِ علم حضرات کی آماجگاہ ہے، خوش فکر وپرگو شعراء کے تین دور بھی دیکھے ہیں۔ دورِ اوّل ۱۸۶۴ء سے ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ ہے۔ اس مدت میں منشی حبیب اللہ حبیبؔ، عبداللہ شفا، قمرالزماں زماںؔ، عبدالکریم عاشق نمایاں رہے ہیں۔ دوسرا دور ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۴۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے ممتاز ترین شعراء میں قاضی اطہر مبارکپوری، تبسم مبارکپوری، محمد حنیف رہبرؔ، مظفر حسن ظفر ادیبی، محمد عثمان ساحرؔ، فقیراللہ اسعد سیمابی، منشی سہدیو رام کیفؔ اور ایوبؔ مبارکپوری ہیں۔ یہ دور مشاعروں، ادبی جلسوں اور نشستوں کے لیے زیادہ خوش گوار ثابت ہوا۔ دورِ اوّل کے مقابلے میں اس دور میں مشاعرے بھی زیادہ ہوئے اور سخن فہموں کی تعداد بھی بڑھی۔ تیسرا دور بڑے شدومد، جوش وخروش اور نہایت عزم وحوصلہ کے ساتھ ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔[1]

---

[1] صدرنگ ملخص از صفحات ۱۶۔۱۷۔۱۸۔۱۹۔۲۰۔

علمائے مبارک پور کی عالمی شہرت

سلاطین شرقیہ جونپور کے دورِ سلطنت ۷۹۶ھ تا ۸۸۳ھ میں دیارِ پورب کے ہر شہر وقریہ کی طرح یہ مقام بھی علماء فضلاء کا مسکن تھا اور اس دَورِ پر بہار میں یہ قصبہ خزاں رسیدہ نہیں تھا، بلکہ قاسم آباد کے نام سے علم وفضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد حدود ۹۵۰ھ میں مبارکپور کے نام سے معدن علم وفضل ہوا، مگر جیسا کہ اعظم گڑھ گزیٹیر کے مصنف نے لکھا ہے، اس قصبہ کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں اور مسلمان مورّخوں نے یہاں کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی ہے[1]

اس لیے قاسم آباد کی طرح مبارکپور کے اربابِ فضل وکمال کے حالات بھی پردۂ خفا میں رہے۔ جب کہ اس سے متصل چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اہل علم وفن کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں، بلکہ ان میں سے کئی لوگوں کو شخصیت سازی سے کام لے کر افسانہ بنا دیا گیا ہے اور ان کے تذکرہ نویسوں کے قلم نے بے پناہ رنگ آمیزی کی ہے۔ چریاکوٹ کے عباسی فضلاء، بھیرا کے فاروقی مشائخ، محمد آباد کے سادات وشیوخ، گھوسی کے عثمانی اہل علم وفضل، سگڑی کے سبز پوش اربابِ کمال کے تذکرے قدیم وجدید تذکرہ نویسوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، مگر ان ہی حدود میں واقع مبارکپور کے کسی عالم کا تذکرہ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ مذکورہ بالا شیوخ وشرفاء کے مبارکپوری خدام وتلامذہ کے نام بھی نہیں ملتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی کے مقدمے میں پورب کے مردم خیز قصبات کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا شیوخ وسادات اور علماء ومشائخ کا تذکرہ نسبتہً تفصیل سے کیا ہے اور یہاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''مبارکپور بڑا قصبہ ہے، جو پرانے زمانے سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانے میں

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر۔ ص:۱۶۰۔

چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں'' [1] اس پارچہ بافی کے پرانے مرکز اور اس کے حدود میں پیرزادہ محمد ماہ املوی، شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری، شیخ عبدالرشید فاروقی، شیخ محمد مصطفیٰ صدیقی وغیرہ کے خانوادے قدیم زمانے سے آباد ہیں اور ان میں بھی اربابِ فضل وکمال گزرے ہیں۔ مگر ان کے تذکرے بھی ہمارے تذکرہ نویسوں کی طبقہ واریت کی نذر ہوگئے۔ یہ حضرات تو شیوخ وسادات میں سے تھے، پارچہ باف نہ تھے۔ اس کے علاوہ مبارکپور اور اس کے ملحقات وسواد میں تیموری دور کے بہت سے مشہور شہید واڑے اور بزرگوں کے مزارات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان یادگاروں سے ممتاز شخصیتوں کا تعلق ہے اور یہ علماء ومشائخ کی قبریں ہیں مگر ان بزرگوں کے تذکرے بھی نہیں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں غیروں کے شکوے سے پہلے اپنوں سے گلہ ہے کہ خود یہاں کے کسی صاحب علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی کی کوشش کی۔ البتہ ''تذکرۂ علمائے حال'' میں یہاں کے چار عالم، ''نزہۃ الخواطر'' میں دو اور ''تراجم علمائے اہل حدیث'' میں کئی علماء کا تذکرہ ہے اور ان کے مصنّفین ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

علمائے مبارکپور کی طرف سے بے اعتنائی کے علی الرغم آخری دور میں ان کی علمی سرگرمیوں اور تصانیف نے مبارکپور کو عالم اسلام میں باوقار علمی ودینی مقام بخشا اور وہ ہندستان کے مشہور مردم خیز قصبات میں اہم مقام کا مالک بنا۔ سب سے پہلے اعظم گڑھ گزیٹر کے انگریز مصنف مسٹر ڈی ایل ڈرک بروکمان نے انگریزی زبان میں مبارکپور کے عنوان سے اس قصبے کا تفصیلی تذکرہ کرکے اس کی تاریخ، باشندوں کے حالات، معاش ومعیشت، صنعت وحرفت، حوادث وفتن اور سرکاری معاملات سے متعلق باتیں بیان کیں۔ انگریز قوم کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس کے اہلِ علم جس موضوع پر لکھتے ہیں نہایت باریک بینی اور تحقیق سے کام لیتے ہیں۔ گزیٹر کے صفحات ۱۶۰، ۱۶۱ اور ۱۶۲ پر مبارکپور کا مستقل ذکر موجود ہے۔ نیز جابجا ضمنی طور سے اس کا ذکر ہے۔

---

[1] حیات شبلی۔ ص: ۵۷۔

اس کے بعد مولوی علی حسن بن غلام مرتضیٰ فاروقی نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' کے نام سے اُردو میں ایک مفصل کتاب لکھی۔ جس میں نواب سعادت علی خاں کے زمانے سے لے کر ۱۳۰۲ھ تک تقریباً ایک سو سال کے حوادث وفتن اور اہم واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں شیعہ سنی جھگڑے، ہندو مسلم فسادات، ڈاکہ، قتل وغارت کے واقعات اور ۱۸۵۷ء میں یہاں کے حالات کی تفصیل درج ہے۔ نیز باہمی فتنہ وفساد اور جامع مسجد راجہ صاحب کی تعمیر وتوسیع کی تاریخ کا بیان ہے۔ ضلع کی کسی چھوٹی بڑی آبادی کے بارے میں اس طرح کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس میں یہاں کے کئی اہل علم وفضل اور اربابِ فن کے تذکرے اور دینی وعلمی حالات بھی موجود ہیں۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ جو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، راقم کے پاس محفوظ ہے اور بڑے سائز کے ۹۰ر صفحات میں ہے۔

استاذ محمد حسن ازہری نے اپنی عربی کتاب ''فتی الهند وقصة باكستان'' مطبوعہ قاہرہ میں اپنی طالب علمی کے حالات لکھتے ہوئے مبارکپور کا پورا حال لکھا ہے۔ یہاں کی تعلیمی سرگرمیوں، مذہبی جلسوں، جلوسوں، کھیل کود، صنعت وحرفت کے ساتھ جغرافیائی اور طبعی، تجارتی، تمدنی اور معاشرتی حالات شرح وبسط سے درج کیے ہیں اور صفحہ ۴ر سے صفحہ ۲۸ر تک یہاں کے بارے میں اہم معلومات دی ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن محدث نے ''تحفۃ الاحوذی'' جلد اوّل میں مبارکپور کے محل وقوع اور اس کے حدود اربعہ کا ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام نے ''تاریخ المنوال واہلہ'' جلد دوم کے صفحہ ۵۱ر اور ۵۲ر پر یہاں کا مستقل ومفصل حال لکھا ہے۔ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے ''ہندوستان کی تعلیم گاہوں'' میں مبارکپور کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۴۳) راقم نے اپنی کتاب ''العقد الثمین'' کے مقدمہ میں قصبہ کی مختصر تاریخ اور چند مشہور اہل علم کے نام درج کیے ہیں۔ نیز عرب ممالک کے مشہور شعراء نے یہاں کے علمی کارناموں اور اہل علم کی خدمات کو دیکھ کر مبارکپور کو مهد العلم بتایا ہے۔ علامہ سید محمود طرازی مدنی نے

''رجال السند والہند'' پر منظوم تقریظ لکھتے ہوئے کہا ہے:

بَقِيَتُ مباركپور بالعلم غضةً ‏ ‏ ‏ فضائك بالانوار دوما منورُ

فانك مهد العلم كل فَتُرةٍ ‏ ‏ ‏ فقيهٌ جليلٌ من فنائك يظهر

وان لم يكن الا المؤلف وحده ‏ ‏ ‏ كفاك وهذا منةٌ ليس تنكر

اور موصوف نے مولانا احمد حسین رسولپوری کے عربی دیوان پر تقریظ لکھتے ہوئے کہا ہے:

لاحمد حسين الحبر درة عصره ‏ ‏ ‏ اديب مباركپور سابق الاقران

اور مولانا عبدالرحمٰن محدث کی کتاب تحفۃ الاحوذی پر شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی نے طویل نظم میں کہا ہے:

وغدا سراجاً للهداية فى مبا ‏ ‏ ‏ رك پور، بل فى سائر البلدان

اب ہم یہاں کے علماء وفضلاء اور مشائخ کے حالات شروع کرتے ہیں۔ ان کے ذکر میں ترتیب زمانی کا خیال رکھا گیا ہے۔

ملک شدنی و دیگر شہداء

ہماری تحقیق میں ملک شدنی رحمۃ اللہ علیہ یہاں کے قدیم ترین بزرگوں میں سے ہیں، جو پانچویں صدی میں سالار مسعود غازیؒ[1] کے زمانے میں بسلسلۂ جہاد شہید ہوئے۔ آپ کو ملک صغانی بھی کہتے ہیں، ملک شدنی درحقیقت ملک صغانی کی بگڑی ہوئی صوتی شکل ہے۔ یہ بزرگ علاقہ ماوراء النہر (ولایت بالا) کے صوبہ ترمذ کے مشہور شہر صغانیان (چغانیان) کے رہنے والے تھے۔ مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے بھی ''تاریخ المنوال واہلہ'' میں اسی کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ ملک شدنی کا مزار مبارکپور سے متصل ہے۔ غالباً یہ اسی طرف بھیجے گئے تھے اور ان کے ساتھی یہاں آباد ہوئے۔[2]

آپ کا مزار مبارکپور کے شمال مشرق میں چند فرلانگ پر سریاں نامی بستی سے متصل شمال میں ایک پر فضا باغ میں تالاب کے پاس واقع ہے اور اسی سے متصل مغرب میں ملک شدنی نامی موضع آباد ہے۔ روضہ کا خطیرہ منہدم ہوکر چاروں طرف ڈھیر ہوگیا ہے اور درمیان میں کچی قبر ٹیلہ نما موجود ہے۔ مزار کے سرہانے قدیم زمانے کا ایک جنگلی درخت ہے، جس کی شناخت نہیں ہوتی ہے۔ چبوترہ پر مغربی جانب تین چار قبروں کے نشان ہیں، چبوترہ کی لمبائی چوڑائی ۵۴/۵۴ ہاتھ ہے۔ اطراف میں گری پڑی پکی اینٹیں راج بھر دور کے ساخت کی موٹی اور بھدی ہیں۔ جن سے روضہ کی عمارت کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس درگاہ اور روضہ کی حفاظت کے لیے شاہی زمانے میں معافی کی کچھ زمین تھی، نئے بندوبست میں بھی بارہ بیگہ زمین اس کے حدود میں چھوڑی گئی ہے۔ یہاں ہر سال ۲۶ رجب کو عرس ہوتا ہے جسے عوام ملک شدنی یا ملک بابا کی درگاہ

---

[1] سالار مسعود غازی کی شہادت ۴۸۸ھ میں ہوئی۔ ملک شدنی کا وصال بھی ان ہی حدود میں ہوا ہوگا۔

[2] تاریخ المنوال۔ ص:۸۱۔ ج:۲۔ مطبوعہ پٹنہ۔

کہتے ہیں۔ یہ علاقہ قدیم زمانے میں راج بھر قوم کا مرکز تھا۔ اس کی خوشحالی کی علامتیں اب تک پائی جاتی ہیں۔ غالبًا اسی مقام پر ملک شدنی کی شہادت ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہاں جنات کی بہت بڑی آبادی ہے اور اس سلسلے میں عوام وخواص میں بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ملک شدنی کے مزار سے متصل قبروں کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ کن کی ہیں۔ ملک شدنی کے علاوہ اس دور کے کئی حضرات کے مزارات ان اطراف میں بتائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سالار مسعود کے رفقاء کا حال تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور اسی ضمن میں ان بزرگوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے، جو بسلسلۂ جہاد ان اطراف میں آئے تھے۔

قدیم پرانوں سے پتہ چلتا ہے کہ کاشی راج (بنارس) اور کوشل راج (اجودھیا) کے درمیان تمسا (ٹونس) ندی سرحد تھی اور اس زمانے میں موجودہ ضلع اعظم گڑھ گھنے جنگلوں پر مشتمل تھا، جو تارک الدنیا فقیروں اور سنیاسیوں کے لیے تپّسو بھوم (عبادت گاہ) کا کام دیتا تھا اور یہاں پر سادھو، سنت تپسیا اور ریاضت کیا کرتے تھے۔ دریائے ٹونس کے کنارے دُرباسا، دتّہ تری اور دیول مہاراج کے آشرم تھے۔ آج بھی مبارکپور کے مغرب میں دُرباسا، دتّہ تری اور مشرق میں دیولاش ان رشیوں اور سنیاسیوں کی یاد تازہ کررہے ہیں اور ان مقامات پر ہندوؤں کے مذہبی میلے اور اشنان ہوتے ہیں۔

سادھوؤں اور سنتوں کی اس روحانی سرزمین پر آفتاب اسلام کی ضیا پاشی کب ہوئی؟ اور اس ظلمت کدے میں اسلام کا نور کس زمانے میں پھیلا؟ اس کی تعیین مشکل ہے۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ پانچویں صدی کی ابتدا میں ہی یہ علاقہ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کے زمانے میں اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ خاص طور پر بنارس کی فتوحات نے ان اطراف میں بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے بعد حضرت مسعود غازی اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس علاقے میں اسلام اور مسلمانوں کا شہرہ ہوا۔ سالار مسعود غازی (ولادت ۴۰۵ھ، ۴۲۸ھ) نے دہلی فتح کرنے کے بعد اودھ میں ستر کھ

ضلع بارہ بنکی کو مرکز بنا کر، قنوج کڑا مانک پور اور بہرائچ، بنارس وغیرہ میں جہاد کرایا۔ اسی دوران میں ان کے رفقاء موجودہ ضلع اعظم گڑھ کے علاقوں میں بھی آئے۔ صاحب مرأۃ الاسرار نے تصریح کی ہے:

''وبعد ازاں ملک افضل را با اقربائے او بطرف بنارس ونواحی آں رخصت نمود وآستانۂ او با دیگر شہداء آنجا شہرت دارد وبعد ازاں ملک عمر وملک طغرل را با اصحاب ایشاں بطرف پرگنات بیسوارہ تعین کرد۔ درآں نواحی تردد نمایاں کردہ بشرف شہادت فائز گشتند، چناں چہ مقابر ملک شہید وطغرل شہید وغیرہ در قصبہ بحلو رونواحی آں زیارت گاہ خلق است وملک عمر شہید مذکور بغایت مردانہ خفتہ است وتصرفے راحت دارد وہمیں در ہر شہرے ودر ہر قصبہ ملک وبہر دیہے مردم اہل اصلاح وصاحب شجاعت کارواں جابجا نصب نمودہ۔

سالار مسعود نے ملک افضل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بنارس اور اس کے نواحی میں بھیجا جن کا روضہ دوسرے شہداء کے ساتھ ان اطراف میں مشہور ہے۔ اس کے بعد ملک عمر اور ملک طغرل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بیسواڑہ کے پرگنوں میں متعین کیا۔ یہ حضرات ان علاقوں میں سرگرمی دکھا کر شہید ہوگئے۔ چناں چہ ملک عمر اور ملک طغرل وغیرہ کی قبریں مقام بحلور اور اطراف میں زیارت گاہ ہیں۔ ملک عمر نہایت بہادرانہ شان سے آسودۂ خواب ہیں اور اُن کے اثرات ظاہر ہیں۔ اسی طرح سالار مسعود نے ہر شہر اور ہر قصبہ میں ملک حضرات میں سے مصلحوں اور بہادروں کو جابجا متعین کیا۔

چناں چہ دریں ملک	چناں چہ میں ان علاقوں میں
ہر جا رسیدہ ام اثرے	جہاں گیا ہوں، ان بزرگوں
از اصحاب الشہداء یافتہ	کے آثار دیکھے ہیں اور ہر
ام وہمہ جا زیارت گاہِ	جگہ ان کی زیارت گاہیں
خلق است'' [۱]	موجود ہیں۔

یہاں پرگنات بیسواڑہ سے مراد گنگا اور گھاگرا کے درمیانی علاقے ہیں۔ مسٹر ٹی. ڈبلیو ٹالبورٹ نے اپنی کتاب خلاصہ حال اقوام ہند میں لکھا ہے کہ درمیان گنگا وگھاگرا کے راجپوت بکثرت ہیں۔ اس طرف بینسواڑہ (بھینسواڑہ) یعنی ملک گوت بینس واقع ہے۔ بلکہ اس تمام گردونواح میں نشان ظاہر ہے کہ ایام سابقہ میں ملکیت اعلیٰ راجپوتوں کی تھی۔ اعظم گڑھ، غازیپور اور سون کے دوآبہ میں یہی ہیں جہاں سے سپاہی جو بھوجپوریہ کہلاتے تھے، فوج میں آئے [۲] تحصیل گھوسی میں آج بھی ایک بستی بھینسواڑہ کے نام سے مشہور ہے۔ اعظم گڑھ گزیٹیر میں ہے کہ سالار مسعود غازی بہرائچ جاتے ہوئے چند دنوں تک بھگت پور میں رکے تھے [۳] خلاصۂ تاریخ مسعود میں ہے کہ آپ ۴۳۰ھ میں ستر کھ آئے۔ تمام ملک ہند میں کوئی شہر وقصبہ وگاؤں نہیں کہ آپ کے ساتھ کا شہید نہ ہو۔ تمام ملک ہند میں غازیان اسلام منتشر تھے۔ ہر جگہ کو نورِ شہادت سے منور کیا۔ اسی وقت سے ہندوستان میں اسلام ہوا [۴] غزانامۂ مسعود میں ہے کہ جس جس ملک میں حضرت کے نمک خوار تھے، بڑے بڑے سردار تھے۔ بعد آپ کے سب نے شہادت پائی۔ اسلام کی بیخ جمائی، ہر شہر و دیار میں ایک نہ ایک شہید لشکر سالار مسعود ہے، قبر اس کی

---

[۱] مرأۃ الاسرار قلمی جلد اوّل ذکر سلطان الشہداء امیر مسعود۔

[۲] خلاصۂ حال اقوام ہند۔ ص: ۵۱۔۵۲۔ مطبوعہ مطبع جیل ڈیرہ اسماعیل خاں ۱۸۷۰ء۔

[۳] اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء۔

[۴] خلاصۂ تاریخ مسعودی۔ ص: ۷۔ از مولوی محمد صادق مطبوعہ غالب الاخیار ۱۲۸۸ھ۔

موجود ہے، کوئی مقام خالی نہیں ہے، کل زیر نگیں ہے[۱] اور آئینۂ اودھ میں ہے کہ کسی تاریخ میں سوا لڑائی کڑا مانک پور کے اور کوئی لڑائی سید مسعود کی درج نہیں ہے۔ لیکن اکثر قبر گنج شہیدان دیہات وقصبات متعلقہ اضلاع رائے بریلی، سلطانپور، فیض آباد، پرتاپ گڑھ، اعظم گڑھ، جونپور، بنارس وغازیپور میں برابر پائی جاتی ہیں اور جہاں جہاں قبریں ہیں باوجود اس قدر تمادیِ ایام کے عام طور پر بلا کسی اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں مجاہدی غازی میاں ہوا ہے اور یہ ان ہی کے ساتھی کی قبریں ہیں..... ناظرین کتاب کو خیال ہے کہ ممالک مغربی وشمالی اودھ میں جہاں مقابر شہیدان ہمراہیان غازی میاں کہا جائے اس کو باور کرنے میں تامل نہ کیا جائے[۲] اور مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری نے تاریخ المنوال میں معتبر حوالے سے لکھا ہے کہ بزمانۂ سید سالار مسعود غازی ملک افضل بغرض فتح بنارس وملک علوی نائب ان کے وملک طاہر بمقام مئو وملک مردان بمقام شادی آباد غازیپور آئے تھے، مزارات ان کے ان مقامات پر ہیں۔ ستر کھ (ملک اودھ) سے ملک حاجی بمقام ٹانڈہ متعین ہوئے تھے۔ مسعود غازی ستر کھ سے پورب نہیں آئے اور حاشیے میں لکھا ہے کہ ملک شدنی کا مزار مبارکپور سے متصل ہے۔ غالباً اس طرف بھیجے گئے اور ان کے ساتھی یہاں آباد ہوئے[۳]

چوں کہ سالار غازی اور ان کے رفقاء کی یہ فتوحات ان اطراف میں بالکل ابتدائی دور میں تھیں اور ان حضرات کی شہادت کے بعد ایک زمانے تک مسلمانوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے ان کے کارناموں کی تفصیلات اور شہداء وغیرہ کے حالات صحیح طور سے مرتب نہ ہو سکے۔ اس لیے یہی روایات سب کچھ ہیں۔

ملک شدنی کے مزار کے علاوہ مبارکپور کے اطراف میں کئی مزارات ایسے ہیں

---

[۱] غزانامہ مسعود۔ ص: ۶۷۔ از مولوی عنایت حسین مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۷ھ۔

[۲] خلاصۂ تواریخ مسعودی۔ ص: ۷۔ از مولوی محمد صادق۔ مطبوع غالب الاخیار ۱۲۸۸ھ۔

[۳] تاریخ المنوال۔ ص: ۸۱۔

جن کے بارے میں ظن غالب ہے کہ وہ سالار مسعود غازی کے ہمراہیوں کے ہیں۔
چناں چہ قصبہ کے جنوب میں سمودی تالاب کے پاس ایک مجہول اور قدیم قبر ہے۔
یہ ''نوگزے پیر'' کے نام سے مشہور ہے۔ جس پر بعد میں لمبا چوڑا چبوترہ مشرق ومغرب
رخ بنا دیا گیا ہے۔ ایسی مجہول قبریں آس پاس کے دیگر علاقوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور
ان کو عام روایات میں سید سالار مسعود غازی کے رفقاء سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ چناں چہ
آئینۂ اودھ میں ہے کہ سیلون ضلع رائے بریلی میں ایک درگاہ موسوم پیران پروٹھ ہے۔
ایک احاطہ میں بڑا سا چبوترہ ہے، جس کا طول وعرض بیس فٹ اور بلندی بارہ فٹ ہے۔
اس کے درمیان دو قبریں ہیں، جن کا سر پچھم طرف اور پیر پورب طرف ہے۔ ان کے
بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شہید لڑتے ہوئے یہاں آکر گرے اس لیے اسی
مقام پر مدفون ہوئے۔ بعد میں لوگوں نے قبر کو شمالاً جنوباً بنایا، مگر آہستہ آہستہ رخ پورب
پچھم ہو گیا۔ واللہ اعلم، نہیں معلوم کہاں تک اس کی صحت ہے۔ اسی طرح بہت سے
مقامات پر گنج شہیدان ہیں[1] مبارکپور کے نوگزے پیر کی قبر اور چبوترے کی ساخت
تقریباً اسی قسم کی ہے۔ ہمارے بچپن میں راج بھر دور کی موٹی اور بھدی اینٹیں تھیں۔
اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ بہر حال یہ
کسی بزرگ کا مزار ہے۔

قصبہ کے مشرق میں چند فرلانگ پر اساور نامی بستی ہے۔ اس میں اسی طرح کے
دو مزارات ہیں۔ ایک کو مقامی زبان میں سیکھندی شہید (شیخ ہندی شہید) اور دوسری کو
امر شے شہید (عمر شیخ شہید) کہتے ہیں۔ یہ روضے شکستہ حال میں وہاں کے تکیہ میں ہیں۔
ہوسکتا ہے کہ یہ ملک طغرل کے مزارات ہوں، جن کو سالار مسعود غازی نے پرگنات
بیسواڑہ میں جہاد کے لیے مقرر کیا تھا۔ جیسا کہ ''مرآۃ الاسرار'' کی تصریح گزر چکی ہے اور
معلوم ہو چکا ہے کہ علاقہ گنگا اور گھاگرا کا دوآبہ ہے۔ بہر حال اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں

---

[1] آئینۂ اودھ۔ ص: ۳۶ د ص: ۳۷۔

قبریں بھی اسی دور کے غازیوں اور مجاہدوں کی ہیں۔ مشہور ہے کہ قصبہ کے اطراف میں سات شہید ہیں۔ ان میں ''شہید مرد'' بہت مشہور ہیں۔ جن کا پختہ مزار قصبہ کے جنوب میں اوسر میں ہے اور اس پر نیم کا درخت ہے۔ ان کے علاوہ کئی شہید واڑے، کھیتوں، میدانوں اور جھاڑیوں میں ہیں، مگر ان کی تاریخ بالکل مجہول ہے۔ گزیٹر میں ہے کہ ضلع میں بہت سے شہید واڑے ہیں، یہ وہ جگہیں ہیں جہاں مجاہدین شہید ہوئے اور دفن کیے گئے، مگر لوگ ان کے واقعات بھول گئے۔ حتیٰ کہ اب نہ ان کے نام معلوم ہیں اور نہ ہی شہادت کی وجہ معلوم ہے[1]

---

[1] اعظم گڑھ ۱۹۱۱ء۔ ص: ۱۵۷۔

راجہ سید مبارک مانک پوری بانیِ مبارک پور

حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ بن راجہ اعز الدین بن شہاب الدین ثنیٰ بن حسام الدین بن شہاب الدین بن زین الدین بن امام محمد الباقر بن امام جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہم بانی مبارکپور ہیں۔ سلسلۂ نسب میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کے آباء واجداد واولاد واحفاد کے حالات عام طور سے کتابوں میں ملتے ہیں مگر خود راجہ سید مبارک کا حال تلاش بسیار کے باوجود صرف ''گنج ارشدی'' میں مل سکا ہے۔ سید شمس الدین اور سید شہاب الدین دو بھائی تھے۔ جو سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے دور میں ترکستان کے شہر گردیز سے جو نواح غزنی میں ہے دہلی آئے۔ پھر سید شہاب الدین نے دہلی سے نکل کر مانک پور میں سکونت اختیار کی جو اس زمانے میں سلطنت دہلی کا مشرقی مرکز تھا۔ راجہ سید مبارک کے آباء واجداد میں حضرت راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے شاہان شرقیہ کے دور میں جونپور تشریف لائے۔ اس وقت سے اس خانوادہ کا علمی ودینی اور روحانی تعلق دیارِ پورب سے ہوا۔ وہ حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ ان کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی ۹۲۱ھ بھی صاحب کشف وکرامات چشتی بزرگ تھے۔ ان کے دولڑکے تھے، راجہ سید احمد اور راجہ سید محمد۔ راجہ سید مبارک راجہ سید احمد کے صاحبزادے ہیں۔ ''گنج ارشدی'' میں آپ کا تذکرہ ان القاب سے شروع ہوتا ہے:

''وصل درذکر قدوۂ اہل اللہ وپیشوائے عرفاء اللہ تعالیٰ وتبارک سید مبارک قدس سرہٗ العزیز است''۔ بعض تذکرہ نگاروں نے راجہ سید مبارک مانک پوری کو راجہ سید نور کا فرزند بتایا ہے، حالاں کہ وہ آپ کے دادا تھے۔ جیسا کہ ''بحر زخار'' قلمی میں وجیہ الدین اشرف آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موج احوال آن روح روانِ رہرواں، آن رہنمائے پیران، آن برگزیدۂ اللہ تبارک، ولیِ کامل حضرت راجہ سید مبارک خلف وخلیفۂ راجہ سید نور راست۔ از اعظم اولیاء صاحب کرامت واکابر عاشقان، در تصوف وعشق مرتبۂ بلند داشت، کرامتش ازیں جاقیاس باید کرد کہ پسرش سید مجتبیٰ دوازدہ سالہ بود کہ آن حضرت وقت شب وفات نمود، صبح دایۂ سید مجتبیٰ در عین نوحہ وزاری برزباں آورد کہ مجتبیٰ راہنوز تلقین نہ کردہ بود وخود ازین جہاں انتقال فرمود، برخور این کلمہ آں حضرت زندہ شد، برخاست وفرمود مجتبیٰ را تلقین نمودہ ازین عالم خواہم رفت۔ پس پنج سال دیگر درین عالم ماندہ از سائر اکتساب وامانات

اہل سلوک کے روح رواں، پیروں کے رہنما، برگزیدۂ حق تعالیٰ، ولی کامل حضرت راجہ سید مبارک، حضرت راجہ سید نور کے فرزند وخلیفہ تھے۔ راجہ سید مبارک اولیائے عظام اور صاحب کرامت عاشقان کبار میں بلند مرتبے کے مالک تھے۔ ان کی کرامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان کے بیٹے سید مجتبیٰ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو راجہ سید مبارک رات میں وفات پا گئے۔ صبح کے وقت عین نوحہ وزاری کی حالت میں سید مجتبیٰ کی دایہ کی زبان سے نکل گیا کہ ابھی سید مجتبیٰ کی پوری تعلیم وتلقین نہیں ہوئی اور راجہ سید مبارک اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ یہ سنتے ہی راجہ سید مبارک زندہ ہو کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ مجتبیٰ کی تعلیم وتلقین کے بعد ہی اس دنیا سے جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ پانچ برس تک زندہ رہے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے تمام باطنی فیوض وبرکات

اجدادِ پیران سید مجتبیٰ
را بہرہ ورو تلقین نمودہ،
فرمودہ حالا احتیاجِ صحبت
بہ تو باقی نماندہ پس ازین
عالم بملأ اعلیٰ شتافت
وکیفیت احوال سید مجتبیٰ را
نیز ازین قصہ باید فہمید کہ
برائے تربیت او حق سبحانہٗ
وتعالیٰ پدرش را از ممات
بحیات آورد''۔
(بحرزخار قلمی ص:۳۷۵۔مصنف
مولوی وجیہ الدین اشرف)

اور روحانی امانتوں سے سید مجتبیٰ کو
بہرہ مند کیا اور تصوف کی تعلیم
وتربیت دینے کے بعد سید مجتبیٰ سے
فرمایا کہ اب تمھاری صحبت وتربیت
کی ضرورت پوری ہوگئی۔ پس سید
راجہ مبارک اس جہان سے ملائے
اعلیٰ کی طرف دوڑ پڑے۔اس واقعہ
سے سید مجتبیٰ کی کیفیت احوال کو بھی
سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی
تربیت کے لیے ان کے پدر بزرگوار
سید راجہ مبارک کو موت کے بعد
دوبارہ زندگی دی۔ (قمر)

غالبًا بے ہوشی اور سکتہ کو موت سے تعبیر کیا ہے۔اُردو میں محاورہ ہے کہ مرکر زندہ ہوا ہے یا مرکر بچا ہے۔

شیخ غلام عباس نے غزانامہ مسعود میں اور سید محمد صادق نے خلاصۂ تواریخ مسعودی میں لکھا ہے کہ:

''قطب الوقت حضرت راجے سید نور مانک پوری کے فرزند نہیں ہوتا تھا۔آپ کی بی بی نے نیت کی کہ اگر حق تعالیٰ مجھ کو فرزند نرینہ عطا کرے پس میں مع فرزند بہرائچ میں واسطے زیارت حضرت سلطان الشہداء سالار مسعود کے جاؤں آپ کی برکت سے حق تعالیٰ نے فرزند مبارک نام عطا کیا۔ (غزانامہ میں ہے کہ خدا نے فرزند ارجمند نیک فرجام سید مبارک نام عطا فرمایا) بی بی نے سید نور کو واسطے جانے بہرائچ کے تاکید کی۔

(غزانامہ میں ہے سید صاحب کو مستورات کی روانگی میں عذر تنگ دستی پیش آیا) ایک شب سید نور حجرہ میں مشغول تھے کہ حضرت سالار مسعود اسپ خنک پر سوار تشریف لائے، گھوڑے سے اتر کر پیش سید راجے نور کے بیٹھ کر فرمایا فرزند کو میرے پاس لاؤ، کچھ حاجت نہیں کہ فرزند تمھارے بہرائچ میں آ کر تکلیف اٹھائیں، راجے سید نور اٹھ کر سید مبارک طفل کو حضرت سالار مسعود غازی کے قدموں پر ڈال دیا۔ حضرت سلطان الشہداء سالار مسعود نے اس کو بہت دعا دی اور اٹھ کھڑے ہوئے'' [1]

اس خواب یا واقعہ میں سید مبارک کو سید راجے نور کا فرزند بتایا گیا ہے۔ ''بحر زخار'' میں بھی ''حضرت راجہ سید مبارک خلف وخلیفہ راجہ سید نور است'' لکھا ہے، مگر ''گنج ارشدی'' میں ان کے والد سید احمد بن راجہ نور ہے اور یہی صحیح ہے۔

والد بزرگوار راجی سید احمد آپ کی ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے اور عنفوان شباب تک دادا راجی سید نور نے پرورش کر کے تعلیم و تربیت دی اور بچپن ہی میں آپ نے اپنے جد بزرگوار سے بیعت کر کے اسی زمانے میں خلافت حاصل کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے والد راجی سید احمد کے ایک بھائی راجی سید محمد تھے اور دونوں اپنے والد راجی سید نور کو بہت پیارے تھے۔ یہ دونوں صاحبزادے مکتب میں پڑھتے تھے۔ ایک دن استاد نے کسی بات پر دونوں بھائیوں کو طمانچہ مارا جب ان کے والد سید نور کو خبر لگی تو بہت رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے کہ حیدر کرار کی اولاد کو طمانچہ مارنا اچھا نہیں ہے۔ یہ سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر حیدر کرار ہیں اور یہ دونوں بچے بہادری دکھاتے ہوئے شہادت پائیں گے۔ چناں چہ جوان ہونے کے بعد دونوں بھائی شاہی فوج میں ملازم ہو گئے۔ ان ہی دنوں ایک راجہ سے شاہی فوج کا مقابلہ ہوا

---

[1] خلاصۂ تواریخ مسعودی۔ ص:۱۶۔ مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۸ھ۔
و غزانامہ مسعود۔ ص:۷۵۔ مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۷ھ۔

اور دونوں بھائیوں نے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دی۔ راجہ سید احمد اس جنگ میں شدید زخمی ہوکر میدانِ کارزار میں گر گئے اور ان کے والد سید نور کے بعض مریدین نے ان کو دیکھا اور وہاں سے اٹھا کر اپنے گھر لائے اور علاج کیا۔ جب راجہ سید احمد صحت یاب ہوگئے تو ان کے گھر روانہ کر دیا۔ مانک پور آنے کے بعد ان کی شادی ہوئی اور ازدواجی زندگی کا دور شروع ہوا۔ ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ پرانے زخم عود کر آئے، جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس موقع پر راجہ سید نور کے مریدوں اور متوسلوں نے ان سے عرض کیا کہ صاحبزادے عین جوانی میں لاولد فوت ہوگئے اور آپ کی عمر کا بھی آخری وقت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ راجہ سید نور نے کہا:

''خبر زوجۂ راجی سید احمد	راجی سید احمد کی بیوی کی خبر لینی
بگیرند کہ ازاں پسرے	چاہیے، اس سے ایک بچہ پیدا
خواہد شد کہ خانۂ ما از وروشن	ہوگا، جس سے ہمارے خاندان کا
خواہد گشت''۔	نام روشن ہوگا۔

چناں چہ عورتوں نے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ ایک ماہ کا حمل ہے اور اسی سے راجہ سید مبارک پیدا ہوئے۔ دادا راجہ سید نور اپنے اس یتیم پوتے سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی دل جوئی کر کے نیک توقعات رکھتے تھے۔ پیار کی وجہ سے ان کو ''میاں ماکھو'' کہا کرتے تھے۔ مراہقت کے زمانے میں ایک مرتبہ راجہ سید مبارک اپنا پاجامہ دھوکر دھوپ میں سکھا رہے تھے کہ دادا کہیں سے آگئے اور دیکھ کر بولے:

''حیاتِ ما تا بلوغ میاں	ہماری زندگی میاں ماکھو کے جوان
ماکھو بود، از شفقت حضرت	ہونے تک ہے، انھوں نے ازراہِ
راجی سید مبارک	شفقت راجہ سید مبارک کو
رامیاں ماکھو فرمودند''۔	میاں ماکھو کہا تھا۔

نیز ایک دوسرے موقع پر دادا نے اپنے پوتے کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا تھا:

''مرا دریں خانہ دفن خواہید نمود، میاں ماکھو را کہ احتیاج پرسیدن خواہد پرسیدہ خواہند گرفت''۔	تم لوگ مجھے اسی مکان میں دفن کرنا کہ میاں ماکھو کچھ معلوم کرنا چاہیں تو معلوم کرلیا کریں۔

راجہ سید مبارک کی تعلیم وتربیت کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ وہ اپنے دادا سید نور کے مرید وخلیفہ تھے۔

''وے مرید جد بزرگوار خود حضرت راجی سید نور در صغر گشت وخلافت ہم در آں ایام یافت''۔	وہ بچپن میں اپنے دادا راجہ سید نور کے مرید ہوئے، اسی زمانے میں خلافت بھی پائی۔

راجہ سید مبارک کی پہلی شادی ان کے پردادا راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کے شیخ ومرشد حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری (متوفی ۸۵۳ھ) کے خاندان میں ہوئی۔ مگر ایک مدت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ان کی بیوی نے خوشی خوشی کہا کہ آپ دوسری شادی کرلیں تاکہ بقائے نسل کا باعث ہو۔ راجہ سید مبارک نے کہا کہ تم ہمارے مخدوم کے خانوادے سے ہو، تمھارے ہوتے ہوئے دوسری شادی کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مگر جب بیوی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو راجہ سید مبارک نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر استخارہ کیا اور مژدہ ملا کہ تمھاری نسبت جونپور میں میاں شیخ اللہ داد کے خاندان میں ہوگی اور اس سے اولاد پیدا ہوگی۔ چناں چہ اس بشارت کے مطابق دوسری شادی شیخ اللہ داد کی صاحبزادی سے ہوئی اور اس سے راجہ سید مبارک کے چھ لڑکے پیدا ہوئے۔

''آخر شش پسر از دختر شیخ الہ داد متولد گشتند''۔	چھ لڑکے شیخ الہ داد کی دختر سے پیدا ہوئے۔

مولانا شیخ الہ داد جونپوری متوفی ۹۳۲ھ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں جونپور کے اکابر علماء میں سے تھے۔ ایک واسطہ سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے شرف تلمذ رکھتے تھے اور راجہ سید مبارک کے پردادا راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کے مرید تھے۔ ساری عمر علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس اور کتابوں کی تصنیف میں بسر کی۔ شرح ہدایہ، شرح اصول بزودی، حاشیہ شرح کافیہ، حاشیہ تفسیر مدارک وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

راجہ مبارک کی دوسری شادی کے بعد بھی پہلی بیوی اور ان کے خاندان کا ادب واحترام قائم رہا اور اس کے بعد بھی راجہ خاندان کے افراد شیخ حسام الدین کے خاندان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور اس کو اپنے لیے باعث صد افتخار سمجھتے تھے۔ چناں چہ ایک مرتبہ شیخ حسام الدین کے عرس کے موقع پر راجہ سید مبارک نے ایک رسی اپنے گلے میں ڈالی اور ایک دوسری رسی گائے کے گلے میں ڈالی اور اسی حال میں شیخ قاسم سجادہ نشین خانقاہ شیخ حسام الدین کی خدمت میں چلے۔ شیخ قاسم ان کی آمد کی خبر سن کر پیشوائی کے لیے باہر آئے۔ ملاقات ہوتے ہی راجہ صاحب نے کہا:

''گاؤ و مبارک ہر دو برائے قربانی حاضر''۔	گائے اور مبارک دونوں قربانی کے لیے حاضر ہیں۔ (قمر)

شیخ قاسم نے گائے لے کر ذبح کی۔ اس وقت راجہ صاحب نے کہا کہ:

''گاؤ از مبارک بہتر است کہ قابل فاتحہ گشت نہ کہ مبارک''۔	گائے مبارک سے اچھی ہے کہ وہ قابل فاتحہ ہے اور مبارک کی فاتحہ نہیں ہو سکتی۔ (قمر)

اس قسم کی باتیں راجہ مبارک کے ذکر میں مل سکی ہیں۔ نہ ان کی تعلیم وتربیت کا پتہ چل سکا، نہ ان کے مریدین ومسترشدین کے حالات معلوم ہو سکے اور نہ ان کی روحانی اور دینی زندگی کے کچھ اہم واقعات مل سکے۔ البتہ ان کے کمالات وفضائل کا اندازہ ''گنج ارشدی'' کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''اکثر اولیائے کُمّل مرید وخلیفہ آں حضرت بودند''۔	اکثر اولیائے کاملین آپ کے مرید اور خلیفہ ہیں۔

راجہ صاحب کی وفات ۲؍شوال ۹۶۵ھ میں ہوئی اور مانک پور میں اپنے دادا سید نور کے روضے میں دفن ہوئے۔

''وفات آنحضرت دوم شوال در سنہ نُہ صد، شصت وپنج است''۔	آپ کی وفات دوسری شوال ۹۶۵ھ میں ہوئی۔

تاریخ وفات یہ ہے:

امام سالکان وقطب الاقطاب — شہ دیں حضرت راجی مبارک
چوں زیں دنیائے دوں رحلت نمودہ — بلطف حق تعالیٰ و تبارک
شدہ مذکور سالش گفت حامد — بحق شد راجی سید مبارک
۹۶۵ھ

آپ کا مزار مانک پور میں اندرون حویلی ایک گنبد کے اندر واقع ہے۔ جسے بعد میں آپ کے دوسرے صاحبزادے راجہ سید مصطفیٰ نے تعمیر کرایا ہے۔ اس گنبد کے اندر تین قبریں ہیں، پہلی قبر راجہ سید نور کی ہے، اس کے بعد مشرق کی طرف راجہ سید مبارک کی قبر ہے۔ یہ دونوں قبریں سنگ مرمر کی ہیں اور ان کا فرش بھی سنگ مرمر ہی کا ہے اور حاشیہ سنگ موسیٰ کا ہے اور تیسری قبر راجہ سید مصطفیٰ ابن راجہ سید مبارک کی ہے، یہ سنگ مرمر کی نہیں ہے، بلکہ گچ کی ہے۔ اس گنبد کی تاریخِ بنا اسی میں نقش ہے، جو درج ذیل ہے:

للہ الحمد خالق الکونین وحدہٗ لاشریک لہ ثانی
قادر ذوالجلال والاکرام کہ جہاں راست قدرتش بانی
چوں موفق شدہ عنایت او بتوفیقِ لطفِ سبحانی
در زمانِ جلالِ دیں اکبر کہ بدادش خدا جہاں بانی
روضۂ ساخت مصطفیٰ راجی کش چوں رضواں سزد بدربانی
فیض بخش مُروّحِ ارواح در سر قطب ہائے ربانی
بہر سال بنائے تاریخش ہم بیک بیت گفت او معانی؟
جنت پر بنورِ ربانی[1]

مبارکپور میں راجہ صاحب کی مسجد کے شمال میں ان کے نام سے سراسر جعلی ونقلی قبر ہے۔ راجہ سید مبارک کی اولاد میں ان کے چھ لڑکوں کی تصریح گزر چکی ہے، مگر کتابوں میں ان کے دو صاحبزادوں کے حالات ملتے ہیں، ایک راجہ سید مصطفیٰ اور دوسرے راجہ سید مجتبیٰ۔ راجہ سید مصطفیٰ اکبری دور کے باکمال علماء ومشائخ میں سے تھے۔ امارت ومشیخت میں ممتاز تھے۔ غوثی نے ''گلزارِ ابرار'' میں ان کا مستقل تذکرہ کیا ہے اور ۹۸۴ھ میں ان سے ملاقات کی ہے، جب کہ وہ اکبر کے ساتھ برہان پور کی طرف آئے تھے۔ نیز ان کے لڑکے راجہ سید محمد کو ان کا جانشین بتایا ہے[2] راجہ سید مجتبیٰ کا تذکرہ ''گنج ارشدی'' میں ہے وہ مانک پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد راجہ سید مبارک سے سلسلۂ چشتیہ حاصل کیا۔ ان کے صاحبزادے راجہ سید احمد حلیم اللہ اپنے والد کے مرید اور خلیفہ اور مشائخ چشتیہ میں بڑے مقام ومرتبہ کے بزرگ ہیں۔ ان کے خوارق وکرامات کو ان کے بعض تلامذہ نے ''الخوارق الاحمدیہ'' کے نام سے جمع کیا ہے۔ حضرت شیخ دیوان محمد رشید عثمانی جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ نے آپ سے طریقت ومشیخت کی تعلیم وتربیت پائی ہے۔ ۵/ جمادی الاولیٰ

---

[1] گنج ارشدی قلمی جلد دوم از ص: ۷ تا ۱۱۔ کتب، خانقاہِ رشیدیہ جونپور، والبلاغ بمبئی جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ۔

[2] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۶ھ۔

۱۰۴۰ھ میں مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے[۱]

راجہ سید مبارک کی اولاد واحفاد سے دیارِ پورب کو بہت زیادہ علمی وروحانی فیض پہنچا۔ عموماً یہ مشائخ مانک پور سے ان اطراف میں آتے جاتے رہے۔ بعد میں ان کے بعض خانوادے ان اطراف میں مستقل آباد ہو گئے، جن کے فیوض گزشتہ صدی تک کسی نہ کسی انداز میں جاری رہے۔ چناں چہ راجہ سید مبارک کے ایک پوتے راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید یٰسین بن راجہ مبارک تھے، جن سے ملا محمود جونپوری کے دادا شیخ بڑے (مدفون ولید پور) بیعت تھے۔ کہتے ہیں کہ جنات ان کے تابع تھے۔ نیز راجہ صاحب کے خاندان سے راجہ سید غلام نظام الدین عرف راجہ خیر اللہ شاہ محمد آبادی متوفی ۱۱۲۸ھ بانی خیر آباد تھے، جن سے شاہ ابو الغوث گرم دیوان سلسلہ چشتیہ میں مرید تھے اور راجہ خیر اللہ کے بھائی راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ حضرت حجۃ العارفین سراج السالکین راجہ سید ابراہیم کے مرید وخلیفہ تھے جو غالباً ابراہیم پور کے بانی ہیں۔ مگر راجہ مبارک کی کوئی اولاد قصبہ مبارکپور میں نہیں رہی۔ وہ خود مانک پور میں فوت ہوئے اور ان کے متعلقین ان علاقوں میں آتے جاتے رہے۔ گزیٹر کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ وہ مبارکپور کے موجودہ شیوخ زمینداروں کے مورث اعلیٰ تھے[۲] بلکہ ان زمینداروں کے مورث اعلیٰ شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری تھے۔ جن کی آخری یادگار انگریزی دور میں شیخ گدا حسین تھے۔ البتہ راجہ سید مبارک کے ہمراہ راقم کا خاندان مانک پور سے یہاں آکر آباد ہو گیا اور قصبہ کی پہلی آبادی اسی خانوادہ کی ہے۔

راقم الحروف کو فارسی زبان میں اٹھارہ صفحات کا ایک قلمی رسالہ ملا ہے، جس سے راجہ سید مبارک کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے سرنامے پر یہ عبارت درج ہے:

۱۔ گنج ارشدی۔ ج:۲۔ ص:۱ تا ۶۔ نزہۃ الخواطر۔ ج:۵۔ ص:۶۰۔

۲۔ اعظم گڑھ گزیٹر۔ ص:۲۶۱۔ ذکر مبارکپور۔

''جواب خط سید مبارک محمد آبادی کہ جناب حاجی محمد علی صاحب نوشتہ بودند، ادام اللہ''۔

اس کے بعد رسالہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
بخدمت راجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ از طرف فقیر محمد علی عفی عنہ بعد سلام سنت الاسلام آں کہ سوال از اشاعت امامت ووصایت کہ فرمودہ بودند معلوم نمایند کہ وصایت وامامت دوازدہ امام علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام نزدِ اہل سنت وجماعت ثابت ومُتحقق است نہ بایں معنی کہ شیعہ می گویند بلکہ بمعنی دیگر است، چرا کہ شیعہ لفظ امامت می گویند وازاں مراد نبوت می دارند و دوازدہ امام را احکامِ نبوت ثابت می کنند از نزول وحی وتحریم وتحلیل وغیرہ کہ در کتب ایں فرقہ مسطور است الخ''۔

بخدمت راجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ از طرف فقیر محمد علی عفی عنہ سلام کے اور جو اسلام کا طریقہ ہے۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں عرض ہے، جو آپ نے امامت اور وصایت کے بارے میں کیا ہے۔ اس کے متعلق واقف ہوں کہ اماموں کی امامت ووصایت اہل سنت وجماعت کے نزدیک ثابت ومتحقق ہے۔ مگر اس معنی میں نہیں جو شیعہ حضرات بیان کرتے ہیں، بلکہ دوسرے مفہوم میں ہے۔ کیوں کہ شیعہ لفظ امامت بول کر اس سے نبوت مراد لیتے ہیں اور بارہ اماموں کے لیے نبوت کے احکام جیسے نزولِ وحی، حرام وحلال کرنے کے اختیارات وغیرہ، جو اس فرقہ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے، اس سے ثابت کرتے ہیں۔ (قمر)

اس رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مبارک کو علم وتحقیق سے دلچسپی تھی اور انھوں نے مولانا حاجی محمد علی صاحب سے شیعوں کے عقائد کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ اس میں ایک جگہ ان کا نام سید مبارک محمد آبادی اور دوسری جگہ راجہ مبارک علی ہے اور دونوں کو ملا کر پورا نام راجی سید مبارک علی محمد آبادی بنتا ہے۔ لفظ ''علی'' ان کے نام کا جزء نہیں ہے بلکہ اضافہ ہے اور محمد آبادی کی نسبت اس لیے ہے کہ راجہ صاحب پرگنہ محمد آباد میں زیادہ دنوں تک مقیم تھے اور مبارک پور کی نئی آبادی جسے انھوں نے آباد کیا تھا کوئی خاص شہرت نہیں رکھتی تھی۔ قاعدہ ہے کہ کسی بڑی بستی یا شہر کے قرب وجوار کے باشندے اسی کی نسبت سے مشہور ہوتے ہیں۔ گزیٹیر میں راجہ سید مبارک کا نام مبارکپور آباد کرنے کے سلسلے میں یوں آیا ہے، کہا جاتا ہے اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، بعد میں راجہ مبارک[1] کے نام سے آباد ہوا جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے۔ جامع مسجد راجہ صاحب کے شمال میں ایک چھوٹی سی قناتی مسجد ہے، کہتے ہیں کہ راجہ صاحب اسی مسجد میں نماز پڑھتے اور ذکر واذکار فرماتے تھے، اس کے قریب ہمارا آبائی مکان بھی تھا۔

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر۔ ص: ۲۶۱۔ ذکر مبارکپور۔

شیخ محمود قریشی بائسیؒ

شیخ محمود قریشی بائسی مبارکپوری شاہ جہانی اور جہانگیری دور میں مبارکپور کے بہت بڑے رئیس وجاگیردار اور زمیندار تھے۔ ساتھ ہی مشیخت و بزرگی سے حصۂ وافر رکھتے تھے۔ حیرت ہے کہ اتنے اہم شخص کا تذکرہ اعظم گڑھ گزیٹیر تک میں نہیں ہے۔ حالاں کہ قصبہ کے بیان میں ان کی زمینداری کا ذکر ''مبارکپور خاص'' کے نام سے موجود ہے[1] اور نہ ہی کسی اور کتاب یا تحریر میں ان کا ذکر ہے۔ صرف مناقب غوثی میں ایک موقع پر ان کا نام آیا ہے۔ گزشتہ صدی میں ان کی اولاد میں شیخ گدا حسین تھے۔ ان کے بعض بیانات سے شیخ محمود کے رعب وداب کا پتہ چلتا ہے۔ چناں چہ شیخ محمد علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ نے ''واقعات وحادثات مبارک پور'' میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب مگھرا ضلع فیض آباد کے باغی بیشمار آدمی لے کر مبارکپور حملہ آور ہوئے اور ان کے سرغنہ نے شیخ گدا حسین سے بیرق (خراج زمین) طلب کیا تو گدا حسین نے اس سے کہا کہ بیرق کیا چیز ہے، میں خود چاہتا ہوں کہ تم سے کچھ حقوق زمینداری وصول کروں کیوں کہ بزرگوار مالک پانچ قلعے کے تھے اور تم لوگوں سے دستورات اور رسومات زمینداری لیا کرتے تھے۔ تم لوگوں نے ہم کو کمزور سمجھا ہے تو بہت اچھا مقابلہ کرو۔ جو زبردست ہو وہ بیرق لے۔[2] اس بیان سے ان کے مورث اعلیٰ شیخ محمود بائسی کے رئیسانہ وزمیندارانہ اثر ورسوخ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بائیس مواضعات کے زمیندار تھے، اسی لیے بائسی کی نسبت سے مشہور تھے اور ان کی مشیخت وبزرگی کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ وہ شاہجہانی دور کے مشہور بزرگ اور عالم حضرت شاہ حاجی ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ کے خسر تھے۔ حاجی ابوالخیر

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیر۔ ص:۲۶۱۔

[2] واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص:۶۴۔

۱۰۰۸ھ میں بھیرا میں پیدا ہوئے۔ سلطان شاہ جہاں اور نواب امیر الامرا شائستہ ان کے عقیدت مندوں میں تھے۔ دہلی سے حرمین شریفین کا سفر کیا اور ''شیر وشکر'' نامی ایک کتاب لکھی، جس میں حج وزیارت کے احکام ومناسک اور اپنے خاندان کے حالات درج کیے۔ ۱۲ر شوال ۱۰۵۹ھ کو بھیرا میں انتقال کیا۔ ان کی تین بیویاں تھیں، جن میں ایک ملامحمود جونپوری کی بہن اور ایک شیخ محمود کی صاحبزادی اور ایک شیخ عبداللہ بن مخدوم اسماعیل چریاکوٹی کی دختر تھیں، جن سے شاہ اسماعیل بن حاجی ابوالخیر پیدا ہوئے۔

حاجی ابوالخیر، شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے پردادا ہیں۔ مناقب غوثی میں ہے:

''سہ زن درسلکِ ازدواجش	تین عورتیں ان کے نکاح
درآمدہ بودند۔ اول دختر شیخ	میں آئیں۔ ایک شیخ
عبداللہ کہ از فرزندآن قدوۃ	عبداللہ بن شیخ اسماعیل کی
العارفین شیخ اسماعیل قدس سرہ	دختر جس سے مخدوم شیخ
بود...... مخدوم شاہ اسماعیل	اسماعیل پیدا ہوئے۔
قدس سرہ از دختر شیخ عبداللہ بود	دوسرے شیخ محمد کی دختر جو
آمدہ دیگر دختر شیخ محمد اخت ملا	ملامحمود جونپوری کی بہن تھی
محمود جونپوری اما ازاں صدف	اس سے اولاد نہیں ہوئی
گوہرے بساحل سلامت	اور تیسری شیخ محمود قریشی
نرسید دیگر دختر شیخ محمود قریشی	المعروف بائسی مبارکپوری
المعروف بائسی مبارکپوری	کی دختر۔ اس بیوی سے بھی
ازوہم فرزندے باقی نماند''[1]	کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔

شیخ محمود کے بائیس مواضعات مغرب میں چک سکٹھی تک، مشرق میں املو کے آگے نورپور اور پیارے پور تک، شمال میں رسولپور بیورا اور موضع ملک شدنی تک اور جنوب میں لہرا

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی۔

گھبرا تک تھے۔ وہ پانچ گڑھیوں یا کوٹ کے مالک تھے، جن میں ایک مبارکپور میں جامع مسجد راجہ صاحب سے متصل جنوب میں تھی، جس کے آثار اب بھی معمولی ٹیلہ کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے گرد خندق تھی چناں چہ اس کے جنوب میں جو گڑھی ہے، اسے آج بھی کھنک کہتے ہیں، جو خندق کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ کوٹ بہت بڑی تھی اور اسی میں وہ رہتے تھے۔

شیخ صاحب بڑے رعب وداب کے رئیس اور جاگیردار تھے۔ اطراف وجوانب میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں مینہ نگر کے نومسلم راجاؤں کا زور ہوا۔ راجہ اعظم خاں نے ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں اعظم گڑھ اور اس کے بھائی راجہ عظمت خاں نے عظمت گڑھ آباد کیا۔ ان دونوں نئی بستیوں کے درمیان مبارکپور کی قدیم بستی تھی، جہاں شیخ محمود بائسی کے اقتدار کا طوطی بول رہا تھا اور ان کی موجودگی میں راجہ اعظم خاں اور راجہ عظمت خاں کا اقتدار نامکمل تھا۔ چناں چہ راجہ اعظم خاں اور شیخ محمود بائسی میں حریفانہ چشمک پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ شیخ صاحب کے بے دردانہ قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ نیز اسی زمانے میں راج بھر قوم کا ایک راجہ بہیلیا نامی مبارکپور کے مغرب میں دریائے ٹونس کے اس پار دیوکھری میں تھا جو اعظم خاں کی عملداری اعظم گڑھ سے قریب تھا، مگر وہ شیخ محمود کے مقابلے میں زیادہ خطرناک نہیں تھا، اس لیے راجہ اعظم خاں نے اسے ملا کر شیخ محمود کو قتل کرا دیا۔ راجہ بہیلیا نے اپنے شاندار محل کے دکھانے اور شیخ محمود کی خوشنودی حاصل کرنے کے بہانے سے ان کو اپنے یہاں دعوت دی۔ اعظم خاں اس سازش میں شریک تھا، شیخ محمود حالات سے بے خبر تھے، راجہ بہیلیا کی دعوت پر اس کے یہاں چلے گئے اور راجہ اعظم خاں نے ان کو گولی ماردی۔ روایت یہ بھی ہے کہ خود راجہ بہیلیا اور اس کے آدمیوں نے محل کے اندر شیخ صاحب کو بلا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا اور پھر نہایت بے دردی سے قتل کیا۔ اس کے بعد وہ طوفان برپا ہوا کہ شیخ محمود کی لاش بھی مبارکپور نہ لائی جاسکی۔ بلکہ وہیں دریائے ٹونس کے کنارے پر ایک نالے کے پاس ان کو دفن کر دیا گیا۔ جہاں آج بھی ان کی قبر موجود ہے اور وہاں عوام اس نالے کو اپنی زبان میں سکھمد بابا کا

نالہ کہتے ہیں۔ سکھمد شیخ محمود کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اب یہاں قبر کا نشان نہیں ہے۔ البتہ تھوڑی زمین خالی ہے اور بعض درخت اور جھاڑ ہیں۔ دیہاتی لوگ اب بھی اس پر چراغ جلا دیا کرتے ہیں اور جب کوئی جانور بیمار ہوتا ہے تو اس کے قریب لا کر پھراتے ہیں۔ ان کے خیال میں سکھمد بابا کے یہاں جانور آ کر صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ شیخ محمود کی شہادت کے بعد ان کی اولاد پر بڑی تباہی آئی۔ راجہ اعظم خان نے ان کو تلاش کر کے قتل کرنا چاہا، مگر وہ مبارک پور سے املو کی کوٹ میں پناہ گزیں ہو گئے اور ڈر کی وجہ سے کسی نے ان کی مخبری نہیں کی، اس لیے وہ محفوظ رہے۔ اسی زمانہ میں اس واقعہ کی تاریخ کے طور پر یہ مثل مشہور ہوئی ''کون کہے کون بیری ہو، محمود کے بیٹے کوٹھے پر''۔ آج بھی یہ مثل املو میں عام طور سے رائج ہے۔ شیخ محمود کی دو بیویاں تھیں اور دونوں سے اولاد ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں دوراندیشی سے کام لے کر اپنا علاقہ دونوں بیویوں کی اولاد میں یوں تقسیم کر دیا، کہ ایک بیوی کی اولاد کو چک سکٹی، مبارکپور خاص اور رسولپور بیورا (کھسورا) دیا اور دوسری بیوی کی اولاد کو موضع ملک شدنی، املو اور پیارے پور دیا اور نور پور کی زمینداری کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک نور پور بوتات اور دوسرا نور پور حاجی سرائے۔ نور پور بوتات (بیوتات) کا حصہ مبارکپور میں رہنے والی اولاد کو دیا اور نور پور حاجی سرائے املو میں رہنے والی اولاد کو دیا۔ یہ دونوں حصے اب تک سرکاری کاغذات میں ان ہی ناموں سے درج کیے جاتے ہیں۔ نور پور بوتات مبارکپور کا جنوبی مشرقی حصہ ہے، جس میں ٹھاکر دوارہ اور انٹر کالج واقع ہیں اور نور پور حاجی سرائے میں چک شیخ احمد (چکیا) وغیرہ واقع ہے۔ املو میں محمود پورہ شیخ محمود کے نام پر ہے اور ان کی اولاد وہاں آباد ہے۔ مبارکپور میں ان کی اولاد میں آخری دور میں شیخ گدا حسین تھے۔ جن کے لڑکے نظام آباد جا کر زمینداری کی وجہ سے شیعہ ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان واقعات کو ہم نے ککرہٹا، دیوکھری، سکھمد کا نالہ اور املو جا کر معلوم کیا۔ خاص طور سے املو کے حاجی شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالمجید سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

پیرزادہ مخدوم محمد ماہ املویؒ

حضرت مخدوم پیرزادہ محمد ماہ بن شیخ سعد اللہ بن شیخ غلام محی الدین عرف جڑاون بن شیخ بھورے بن شیخ محمد اسحاق بن شیخ محمد مجاہد بن شیخ عبدالواحد بن شیخ بھکاری بن شیخ محمد حافظ بن شیخ محمد داؤد بن شیخ جمال الدین بن شیخ مخدوم شاہ ظہیرالدین صدیقی املوی رحمۃ اللہ علیہ کے مورث اعلیٰ مخدوم ظہیرالدین محمد آبادی متوفی ۲۷/ذی الحجہ ۸۴۵ھ تھے۔ جن کی ولادت تاج پور سارن میں ہوئی تھی۔ کچھ دنوں حکومت وقت سے منسلک رہ کر حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بیعت وخلافت کا شرف حاصل کر کے دیارِ پورب کا رخ کیا اور محمد آباد گوہنہ میں اقامت اختیار کی۔ اس وقت دہلی میں تغلق خاندان حکمران تھا۔ ان کا مزار محمد آباد اور خیر آباد کی درمیانی شاہراہ کے شمال میں ایک اونچے ٹیلے پر ہے، جہاں ایک مسجد بھی ہے۔ روضہ اب تک موجود ہے، جسے آستانہ روضہ کہتے ہیں۔ پیرزادہ محمد ماہ نے املو میں سکونت اختیار کی اور حکومت کی طرف سے رسولپور، موضع ملک شدنی اور موضع رسولپور بیورا (کھورا کھورراہ) کی جاگیر عطا کی گئی۔ ۱۸۳۶ء کے کاغذات میں اس جاگیر کا تذکرہ موجود ہے۔ املو اور رسولپور کے درمیان میں پیرزادے کا باغ بھی مشہور ہے۔ پیرزادہ محمد ماہ چھ بھائی تھے۔ محمد ماہ، وارث علی، خضر احمد، غلام محمد، حفیظ اللہ ایک اور۔ وارث علی کے علاوہ سب صاحب اولاد ہوئے۔ پیرزادہ محمد ماہ کی لڑکے شیخ محمد علی تھے، شیخ محمد ماہ کا انتقال املو میں ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کا مزار رسولپور بیورا میں ہے، جو ان کی جاگیر میں تھا اور پورہ دلہن مبارکپور کے شمال مشرق میں چند فرلانگ پر پیرزادے کے نام سے جو مزار مشہور ہے وہ انہیں کا ہے۔ ماضی قریب میں پیرزادہ خاندان میں شاہ مقصود عالم اور شاہ رشید عالم دو نامور شخص گزرے ہیں۔ شاہ مقصود عالم کے لڑکے

مولانا حکیم شاہ فیاض عالم صاحب مولانا عبدالعلیم صاحب رسولپوری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۴۴ھ یا ۱۳۴۵ھ میں ہوا ہے۔ اسی خانوادہ سے شاہ مخدوم عالم تھے، جن کے دولڑکے علی بخش اور ظہور عالم تھے۔ ان کی اولاد دسارین (اہرولہ) میں اب تک موجود ہے۔[1]

مخدوم شیخ رشید

بن مخدوم شیخ سعید فاروقی

حضرت مخدوم شیخ رشید بن شیخ مخدوم شیخ سعید بن شیخ مشید بن مخدوم شیخ بڑے بن مخدوم شیخ محمود بن مخدوم شیخ راضی معین بن مخدوم شیخ چاند بن مخدوم شیخ معروف بن مخدوم شیخ مشید بن مخدوم شیخ محمد بن مخدوم شیخ خضر فاروقی یہ نسب نامہ ظفر حسن صاحب عینی فاروقی نے یوں ہی بیان کیا ہے۔ شیخ بڑے کے دو صاحبزادے تھے، ایک شیخ محمد جن کے صاحبزادے ملا محمود جونپوری ہیں اور دوسرے شیخ مشید جن کے پوتے شیخ رشید تھے۔ یہی مبارکپور میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے صاحبزادے شیخ لطف اللہ تھے، جن سے فاروقیان مبارکپور کا سلسلہ چلا۔ افسوس کہ شیخ رشید بن شیخ سعید کے بارے میں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ جس علاقہ میں وہ آکر مقیم ہوئے تھے اسے رشید آباد کہتے تھے۔ جیسا کہ اس خاندان کے بعض معتبر وثقہ علماء سے معلوم ہوا ہے۔ غالبًا وہ شاہجہانی دور میں مبارکپور میں تشریف لائے تھے۔

---

[1] خانوادۂ ظہیریہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'' از مولوی خالد کمال مبارکپوری مندرجہ رسالہ ''البلاغ'' بمبئی ماہ شوال ۱۳۷۴ھ۔

بندگی سید کمال الدینؒ گھہرا

حضرت بندگی شاہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ خاندانی روایت کے مطابق شاہجہانی دور سلطنت میں گھہرا تشریف لائے، جو مبارکپور کے جنوب میں مشہور مقام ہے۔ اس زمانے میں یہاں راج بھر قوم کی بہت بڑی آبادی تھی، جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ آپ نے ان لوگوں میں تبلیغ اسلام کی اور ان کو مسلمان بنایا۔ ان میں ایک نومسلم کا نام فخر الدین پڑا، بعد میں فخر الدین پور نامی بستی گھہرا سے متصل ان ہی کے نام پر آباد ہوئی۔ جس میں ان کی اولاد نے بود و باش اختیار کی۔ بندگی کمال الدین نے گھہرا میں انتقال فرمایا۔ ان کا مزار وہیں ایک روضہ کے احاطہ میں واقع ہے۔ نیز وہاں ان کے مریدین ومتوسلین اور اہل وعیال کی کئی قبریں ہیں۔ یہ روضہ شاہی مسجد کے سامنے جنوب مشرق میں چھ ہاتھ کے فاصلے میں ہے۔ اس کی اینٹیں لکھوری ہیں جو عام طور سے مغل دور میں استعمال ہوتی تھیں۔ روضہ کا یہ حصہ ویران اور جنگل نما ہے۔

قاضی محمد صالحؒ گھہرا

آپ بندگی سید کمال الدین کے صاحبزادے ہیں۔ بارہویں صدی کے اوائل میں انتقال فرمایا۔ اپنے علاقہ کے یا کسی اور مقام کے قاضی تھے۔ آپ نے گھہرا میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کی، جو اب تک موجود ہے اور شاہی مسجد اور عالمگیری مسجد کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس کا سنہ تعمیر ۱۰۹۹ھ ہے، اس کا طول تقریباً ۳۲ ہاتھ ہے، تین در ہیں اور گنبد بھی تین ہیں، درمیانی در کے دونوں کناروں پر پانچ پانچ ہاتھ اونچے مینارے ہیں اور درمیانی دروازے کے اوپر سنگ موسیٰ کا کتبہ لگا ہوا ہے، جس پر سنہ تعمیر ۱۰۹۹ھ درج ہے اور مندرجہ ذیل اشعار نہایت خوش نما جلی خط میں کندہ ہیں۔

در زمانِ شاہ عالمگیر دیں پرور کزو — رونق دین محمد ہست افزوں از قیاس
شد بنا از فیض خورشید کرم للمتقین — مسجدے کز نورِ آں انجم نماید اقتباس
حاملان عرش گفتند از کمال کیست ایں — گفتم از ابن الکمال است ایں کمالِ حق شناس
رفعت شانش بہ بیت اللہ می نازد بہ فضل — ذروۂ او جش باوج آسماں کردہ مساس
سال تاریخش پر سیدم ز پیر عقل گفت — از محمد صالح است ایں مسجد احسن اساس

اس مسجد کی تعمیر و تکمیل کے بعد قاضی محمد صالح کا انتقال ہوا اور اسی مسجد کے صحن میں ان کا مزار ہے، اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کے بارے میں یہ تمام معلومات مولانا شمس الحق ساکن گجہڑا نے تحقیق کر کے ہم کو دی ہیں۔

انگارا شاہؒ

انگارا شاہ صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے، نام معلوم نہیں۔ قصبہ کے پچھّم روضہ کے باغ میں رہتے تھے۔ ان کو انگارا شاہ کہنے کی وجہ جو عام طور پر مشہور ہے، یہ ہے کہ ایک دن ایک شخص نے ان سے آگ مانگی، انھوں نے سامنے ایک گڑھے کی طرف اشارہ کیا کہ اسی میں سے آگ نکال لو۔ اس نے کہا کہ اس میں تو پانی ہے، پانی میں سے آگ کیسے نکل سکتی ہے۔ یہ سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دست پناہ سے دہکتا ہوا انگارا نکال کر اس آدمی کو دے دیا۔ یہ واقعہ اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ آپ کو انگارا شاہ کہنے لگے اور اصل نام بھول گئے۔

ایک دن عالم جذب میں بھیٹر کے ایک درخت کو ڈنڈا مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ گر جا، گر جا، بعد میں معلوم ہوا کہ اسی دن اور اسی وقت بنارس کی لاٹ کا ایک حصہ خود بخود ٹوٹ کر گر گیا، جو بنارس میں ریلوے لائن کے شمال میں واقع ہے۔ اس میں ایک طرف ہندوؤں کی لاٹ اور مٹھ ہے اور دوسری طرف مسجد ہے اور دونوں مذہب کے

لوگ اس جگہ مخصوص اوقات میں جمع ہوکر مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور بعض اوقات گشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا زمانہ اور سنہ وفات معلوم نہیں۔ اسی باغ میں ان کا مزار ہے۔ چند سال ہوئے کسی نے اسے پختہ بنوادیا ہے۔

غریب شاہ مبارکپوریؒ

غریب شاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے زمانے کے صاحب کشف و کرامت اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ محلّہ پورہ خضر میں سڑک کے پچھّم طرف صحن میں ان کی قبر ہے۔ ''واقعات و حادثات مبارکپور'' میں اس جگہ کو غریب شاہ کا باڑا لکھا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

دیوان مصطفیٰ شاہ بانیِ مصطفیٰ آباد

حضرت دیوان مصطفیٰ شاہ بانی موضع مصطفیٰ آباد یہاں کے ایک خاندان کے مورثِ اعلیٰ ہیں اور ان کے نام پر یہ بستی مشہور ہے۔ آبادی کے اندر جنوبی حصے میں ''دیوان صاحب کا حجرہ'' کے نام سے ان کی خانقاہ کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خانقاہ کافی بڑی اور کشادہ تھی، حجرہ کی جگہ قدیم زمانے کا نیم کا درخت ہے اور آس پاس قبروں کے نشان ہیں۔ اس جگہ کو مقامی لوگ متبرک سمجھتے ہیں۔ دیوان صاحب کا مزار بستی کے باہر بجانب شمال واقع ہے، جہاں کھجور کے جھنڈ اور دوسرے خودرو درخت اور جھاڑیاں ہیں۔ قبر کا نشان اب تک موجود ہے۔ اس سے متصل شمال مغرب میں ایک شکستہ مسجد بھی ہے۔ فی الحال یہ پورا علاقہ جھاڑیوں پر مشتمل ہے۔ افسوس کہ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔

غریب شاہ املوی

املو میں شاہ غریب کا مزار وسط آبادی میں واقع ہے اور اس جگہ کو چوک غریب شاہ اور تکیہ غریب شاہ کہتے ہیں۔ چند سال ہوئے یہاں کی ایک قبر سے ہڈیوں کا پورا ڈھانچہ برآمد ہوا تھا۔

شاہ فضل رح کٹرا

یہ شاہ فضل جن کے نام سے مشہور ہیں۔ محلّہ کٹرا کے پچھّم طرف کنویں کے اتر جانب ان کا مزار ہے۔ ان کی کئی کرامتیں عوام میں مشہور ہیں۔ معلوم نہیں کس وجہ سے ان کے نام کے ساتھ لفظ جن کا الحاق ہوا، غالبًا جنات تابع رہے ہوں گے۔ پرانا قبہ ہمارے بچپن تک موجود تھا، بعد میں کسی نے قبر کے گرد گول دیوار بنوائی ہے۔

ننگے شکر مال رح کٹرا

شاہ فضل جن کے مزار کے سامنے سڑک کے دکھن جانب نیم کے درخت کے نیچے ننگے شکر مال کا مزار ہے۔ معلوم نہیں ان کا اصلی نام کیا ہے اور کس لیے ان کو ان الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہے۔

شاہ لدّھاؒ سگڑی

شاہ لدّھا پورہ دولہن کے رہنے والے تھے۔ محلّہ شاہ محمد پور میں ان کی سسرال تھی۔ قصبہ کے مشہور بزرگوں میں ہیں۔ بچپن ہی سے نہایت نیک و صالح تھے اور اسی زمانے میں بعض خوارق کا ظہور ہوا تھا۔ ان کے بارے میں عوام و خواص میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ان کی قبر جین پور سگڑی میں ہے، جہاں ہر سال عرس اور میلہ لگتا ہے۔ غالبًا وہ نوابی اودھ کے دور میں تھے۔ ۱۱؍ ربیع الاوّل ۱۴۰۱ھ دوشنبہ کو جین پور جا کر ان کے روضہ کو دیکھا اور فاتحہ پڑھی۔ قبر ایک خطیرہ میں ہے، جس کے اوپر گنبد ہے۔ خطیرہ کے دروازہ کے اوپر کتبہ ہے، جس میں دو سطریں ہیں، چونا لگنے کی وجہ سے کتبہ پڑھا نہ جا سکا، البتہ ۱۱۲۲ھ صاف نظر آیا، جو شاہ لدّھا کا سنہ وفات یا روضہ کی تعمیر کا سنہ ہے۔ (قاضی اطہر مبارکپوری)

شیخ کمال الدینؒ نوادہ

شیخ کمال الدین ایک بزرگ اور خدا رسیدہ انسان تھے۔ کسی دوسری جگہ سے آ کر نوادہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ وسط آبادی میں مدرسہ کے پاس کا کنواں ان کی یادگار ہے اور عوام اسے سکھمال بابا (شیخ کمال بابا) کا کنواں کہتے ہیں۔ ان کا انتقال نوادہ میں ہوا اور اسی کنویں کے پاس ان کی میت کو غسل دیا گیا۔ مغسل کا نشان ایک مصنوعی قبر کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور قبر محلّہ کٹرا میں بازار کے وسط میں نیم کے درخت کے نیچے ایک بلند چبوترے کی شکل میں ہے۔

راجہ بھانٹؒ

راجہ بھانٹ باہر سے آئے ہوئے کوئی بزرگ تھے۔ جن کے نام سے قصبہ کے پچھّم اور دکھن کی طرف ایک خوشنما تالاب راجہ بھانٹ کا گاڑا مشہور ہے اور گاڑے کی مسجد کے متصل اکھاڑے کے پاس ان کی پختہ قبر ہے۔ ہمارے بچپن میں یہ قبر اچھی حالت میں تھی، بعد میں مرمت ہوئی ہے۔ مشہور ہے کہ راجہ بھانٹ کو ڈاکوؤں نے مار کر گاڑے میں پھینک دیا تھا اور ان کا کتا بھونکتا ہوا کبھی قصبہ میں آتا کبھی گاڑے پر جاتا۔ جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو ان کی لاش گڈھے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں یہ علاقہ جنگلات پر مشتمل تھا۔ اس تالاب سے متصل محلّہ پورہ رانی ہے۔ ہوسکتا ہے اس کو راجہ بھانٹ سے کوئی تعلق ہو۔

حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراویؒ

حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بن شیخ محمد بن شیخ مخدوم اسماعیل بن شیخ حاجی ابوالخیر بن شیخ ابوسعید بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان بن شیخ محمد ماہ بن شیخ چاند بن شیخ معروف بن شیخ مشید بن شیخ محمد بن شیخ خضر فاروقی بھیروی لہراویؒ اس دیار کے ان علمائے کبار و مشائخ عظام میں سے ہیں، جن کے علمی و دینی اور روحانی فیوض و برکات کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔

آپ کے مورثِ اعلیٰ شیخ خضر فاروقی، حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی کی خدمت و صحبت میں بیعت و خلافت سے سرفراز ہوکر دہلی آئے۔ یہیں ان کے

صاحبزادے شیخ محمد پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں تیموری فتنہ نے دہلی کو شہر پُر آشوب بنادیا، اس لیے شیخ مخدوم خضر اور صاحبزادے شیخ محمد جونپور چلے آئے۔ اس وقت جونپور میں سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کی حکومت تھی۔ سلطان نے بڑے اعزاز واحترام سے آپ کی پزیرائی کی۔ شیخ خضر کے انتقال کے بعد شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے۔ ان کے انتقال پر ان کے لڑکے شیخ مشید ان کے جانشین ہوئے تو سلطان ابراہیم نے ان کو ولید پور وغیرہ کی جاگیر عطا کی۔ مناقب غوثی میں ہے:

”سلطان ابراہیم از تعزیت	سلطان ابراہیم شاہ شرقی شیخ
نہایت کوفتہ شد آخرالامر	محمد کے انتقال سے بہت رنجیدہ
حضرت مشید راصدروجانشین	ہوا اور شیخ مشید کو ان کا جانشین
آں مسند محتشم گردانیدہ بکمال	مقرر کر کے از راہ نیاز مندی
نیازمندی در پرگنہ محمد آباد قریہ	پرگنہ محمد آباد میں ولید پو اور
ولید پور با دیگر مواضع در وجہ	دوسرے مواضع گزر بسر کے
معاش مقرر داشت“[1]	لیے مقرر کیے۔

یہ جاگیر ولید پور بھیرا اور لہرا تک تھی، جس کی آمدنی سے اس خاندان کا گزر ہوتا تھا۔ یہ خاندان جونپور سے یہاں آکر مستقل طور سے آباد ہوگیا۔ اس میں بڑے بڑے علماء ومشائخ پیدا ہوئے مولانا حاجی ابوالخیر متوفی ۱۰۵۹ھ شاہجہانی دور کے علمائے کبار اور مشائخ عظام میں سے ہیں۔ ان کے لڑکے مخدوم شاہ اسماعیل متوفی ۱۱۰۶ھ طبقۂ مشائخ میں بڑے مقام ومرتبہ کے تھے۔ یہ شاہ ابوالغوث کے دادا تھے۔

شاہ ابوالغوث کی ولادت شب دوشنبہ ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ میں بھیرا میں ہوئی۔ ان کی والدہ ماجدہ شیخ میر خان صدیقی تھوپوری (سیاہ) کی دختر تھیں۔ اس وقت ان کے دادا شیخ اسماعیل زندہ تھے۔ زمانہ کے مطابق ان کے والد شیخ محمد نے تعلیم وتربیت کی طرف

[1] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی۔

پوری توجہ کی۔ ان کے انتقال کے بعد شاہ ابوالغوث نے بنارس، غازی پور اور الہ آباد کا تعلیمی سفر کیا۔ الہ آباد میں علومِ مروجہ میر سید غلام احمد بن شاہ موسیٰ عاشقان اودھی سے حاصل کیے اور سلسلۂ چشتیہ میں ارشاد و تلقین شاہ فتح محمد حسینی میدانوی متوفی ۱۱۴۳ھ سے پائی اور شاہ فتح محمد ہی نے آپ کو گرم دیوان کا لقب دیا۔ مناقب غوثی میں تصریح ہے:

''بامرِ الٰہی از جناب ولایت	آپ نے اپنے پیر و مرشد
مآب حضرت شاہ فتح محمد	شاہ فتح محمد کی طرف سے
مرشد خود بخطاب گرم دیوان	گرم دیوان کا خطاب
خطاب یافت۔''	حاصل کیا۔

مناقب غوثی کے مصنف شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے مرید و خلیفہ ہیں۔ ان کی اس تصریح سے ''تذکرۂ علمائے ہند'' کی وہ روایت غلط ہو جاتی ہے کہ آپ کو گرم دیوان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات خرق عادت سے آپ کا جسم اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ اس پر گیہوں کی روٹی پکائی جا سکتی تھی[1]

تعلیم و تلقین حاصل کرنے کے بعد شاہ ابوالغوث نے سلطان پور عرف بھیرا میں مسند ارشاد و تلقین کو زینت دی اور کچھ دنوں تک ترک و تجرید کی زندگی بسر کی۔ مگر خانگی امور و جاگیرداری کے کاموں کی وجہ سے یہاں سکونِ قلب نہ مل سکا، تو اپنے چھوٹے بھائی شیخ احمد شاہ کو زمینداری کا انتظام سپرد کر کے وحدت آباد عرف لہرا میں چلے آئے، جو آپ کے حلقۂ زمینداری میں مبارکپور سے دو میل جنوب میں ایک پرفضا مقام تھا۔

صاحب مناقب غوثی نے لکھا ہے:

''وخود مجردانہ آزادانہ از آنجا	شاہ ابوالغوث تن تنہا بھیرا سے
برآمد در لہرہ بہ پہلوے جنگل	لہرا چلے آئے اور جنگل کے ایک
استقامت گرفت تنہا با محبوب	گوشے میں سکونت اختیار کر کے

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔ ص: ۵۔

حقیقی خلوت داشت۔ چنانچہ کسے از احوال او مطلع نہ بود و این وحدت آباد عرف لہرہ جائے است بغایت فرح ناک در عین شارع مابین محمد آباد گوہنہ و اعظم گڑھ بہ پہلوئے جنگل واقع است، طرف جنوب موضع مذکور کہ جنگل روح افزا در راحت رسا بود، الآن بدستور سابق مرتع آہوان چشم اہل شوق و ذوق است۔ حجرہ خاص برائے عبادت بنا کرد بے تکلف تعرضات خویش و بیگانہ در آں زاویہ ناپرساں بفراغ باطن از بادۂ عرفاں تکیہ بر توکل زد۔"

عبادت الٰہی میں یوں مشغول ہوئے کہ کسی کو ان کے حالات کی خبر نہ تھی۔ وحدت آباد عرف لہرا بڑا پرفضا مقام ہے۔ محمد آباد گوہنہ اور اعظم گڑھ کے درمیان سڑک پر ایک جنگل کے پہلو میں واقع ہے۔ اس کے جنوب میں نہایت فرحت بخش جنگل ہے۔ اب بھی یہ جگہ ارباب ذوق کے لیے بڑی پرکشش ہے اسی جگہ عبادت کے لیے ایک خاص حجرہ بنوا کر خویش و بیگانہ کے جھگڑوں سے الگ تھلگ ہو گئے اور بادۂ عرفاں کی سرمستی میں توکل کو تکیہ بنایا۔

شاہ ابوالغوث کی شادی تھوپور سپاہ میں ان کے ماموں کی لڑکی فاطمہ بنت شیخ منور خاں صدیقی سے ہوئی تھی، جن سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی اپنے بھانجے شیخ عبدالحکیم خاں صدیقی سے کر دی۔ ۱۱۲۵ھ میں بیوی کا انتقال ہو گیا اور اس کے دوسرے سال ۱۱۲۶ھ میں والدہ ماجدہ فوت ہو گئیں۔ شاہ ابوالغوث ان حوادث سے برگشتہ خاطر ہو کر اپنے مرشد میر فتح محمد کی خدمت میں الہ آباد چلے گئے۔ انھوں نے اپنے مرید کو صبر و شکر کی تلقین کر کے لہرا واپس کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد شاہ ابوالغوث کی دوسری شادی شیخ غلام رسول مصطفیٰ آبادی کی دختر سے ہوئی۔ ۱۱۶۴ھ میں اودھ کے

حاکم چکلہ اعظم گڑھ نے آستانہ وحدت آباد لہرا میں شاہ ابو الغوث کے ایک آدمی کے ساتھ نازیبا سلوک کیا، جس سے آپ دل برداشتہ ہو کر ترکِ وطن پر تیار ہو گئے اور اپنے مرید شمس الدین حیدری مصنف مناقب غوثی سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ تم ہمارے خاندان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دینا۔ شدہ شدہ یہ خبر نواب فضل علی خاں والی غازیپور تک پہنچی تو انھوں نے غازیپور تشریف لانے کی دعوت دی۔ آپ نے نواب کو لکھا کہ درحقیقت میں نے بیت اللہ کے سفر کا عزم کیا ہے اور اپنے متعلقین کو اس دیار ناقدرداناں میں چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں۔ جب یہ سفر ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ آؤں گا۔
لہرا کے دورانِ قیام میں شاہ ابو الغوث نے راجہ سید خیر اللہ متوفی ۱۱۲۸ھ سے سلسلہ چشتیہ میں خلافت حاصل کی۔ راجہ سید خیر اللہ راجہ سید حامد مانک پوری کی اولاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک تھے۔ ان کا اصل نام راجہ سید غلام نظام الدین تھا اور خیر اللہ عرفیت تھی، محمد آباد گوہنہ میں رہتے تھے اور ان کے بھائی راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ جونپور میں رہتے تھے۔ بسا اوقات شاہ ابو الغوث راجہ خیر اللہ کی خدمت میں لہرا سے محمد آباد جاتے اور واپس آجاتے۔ انھوں نے شاہ ابو الغوث کی روحانی تربیت و تعلیم میں عقیدت و محبت کی سرگرمی دکھائی۔ راجہ خیر اللہ اور راجہ دانی دونوں بھائی لہرا آتے جاتے تھے۔ راجہ سید خیر اللہ ۷/رجب ۱۱۲۸ھ کو فوت ہوئے۔ اور محمد آباد گوہنہ میں دفن کیے گئے۔ شاہ ابو الغوث گرم دیوان ۲۵/جمادی الثانیہ ۱۱۷۸ھ بروز جمعہ بعد نماز عشاء لہرا میں فوت ہوئے اور مکان کے سامنے باغ میں کھیرنی کے درخت کے نیچے دفن کیے گئے۔ شیخ شمس الدین حیدری نے آپ کی وفات کی دو تاریخیں لکھی ہیں:

خمسۂ عشرین از جماد اخیر نیم شب از آدینہ شد آگاہ
گفت ہاتف بگوشِ اہل سخن گشتہ محبوبِ حق فنا فی اللہ
۱۱۷۸ھ

دیگر

شاہ ابوالغوث آں گرامی شاہ   بود در وقتِ خویش ظل اللہ
شرح احوالِ او نمی گنجد   اندریں صفحۂ کوتاہ
مصرع آخریں ز تاریخش   برکمالاتِ حال اوست گواہ

''نزہۃ الخواطر'' میں آپ کی تاریخ وفات ۲۶/ جمادی الاخری ۱۱۷۷ھ درج ہے اور ''تذکرۂ علمائے ہند'' میں بھی ۱۱۷۸ء ہے۔ ''نزہۃ الخواطر'' میں آپ کا مولد و مدفن دونوں بھیرا لکھا ہے، حالاں کہ مدفن لہرا ہے۔

شاہ ابوالغوث کے خلفاء میں تین حضرات بہت مشہور ہیں۔ ایک آپ کے صاحبزادے مولانا شاہ ابواسحاق لہراویؒ، دوسرے آپ کے بھتیجے شاہ عبدالحقؒ اور تیسرے شاہ معشوق علی غازیپوریؒ۔ جہاں آپ کا مزار ہے، اس جگہ کو روضہ کہتے ہیں۔ مزار اور خانقاہ کا علاقہ بالکل ویران ہے، مسجد کی دیواریں کھڑی ہیں، جنوب میں خانقاہ اور مدرسہ ٹیلہ کی شکل میں مٹی کا ڈھیر ہیں، دروازوں اور کمروں کی بعض خام دیواریں اب تک موجود ہیں، صحن میں قدیم زمانے کے کھجور کے اور مختلف قسم کے درخت ہیں۔ یہاں پر روحانیت اور حسرت کا عجیب عالم نظر آتا ہے۔[1]

حضرت مولانا شاہ حافظ ابواسحاق محدث لہراویؒ

آپ حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے صاحبزادے اور خلیفہ ہیں۔ تعجب ہے کہ مولانا شمس الدین حیدری نے ''مناقب غوثی'' میں کہیں شاہ ابواسحاق صاحب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، حالاں کہ یہ کتاب ان کے والد شاہ ابوالغوث کے احوال و مناقب

---

[1] شاہ ابوالغوث کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مناقب غوثی (قلمی) نزہۃ الخواطر۔ ج:۶۔ ص:۱۵۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ ص:۵۔

میں ہے۔ شاہ ابواسحاق کی پیدائش بھیرا میں ہوئی۔ قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد اپنے والد محترم اور دوسرے اساتذہ سے تحصیل علم کی، جن میں مولانا قاضی عبدالصمد بن ابوالحسن چریا کوٹی متوفی ۱۱۷۱ھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند میں ان کے تذکرے میں تصریح ہے:

''یگانۂ آفاق حافظ ابواسحاق از تلامذۂ اوست''[1]

قاضی عبدالصمد چریا کوٹی نے دہلی کے علماء و مشائخ سے تعلیم حاصل کی تھی اور محمد شاہ بادشاہ نے ان کو چریا کوٹ اور اطراف و جوانب کا قاضی مقرر کیا تھا۔ نزہۃ الخواطر میں ہے کہ:

"وحفظ القرآن وقرء العلم علی ابیہ وعلیٰ غیرہ من الاساتذہ"[2]	شاہ ابواسحاق نے قرآن مجید حفظ کر کے اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے پڑھا۔

''سیرت البخاری'' کے حاشیہ میں اور ''تراجم علمائے اہل حدیث'' میں شاہ صاحب کے اساتذہ و شیوخ میں مولانا شیخ محمد ناصح کا نام بھی درج ہے جو حضرت مولانا فاخر کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان کے اساتذہ و شیوخ میں مولانا شیخ محمد فاخر بن محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی زائر الہ آبادی متوفی ۱۱۶۴ھ بڑے مقام و مرتبہ کے عالم ہیں۔ شاہ ابواسحاق صاحب نے اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر الہ آباد کا سفر کیا اور مولانا محمد فاخر سے تکمیل کر کے سند فراغ حاصل کی اور ان ہی کے طور و طریق پر عملی اور دینی زندگی بسر کی۔ مولانا فاخر اپنے زمانے کے زبردست محدث تھے۔ اپنے چچا شیخ محمد افضل اور بھائی شیخ محمد طاہر سے کتب درسیہ کی تکمیل کی اور اپنے والد شیخ محمد یحییٰ سے فیضیاب ہو کر ۲۲ رسال کی عمر میں ان کے خلیفہ ہوئے۔ ۱۱۴۹ھ میں حرمین شریفین میں حاضری کے

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔ ص:۵ د ص:۱۲۱ اس میں غلطی سے محمد اسحاق درج ہے۔

[2] نزہۃ الخواطر۔ ج:۷۔ ص:۸۔ حاشیہ سیرۃ البخاری۔ ص:۳۸۔ تراجم علمائے اہل حدیث۔ ص:۳۸۲۔

موقع پر شیخ محمد حیات سندھی مدنی متوفی ۱۱۶۳ھ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ پڑھ کر اجازت عامہ کی سند لی۔ اتباعِ سنت کا سخت اہتمام کرتے تھے۔ فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان کے مالک تھے۔ کتاب وسنت اور اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے۔ عمل بالحدیث پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ ان کے تلمیذ رشید شاہ ابواسحاق پر یہی رنگ چھایا تھا۔ شاہ صاحب علم وعمل کی جامعیت میں اپنی مثال آپ تھے، زہد وتقویٰ اور جادۂ شریعت ان کا شعار تھا۔ تذکرۂ علمائے ہند میں ہے:

''مظہر محاسن اخلاق شاہ ابواسحاق ذات شریفش نادر روزگار مُذَکِّرِ شیم صحابۂ کبار بود۔ زہد وتقویٰ شعارش واحراز اسرار شریعت وثارش افتاد۔ در تصحیح احادیث نبویہ علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ ملکۂ وہبی داشت۔ وتعلیم علوم ظاہر وباطن پرداخت۔ دور مواظبت سنت سنیہ اند کے تغافل نمی ورزید۔ درامر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر صغیر وکبیر وغنی وفقیر را یکساں می دید'' [1]	شاہ ابواسحاق صاحب محاسن اخلاق کے مظہر تھے۔ ان کی ذات نادرۂ روزگار تھی اور اس سے صحابۂ کبار کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ زہد وتقویٰ اور اسرارِ شریعت ان کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ احادیث کی تصحیح میں وہبی ملکہ رکھتے تھے۔ ظاہری اور باطنی علوم کی تعلیم سے مزین تھے۔ پابندیِ سنت میں ذرا بھی غفلت نہیں کرتے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی چھوٹے بڑے اور امیر وفقیر کی تمیز نہیں کرتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں ایک رسالہ عربی زبان میں نور العینین فی اثبات

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔ ص:۵۔

رفع الیدین ہے۔اس کا قلمی نسخہ پٹنہ میں مولانا محمد سعید مغل پوری کے کتب خانے میں تھا[1] اور ایک روایت کے مطابق مولانا شمس الحق ڈیانویؒ کے کتب خانے میں تھا۔بعض مصنّفین نے اس رسالہ سے شاہ ابواسحاق صاحب کے الفاظ نقل کیے ہیں:

"وقلت في ذالك لما اتبعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لم ابالِ نعمان والسفيان والزهری"۔	حدیث کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرلی تو پھر مجھے امام ابوحنیفہ نعمان، امام سفیان امام زہری کی پرواہ نہیں ہے۔

آپ پر یہ رنگ مولانا فاخر کی صحبت اور ان کی توجہ سے غالب تھا۔قرآن کے بعد صحیح بخاری اصح الکتب قرار دے کر اس سے بہت زیادہ اعتنا فرماتے تھے۔علم روایت کے ساتھ علم درایت میں بھی خداداد ملکہ کے مالک تھے۔

شاہ ابواسحاق صاحب مولانا فاخر کی خدمت وصحبت کے بعد لہرا آئے اور اپنے والد ماجد سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے ان کے جانشین ہوئے اور مدت العمر یہیں رہ کر تعلیم وارشاد میں مشغول رہے۔کسی روایت سے ان کا باہر جانا معلوم نہیں ہوتا۔آپ کے مدرسہ کی جگہ ماضی قریب تک لہرا میں مدرسہ کے نام سے مشہور تھی۔ جہاں ایک زمانے میں علم ومعرفت کا فیض جاری تھا اور تشنگان علم وہاں آکر سیراب ہوتے تھے۔

نزہۃ الخواطر میں ہے:

"اخذ عنه خلق كثير"[2]	ایک جماعت کثیر نے آپ سے کسب علم وفضل کیا۔

ان میں مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی متوفی ۱۱۷۲ھ کا نام سرفہرست ہے۔

---

[1] حاشیہ سیرۃ البخاری۔ص:۳۸۔

[2] نزہۃ الخواطر۔ج:۷۔ص:۹۔

تذکرہ علمائے ہند میں ان کے ذکر میں ہے:

''واعمال مسلوکہ درویشاں از برگزیدۂ آفاق حضرت حافظ ابواسحاق ساکن بھیرا گرفتہ''۔	بزرگوں کے صوفیانہ اعمال واذکار حافظ ابواسحاق لہراوی سے حاصل کیے۔

نیز نزہۃ الخواطر میں یہی لکھا ہے:

''ولازم الشیخ ابا اسحاق بن ابی الغوث البیروی اخذ عنہ الاذکار والاشغال''[۱]	مولانا احمد علی نے شیخ ابواسحاق کی خدمت میں رہ کر ان سے اذکار واشغال کی تعلیم تلقین حاصل کی۔

آپ کے مبارکپوری تلامذہ میں تین بزرگوں کے نام اور حالات معلوم ہو سکے ہیں۔ مولوی حکیم امان اللہ صاحب متوفی ۱۲۹۹ھ مولوی دھنا سے صاحب اور مولوی نرہو صاحب، ان کے حالات بعد میں آئیں گے۔ شاہ ابواسحاق صاحب نے ۱۲۳۴ھ میں غازیپور میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

شیخ غلام رسول مصطفیٰ آبادیؒ

ان کے بارے میں شیخ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں لکھا ہے:

''شیخ المشائخ شیخ غلام رسول ساکن مصطفیٰ آباد مردے بود عالی نسب، در روزگار خود بہ حسب ونسب سر حلقۂ اعیان	شیخ المشائخ شیخ غلام رسول ساکن مصطفیٰ آباد عالی نسب بزرگ تھے۔ اپنے زمانے میں حسب ونسب کے اعتبار سے اعیان

[۱] نزہۃ الخواطر۔ ج:۷۔ ص:۴۴۔

واکابر بود۔ در رمز و اشاراتِ	واکابر کے پیشوا تھے۔ حضرات
صوفیۂ اہل صفا دل بستگی تام	صوفیہ کے اشارات ورموز سے
داشت۔''[1]	پوری دلچسپی رکھتے تھے۔

اس بیان سے شیخ غلام رسول کی مشیخت و بزرگی پورے طور سے معلوم ہوتی ہے۔

وہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے خسر تھے اور ۱۱۲۵ھ کے بعد ان کی دوسری شادی ان ہی کی دختر سے ہوئی تھی۔ مناقب غوثی میں ہے:

''دخترِ آن شیخ عالی مقام در	ان محترم کی دختر میرے مرشد
سلک مرشد حقیقی دامت برکاتہٗ	شاہ ابوالغوث کے نکاح میں
منسلک کردند''۔	تھیں۔ (قمر)

غالبًا شیخ غلام رسول شاہ ابواسحاق صاحب کے نانا تھے۔ بارہویں صدی کی ابتدا میں مصطفیٰ آباد میں تین بھائیوں کے نام ملتے ہیں، ایک شیخ غلامی نبی جو مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی کے جد اعلیٰ ہیں اور دوسرے شیخ غلام امام جو یہاں کے دوسرے خاندان کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شیخ غلام رسول ان کے تیسرے بھائی ہیں۔

رمضان علی شاہ شیعی

شیعہ روایت کے مطابق پونے دو سو سال پہلے مولانا رمضان علی پنجاب کے علاقے سے مبارکپور آئے، یہ نوابی اودھ کا زمانہ تھا۔ اثنا عشری مذہب کے عالم و معلم اور مبلغ تھے۔ انھوں نے محلہ شاہ محمد پور کے باہر اتر جانب ایک امامباڑہ تعمیر کیا، جو اب مکان کے نام سے مشہور ہے۔

اس امامباڑے کی تعمیر بزمانہ نواب شجاع الدولہ ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوئی اور اس کے

---

[1] مناقب غوثی باب ہشتم۔

اندر پنجہ و چبوترہ نواب سعادت علی خاں پسر شجاع الدولہ کے دور میں ۱۲۱۶ھ میں تعمیر ہوا۔ اماباڑہ کے برآمدے میں اندرونی بڑی محراب کے دائیں بائیں دونوں جانب مچھلی کی تصویر بنی ہوئی ہے، جو نوابانِ اودھ کا سرکاری نشان ہے اور کلمۂ شہادت کے بعد یہ عبارتیں درج ہیں:

''علی ولی الله علی وصی رسول الله، لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار، لااله الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین، یا ابا عبدالله یا لیتنی کنت معهم فافوز فوزاً عظیما، بلغ العلیٰ (الخ) ناد علیا مظهر العجائب والغرائب۔ انا مدینة العلم وعلی بابها''۔

اسی محراب کے اوپر ۱۲۰۹ھ درج ہے اور اندر شمال مغرب کے گوشے میں پنجہ اور اس کا چبوترہ ہے، جس پر ۱۲۱۶ھ اور یہ اشعار درج ہیں:

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسان تو نیست — شیر خوانِ کرم کیست کہ مہمان تو نیست
چہ دیر است اے شفیع روز محشر — ہمیں پنجہ ہمیں است حوض کوثر
مقصد کون ومکان را.......... — وکرم عین عنایت اینجا ست
مطلب ہر دو جہاں حاجت دل خواہ ازو — پنجۂ شیر خدا شاہ ولایت اینجاست

یہی اماباڑہ شیخ رمضان علی ۱۱ /اپریل ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) کی جنگ میں مسلمانوں کا قلعہ بند مورچہ تھا، جس میں آگ لگائی گئی تھی۔ اسی اماباڑے کے بارے میں شیخ حسن علی مبارکپوری ''واقعات وحادثات مبارک پور'' میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ایک باغ پورہ دلہن میں واقع ہے، اسی باغ دل کشا گلزار جان فزا میں ایک اماباڑہ تعمیر کردہ رمضان شاہ مرحوم معروف بمکان رمضان شاہ ہے

اور اس قصبہ میں کیا بلکہ دوسرے قصبہ وشہر میں جو اس ضلع میں پانچ سات کوس تک گردونواح میں واقع ہیں، ایسی ساخت و مستحکم عمارت نہیں ہے۔ ایسے طغریٰ و رباعیاں اور اشعار اس میں رمضان شاہ مرحوم نے کندہ کرائے اور رنگ آمیزی کرائی ہے کہ جس کا جواب نہیں۔ اس کی شان میں یہ قول راست ودرست ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
چنیں است وچنین است وچنیں است[۱]

۱۲۱۶ھ میں امامباڑہ و پنجہ کی تعمیر مکمل ہوئی اور ۱۲۲۹ھ میں رمضان شاہ کو مرحوم لکھا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی اسی درمیان میں فوت ہوئے۔

مولوی نثار علی اسماعیلی سرائمیری شہیدؒ

مولوی نثار علی صاحب امامباڑہ رمضان شاہ کے مدرسہ میں درس دیتے تھے اور ۱۱/اپریل ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) کی جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئے۔ مولوی علی حسن نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں ان کے متعلق نادر معلومات جمع کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس امامباڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان بھی تھے اور اسی میں ایک بڑے متبحر عالم، فاضلِ بے مثل بنام مولوی نثار علی مرحوم ساکن قصبہ سرائے میر برادر چچازاد شیخ جان علی صاحب مرحوم خوش نویس، علومِ عربی وفارسی کا درس دیتے تھے اور اسی امامباڑے میں قیام پزیر تھے۔ انھوں نے ایسی شجاعت و دلیری کی کہ فقط تن تنہا بیس پچیس دشمنوں کو جو اُن میں بڑے جنگی اور بہادری میں مشہور تھے، فی النار کیا۔ ان سبھوں نے دیکھا کہ ہم کسی طرح شمشیر زنی میں عہدہ برآنہ ہوسکیں گے تو پشت کی جانب جا کر گولی

---

۱ واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۱۷۔ ۱۸۔

ماری۔ باوصف گولی لگنے کے دو جوان قوی کو گرتے گرتے مارا۔ جب مولوی نثار علی نے اپنی جان کو فی سبیل اللہ نثار کیا، تب بہت سے دشمن دوڑے کہ ان کی سیف لے لیویں اور وہ بہت عمدہ، بیش قیمت اور بے مثل زمانہ تھی، جانا کہ وہ جان بحق تسلیم ہوئے، دوڑ کر چاہا کہ ہاتھ سے چھین لیں، پڑے ہی پڑے باوصف ضعف اور پریشان حالی کے ایسے ضرب لگائی کہ ان دونوں کا پاؤں کٹ گیا اور وہیں ختم ہو گئے۔ بعدہٗ ان کے ہمراہیوں نے کہ وہ دس پندرہ آدمی تھے آ کر مولوی صاحب مرحوم کی پشت پر چڑھ کر تلوار اور برچھی سے مجروح کر کے اس تیغ کو لے لیا۔ چناں چہ وہ شمشیر بے نظیر ایک زمیندار کے پاس ایامِ غدر تک موجود تھی۔[1]

مولوی نثار علی صاحب کا مزار امامباڑہ رمضان شاہ کے صحن میں دیگر شہداء کے مزارات کے ساتھ ابھی جلدی تک نمایاں تھا۔ مولوی صاحب ابتدا میں اثنا عشری مذہب کے عالم و معلم تھے۔ بعد میں اسماعیلی فرقہ کے داعی اور مبلغ بن گئے اور ان کی وجہ سے مبارکپور میں اسماعیلی فرقہ کی ابتدا ہوئی۔ اس کی تفصیل جیسا کہ راقم سے ملا رحمت علی صاحب اسماعیلی مبارکپوری مرحوم نے بیان کیا یہ ہے کہ ملا نثار علی صاحب حج کے ارادے سے مبارکپور سے سورت گئے، جہاں سے اس زمانے میں حجاج کے جہاز جدہ جایا کرتے تھے۔ ملا نثار علی جہاز کے انتظار میں کچھ دنوں سورت میں ٹھہرے، ایک دن وہ شہر کے باہر ایک باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اسماعیلی مذہب کے ایک مکاسر نے ان کو دیکھا اور سمجھا کہ یہ پڑھے لکھے آدمی ہیں، اس زمانے میں اسماعیلی فرقے کے داؤدی بوہروں کے پیشوا اور امام مستقل طور سے سورت میں رہتے تھے۔ اس مکاسر نے ملا نثار علی سے بات چیت کی اور اسماعیلی دعوت کی ابتدائی باتیں بتا کر چند سوالات کیے جن کے جوابات کے لیے اسماعیلی دعوت پر لبیک کہنا ضروری بتایا۔ اس کے بعد وہ ملا نثار علی کو اپنے امام اور داعی مطلق کی خدمت میں لے گیا۔

---

[1] واقعات و حادثات مبارکپور ص ۱۷۔۱۸۔

جہاں ملا نثار علی چند دنوں قیام کر کے اسماعیلی مذہب کے پیرو بن گئے۔ اب وہ اثنا عشری شیعہ کے بجائے اسماعیلی شیعہ تھے۔ امام اور داعی مطلق نے ان سے اپنی امامت و دعوت کا میثاق لیا اور یہ کہہ کر مبارک پور واپسی کا حکم دیا کہ تمہارا حج یہی ہے کہ تم اپنے وطن جا کر اسماعیلی دعوت عام کرو اور مرکز سے تعلق قائم رکھو۔ چناں چہ ملا نثار علی سورت ہی سے مبارک پور واپس چلے آئے اور یہاں اسماعیلی دعوت کی بنیاد رکھی۔ جس سے متاثر ہو کر اثنا عشری شیعہ کے کچھ خاندان اسماعیلی ہو گئے۔ ملا صاحب نے اس کے بعد مبارک پور میں داعی مطلق کی طرف سے عامل کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے مذہبی مرکز سورت سے تعلق قائم رکھا۔ غالباً ملا نثار علی صاحب کو اسماعیلی دعوت دینے والے ملا سیف الدین عبدالعلی متوفی ۱۲۲۴ھ تھے، جو اپنے زمانے میں گجرات میں اسماعیلی مذہب کے زبردست داعی و مبلغ تھے۔

اسماعیلی فرقہ کے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؒ کے بعد امامت ان کے صاحبزادے اسماعیل کو ملی اور امام جعفر نے ان کی طفلی ہی میں ان پر امامت کی نص کر دی تھی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل بن جعفر کی طرف امامت منتقل ہو گئی، جو ساتویں امام تھے۔ اس کے بعد اسماعیلی ائمہ مستور ہو گئے۔ جو خود چھپ کر چلتے پھرتے ہیں اور ان کے دعاۃ ظاہر رہ کر ان کی طرف سے کام کرتے ہیں۔ چناں چہ آج کل ستر کا زمانہ چل رہا ہے اور جب ظہور کا زمانہ آجائے گا تو وہ ظاہر ہو کر دعوت کو عام کریں گے۔ ان کو باطنیہ بھی کہتے ہیں، کیوں کہ یہ لوگ تاویل پر عقیدہ رکھتے ہیں اور ہر ظاہر کا باطن مانتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کی ظاہری صورتیں ان کی باطنی صورتوں سے مختلف ہیں۔ تاویل کا علم ائمہ کے پاس ہے اور وہی ظاہر کے باطن کو سمجھتے ہیں۔

مولوی محمد نشان شہید

مولوی محمد نشان صاحب باہر کے رہنے والے تھے۔ غالباً امامباڑہ رمضان علی شاہ کے مدرسے میں مدرّس تھے۔ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) کی جنگ میں شہید ہوئے۔ اہل مبارکپور نے گورکھپور کی عدالت میں جو عرضداشت پیش کی تھی، اس میں شہداء کی فہرست میں پہلا نام انہی کا ہے:

''در امامباڑہ رمضان علی شاہ	غنڈے امامباڑہ رمضان علی شاہ
احداث کردہ ...... درآمدند	کو نجس کر کے گھس آئے اور
مسمیان مولوی محمد نشان	مسمیان مولوی محمد نشان
ومیر معظم حسین کہ مسافران	ومیر معظم حسین کہ یہ لوگ مسافر
بودند ..... وغیرہ کسان کہ در	تھے، ان کے علاوہ دوسرے
صحن امامباڑہ بودند آں	افراد کو جو صحن امامباڑہ میں تھے،
متمردان بد شعار ہمہ را بقتل	اُن غنڈوں نے اُن تمام کو قتل
رسانیدند''۔	کر ڈالا۔

اس تحریری بیان۔ کے علاوہ ایک زبانی روایت بھی ان کی شہادت کے بارے میں ہے، جس میں ان کا نام مولوی ناس بتایا گیا ہے، وہ یہ کہ جب بلوائی دوسری بار شکست کھا کر بھاگے تو قصبہ کے بہادروں نے قسم دے کر ان کو للکارا، بلوائی پلٹ کر سہ بارہ حملہ آور ہو گئے اور رسولپور کے متصل موضع معانی کے ایک شخص نے مولوی ناس صاحب کو پیچھے سے زخم کاری پہنچایا، جس سے وہ یہ کہتے ہوئے زمین پر گرے کہ تم نے دھوکے سے مارا ہے، تم کوڑھی ہو کر مرو گے۔ چناں چہ وہ آخر میں کوڑھی ہو کر مرا۔ اس شہید کی بد دعا کا اثر ابھی تک یوں ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی نہ کوئی شخص اس مرض میں مبتلا

رہتا ہے۔ یہ روایت مولانا عبدالباقی صاحب رسولپوری نے مجھ سے بیان کی ہے۔ ان کا مزار بھی امامباڑہ رمضان شاہ کے صحن میں دیگر مزارات کے ساتھ ہے، مگر اس کا نشان باقی نہیں رہا۔

میر معظم حسین شہیدؒ

میر معظم حسین بھی غالبًا امامباڑہ رمضان علی شاہ کے مدرسہ میں درس دیتے تھے اور کسی دوسرے مقام کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۱۳ء کی جنگ میں وہ بھی شہید ہوئے اور ان کی قبر دیگر شہداء کی قبروں کے ساتھ امامباڑہ مذکور کے صحن میں تھی، جس کا نشان اب باقی نہیں رہا۔ جو عرضداشت گورکھپور کی عدالت میں اہل قصبہ کی طرف سے پیش کی گئی تھی، ان میں ان کا نام ہے اور یہ کی وہ بھی مولوی محمد نشان کی طرح قصبہ کے باہر سے آئے تھے۔

''ومسمیان مولوی محمد نشان	اور مسمیان مولوی نشان
ومیر معظم حسین مسافران	ومیر معظم حسین مسافر تھے اور
کہ وارد بودند ومحمدی	مبارکپور آئے تھے اور محمدی
وروشن ویونس وبیچو وحسام	وروشن و یونس و بیچو و حسام
وبھکن مع دو پسرش وموہن	وبھکن اپنے دوبیٹوں کے
وقمن وبھوج و دبیر ومنور	ساتھ، موہن وقمن و بھوج
وضیاؤ و نصرو و لالن وسگر	ودبیر ومنور وضیاؤ ونصرو ولالن
وحجام وہاشم وفاضل وبہادر	وسگر و حجام و ہاشم وفاضل
وغیرہ کہ در صحن امامباڑہ	وبہادر وغیرہ کہ یہ لوگ صحن
بودند آن متمردان بدشعار	امامباڑہ میں تھے۔ ان غنڈوں

ہمہ را بہ قتل رسانیدند و جمیع	نے ان سب کو قتل کر ڈالا اور تمام
اسباب قیمتی مبالغ خطیرہ	قیمتی سامان اور خطیرہ رقم لوٹ
بغارت بروند"۔	لے گئے۔ (قمر)

شیخ چراغ علی شیعی

شیخ چراغ علی اثنا عشری شیعہ تھے۔ شیعہ روایت کے مطابق نوابی اودھ کے دور میں مبارکپور آئے اور یہاں تبلیغ و تعلیم میں مشغول رہ کر قصبہ کے پچھّم طرف روضہ وامامباڑہ بنوایا، جو شاہ کا پنجہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں دو روضے ہیں، ایک کے اندر ایک پتھر نصب ہے جس پر پنجہ بنا ہوا ہے۔ مولوی علی حسن فارقی ایک حادثہ کے ضمن میں اس روضہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ قصبہ مبارکپور میں جانب پچھّم بستی سے باہر ایک احاطہ بہت خوش قطع ہے اور اس کے اندر روضۂ مبارک معروف بہ پنجۂ شریف واقع ہے۔ ایسی دلچسپ جگہ اس قصبہ میں دوسری نہیں ہے[1] اس احاطہ میں اہل سنت کی قدیم عیدگاہ اور قبرستان واقع ہے۔

شیخ سیف علی شیعی

شیعہ روایت کے مطابق شیخ سیف علی بھی پونے دو سو سال قبل نوابی اودھ کے دور میں مبارکپور آئے اور اپنے مذہب کی تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہوئے۔ رمضان علی شاہ کے معاصر تھے اور انھوں نے امامباڑہ رمضان شاہ کے بالمقابل جنوب میں اپنا امامباڑہ تعمیر کیا تھا، مگر وہ منہدم ہو گیا۔ اس کے ڈھیر اور دیواروں کے نشان ابھی تک موجود ہیں۔ امامباڑہ رمضان شاہ ۱۲۰۹ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ غالباً اسی زمانے میں یا اس کے بعد ہی سیف علی شاہ نے اس کے قریب اپنا امامباڑہ تعمیر کرایا ہوگا۔

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۳۳۔

شیخ علی شہیدؒ نائب قاضی مبارک پور

راقم کے جد اعلیٰ حضرت شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ قصبہ کے قدیم رئیس اور نائب قاضی تھے۔ ان کے آبا واجداد مانک پور کڑا کے رہنے والے تھے۔ بانی مبارکپور راجہ سید مبارک مانک پوری متوفی ۹۶۵ھ کے ہمراہ ان کا خاندان وہاں سے منتقل ہوکر مبارکپور میں مستقل طور سے آباد ہوگیا اور اسی زمانے سے یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ اس خاندان میں رہا۔ شیخ علی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان میں علمی وروحانی دولت کے ساتھ دنیاوی دولت وثروت اور مالداری بھی زمانۂ قدیم سے چلی آتی تھی۔ ان کی پیدائش ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۴۰ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ خاندانی خوشحالی، مالداری اور نیابت قضا کے عہدے کے ساتھ پہلوانی اور شہ زوری میں مشہور زمانہ تھے اور اطراف وجوانب میں اس فن کے استاد مانے جاتے تھے۔ زہد وتقویٰ اور ذکر وشغل میں بہت آگے تھے اوراد ووظائف اور معمولات پر آخری وقت تک کاربند رہے۔ انھوں نے نہایت کامیاب زندگی بسر کی۔ دارالقضا محمد آباد گوہنہ کی طرف سے نائب قاضی تھے اور قصبہ واطراف قصبہ کے جملہ شرعی امور ومعاملات ان کی ذمہ داری میں دیے گئے تھے اور وہ اپنے اسلاف کی طرح اس خدمت کو بوجوہ احسن انجام دیتے تھے۔ نوابان اودھ کے بعد انگریزی عملداری کا ابتدائی دور دیکھا تھا۔ شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے معاصر تھے غالب گمان ہے کہ دونوں بزرگوں میں علمی ودینی تعلقات استوار تھے۔ اسّی سال سے زائد کی عمر میں پہلوانی اور اکھاڑہ کی رقابت میں شہید کردیے گئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ مقامی اصطلاح میں ''علی شاہی'' کے نام سے مشہور ہے۔ مولوی علی حسن فاروقی نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں یہاں کا چھٹا حادثہ ''علی شاہی'' کے عنوان سے بیان کیا ہے، جس میں ان کی شہادت کی تفصیل درج ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

مولوی علی حسن بن شیخ غلام مرتضٰی فاروقی نے لکھا ہے حادثۂ ششم قصبہ مبارکپور کہ معروف بہ علی شاہی ہے۔ صورتِ حال اس واقعہ کی اس طور پر ہے کہ مسمی میاں علی ایک شخص سکنائے قصبہ مبارکپور سے، رئیس قدیم ونائب قاضی اور خلیفہ اکھاڑہ قدم رسول محلّہ پورہ رانی کے کہ عمراُن کی اسّی برس کی تھی۔ باوجود اس سن کے قُویٰ ازبس قوِی کہ جوان لوگ کشتی میں عہدہ برآنہ ہوتے۔ ایسے کشتی باز کہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے شاگردین ایسے نامی گرامی ہوگئے ہیں کہ اکثر ہندوستانی ریاستوں میں ان کا نام مشہور ہے۔ سواُن کی کیفیت یہ ہوئی کہ ایک روز اپنے مکان میں بیٹھے بعد نماز عصر کے وظیفہ پڑھ رہے تھے اور اسی مکان میں ایک دوسرا شخص کرایہ دار رہتا تھا اور اس کرایہ دار کا داماد واسطے رخصتی کرانے اپنی منکوحہ کے آیا تھا اور کرایہ دار کی منشا تھی کہ ابھی لڑکی کو دس پندرہ روز کے بعد رخصت کروں گا۔ بایں وجہ کہ رخصتی کا سامان ولوازمہ موجود نہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میری زوجہ کو میرا خسر رخصت نہیں کرتا، تب وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان پر پورہ خواجہ میں گیا۔ اس محلّہ کے ایک شخص مسمی چھجو ڈاڑھ ساکن بلدہ بنارس کہ اکثر لوگوں میں ناحق فساد کرادیتا تھا۔ بایں وجہ ''ڈاڑھ'' کے لقب سے مشہور تھا۔ اس مفسد نے کہا کہ چلو ہم دو چار آدمی چلتے ہیں، تم اپنی منکوحہ کو جس طور سے ممکن ہو رخصت کرا کے لے آؤ۔ غرض وہ چار پانچ مفسد آمادۂ تکرار ہوکر آئے اور اس لڑکی والے سے ناحق حجت وتکرار کرنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مار پیٹ شروع ہوگئی، جب اس نے شور کیا تو میاں علی مرحوم وظیفہ سے اٹھ کران کم بختوں کو منع کرنے لگے کہ فوجداری نہ کرو۔ اس کہنے پر چھجو ڈاڑھ مذکور نے ان کو ایک طمانچہ ماردیا۔ یہ بے چارے تو ضعیف ہی تھے اور آنکھ سے بھی کم معلوم ہوتا تھا، ہٹ آئے اور وہ سب بھی چلے گئے، لیکن جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ پورہ خواجہ کے بدمعاشوں نے میاں جی علی کو مارا ہے، پھر تو یہ شور وغوغا ہوا کہ الامان، ان کے شاگردوں نے جو کہ روضہ کے اکھاڑے کے کشتی باز تھے جمع ہوئے اور قصبہ ہذا میں پانچ اکھاڑے نامی تھے، مگر ان میں قدم رسول کا اکھاڑا ہمیشہ سے سب پر بالا رہا اور میاں جی علی کے

باعث ان کے شاگردوں نے اس اکھاڑے کو اور بھی نامی گرامی بنا دیا اور صدہا شاگرد تھے۔ جن میں سے غوثی خلیفہ اور حاجی خوشحال اور دوست خلیفہ اور واحد خلیفہ اور ولی اور عالم ان لوگوں نے فن کشتی میں ایسا نام پیدا کیا کہ ان کی پشت کو حالت کشتی میں کسی نے نہ لگایا اور نہ ان کے مقابلہ میں کوئی جوان کھڑا ہوا۔ غرض کہ ان سب نامی گرامی شاگردوں نے یہ صلاح ٹھہرائی کہ ابھی چل کے پورہ خواجہ کو لوٹ لو، میاں جی نے ہر چند حیلہ حوالہ کیا کہ مجھ کو کسی نے نہیں مارا ہے، جانے دو عملداری انگریز کی ہے، سب کے سب ہم لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے، مگر شدنی کہاں ٹلتی ہے؟ وہ وقت قریب نماز مغرب کا تھا، اتنے میں کسی نے کہا کہ اس میں مردی نہیں، اس دم صبر کریں اور پورہ خواجہ میں ہم کہلا بھیجیں کہ تم ہوشیار رہنا۔ ہم علی الصباح تمہارے محلے میں آویں گے۔ اگر تمہارے محال کے ایک شخص نے ہمارے خلیفہ کو طمانچہ مارا ہے تو ہم تمہارے خلیفہ کو مع شاگردوں کے آ کر غارت کریں گے، خبردار رہنا، اطلاعاً خبر دی جاتی ہے، خبر بھیج کر اپنے اپنے مکان پر چلے گئے۔ صبح کے وقت جتنے شاگرد پورہ رانی اور پورہ خضر وغیرہ کے تھے۔ سب کے سب لاٹھی اور لوہ بندا لے کر غریب شاہ کے باڑے میں جو پورہ خضر میں واقع ہے جمع ہوئے اور پورہ خواجہ میں خبر کروا دیا کہ ہم لوگ آتے ہیں خبردار رہنا۔ جب اسی محال کے لوگوں نے سنا تو وہاں کے لوگوں نے باخود باصلاح و مشورہ کر کے مع ہتھیار سب کے سب جمع ہوئے۔

حاصل کلام ٹھاکر دوارہ کے پورب طرف ایک باغ تھا اور اس میں ایک قبرستان ہے، جب وہاں پہنچے تو مقابلہ ہوا۔ اکھاڑہ قدم رسول کے جوانوں کے پہنچتے ہی ایک شخص غلام نام نے ایک آواز بندوق کی سر کی، اس سے ایک شخص گوپالی نام کے ہاتھ پر گولی لگی، مع سرین کے ہاتھ مجروح ہوا اور سرین توڑ کر وہ گولی نکل گئی، قریب تھا کہ زمین پر گر پڑے، اتنے میں دوسرے شخص نے اس کو پکڑ کر اس کے مکان پر پہنچا دیا۔ آفریں ہے اس کی ہمت پر کہ باوجود گولی لگنے کے برابر اس شخص کو تھامے ہوئے مکان پر چلا آیا اور وہاں معرکہ میں دو آواز اور بھی پورہ خواجہ کے بندوقچیوں نے کی۔ مگر وہ دونوں آوازیں

خالی تھیں، واسطے ڈرانے کے سرہوئیں۔ جب کہ میاں جی علی کی طرف کے جوانوں نے دیکھا کہ ان سبھوں نے بندوق، تلوار اور گڑانسا مہیا کیا ہے، تب دو تین جوانوں کو جن کا مکان معرکہ سے قریب تھا دوڑایا کہ تلوار اور ہتھیار آہنی لاؤ اور لاٹھی رکھو، وہ سب تلوار لائے اور خوب شجاعت سے مقابلہ کیا۔ منجملہ جوانوں کے مسمی خوشحال حاجی اور واحد خلیفہ اور لالو اور کوئی حجام نے ایسی دادِ شجاعت دی اور ایسی جوانمردی سے لڑے کہ باوصف موجودگی تلوار اور بندوق کے پورہ خواجہ کے سب کے سب گریز کر گئے۔ مگر ایک شخص مسمی غلام محمد ساکن شہر بنارس کو وہ چند روز سے اس محال میں رہتا تھا، میدان جنگ میں ثابت قدم رہا۔ پانچ چار جوانوں سے اب مقابلہ کیا، لیکن بالآخر پیر اس کا ایک قبر میں کہ وہ خالی تھی پھسل گیا اور خوشحال حاجی نے موقع پا کر تلوار ماری اور وہ مر گیا۔

ادھر تو لوگ لڑنے میں مصروف تھے اور ادھر یہ کیفیت ہوئی کہ میاں جی علی جو خلیفہ اکھاڑہ تھے۔ شاگردوں نے ان کو مکان پر بٹھا کر اور تاکید کر کے آئے تھے کہ آپ مکان سے ہرگز باہر نہ نکلیں، مگر چوں کہ ان کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا، کیوں کر ٹھہرتے، وہ بھی آہستہ آہستہ پیچھے سے چلے آئے اور قریب ٹھاکر دوارہ کے سڑک پر جب پہنچے تو ایک شخص واحد ولد روشن نے تنہا پا کر ایک گڑانسا سے ان کا کام تمام کیا اور دوسرے شخص نے تلوار بھی ماری۔ پھر ان کے مارے جانے پر اور بھی آتش غضب کی برافروختہ ہوئی اور جس وقت میاں جی مرحوم کے شاگردوں نے سنا کہ ہمارے خلیفہ کو مار ڈالا، تب کسی کو صبر نہ رہا اور سب کے سب علی علی کر کے خواجہ پورہ کی طرف بڑھے تا کہ قاتل کو قتل کر دیں کہ ناگاہ میر صاحب علی خاں داروغہ قصبہ مبارکپور ساکن جونپور نے مع برقنداز پہنچ کر اکثروں کو گرفتار کیا اور میاں جی علی اور غلام محمد کی لاشوں کو صاحب کلکٹر بہادر ضلع اعظم گڑھ کے ملاحظہ کو روانہ کیا۔ بعد میں یہ مقدمہ حضور میں جناب صاحب جج بہادر ضلع گورکھپور کے سپرد ہوا، کیوں کہ ججی اس وقت تک اعظم گڑھ میں نہ تھی۔ صرف کلکٹری تھی لہٰذا بعد تحقیقات واقعی کے چھ شخص میاں جی علی کے شاگردوں میں اور دو شخص

پورہ خواجہ کے رہنے والوں میں بہ میعاد سات سات برس کے مقید ہوئے۔ میاں جی علی کی طرف کے زیادہ آدمی قید ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے اپنے محلے سے چڑھ کر دوسرے کے محلے میں فوجداری کی تھی۔ بعدہٗ خوشحال حاجی اور دوست محمد خلیفہ ضلع ہزاری باغ کے جیل خانے میں رہ کر اسی حالت میں قضا کیا اور باقی لوگ میعاد پوری کر کے اپنے وطن کو واپس آئے[1]

اس زمانے میں مبارکپور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں تھا۔ ۱۰؍ ۱۸۰۱ء و ۱۲۱۶ھ میں گورنر جنرل ولزلی (WELLESLY) اور نواب سعادت علی خاں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کی رو سے چکلہ اعظم گڑھ کے علاقے نوابی اودھ سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگئے تھے اور ۲۸؍دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) کو برطانوی حکومت نے اعظم گڑھ کو مستقل ضلع قرار دیا۔

قاضی علیؒ کی شہادت ۱۲۱۶ھ کے بعد ہوئی۔ اس زمانے میں اس خانوادے کا آبائی مکان راجہ صاحب کی مسجد کے پاس تھا اور شیخ علی وہیں رہتے تھے۔ ان کی تدفین آبائی قبرستان میں ہوئی، جو قصبہ کے دکھن جانب شیوالہ اور پوکھرا کے پورب لب سڑک تھا۔

شیخ امام بخش

شیخ امام بخش صاحب قاضی شیخ علی مرحوم کے صاحبزادے اور ان کے سچے جانشین تھے۔ زہد و تقویٰ اور اوراد و وظائف اور اشراق و تہجد کے پابند اور نیکی و شرافت میں مشہورِ زمانہ تھے۔ قصبہ کے نائب قاضی، جامع مسجد راجہ صاحب کے مستقل امام اور سکٹھی و مبارکپور کی عیدگاہ میں عیدین کے امام تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں عیدگاہ کے امام مقرر کیے گئے اور

[1] واقعات و حادثات مبارکپور۔ ص: ۲۴ تا ۲۸ و مآثر و معارف۔ ص: ۳۴۵ تا ۳۴۹۔

والد صاحب کی شہادت کے بعد ان کی جگہ نائب قاضی ہوئے۔ ۱۲۵۰ھ سے ۱۲۶۱ھ تک اس عہدے پر رہے، جب کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کے دو صاحبزادے جناب شیخ محمد رضا اور جناب شیخ حسام الدین دوسرے حلقوں کے نائب قاضی تھے۔ اسی درمیان میں آپ کے پوتے جناب شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بھی اس عہدے سے منسلک تھے۔ شاہ ابو اسحاق لہراوی متوفی ۱۲۳۴ھ کے معاصر تھے اور ان کے حلقۂ قضا میں گھبڑالہرا بھی شامل تھا۔ آپ کے زمانے میں دار القضا محمد آباد میں تین قاضی گزرے ہیں۔ مولانا قاضی محمد رؤف صاحب، مولانا قاضی محمد سلیم صاحب مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۶ھ اور مولانا قاضی محمد شاہ عالم صاحب۔ ان سب حضرات نے اپنی نیابت کی سندوں میں شیخ امام بخش کو ''دیانت آثار'' قرار دیا ہے اور ان کی خدمات پر خوشنودی ظاہر کی ہے۔ یہ تمام اسناد ہماری کتاب ''مآثر و معارف'' میں درج ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی دورِ حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء (۱۲۸۱ھ) تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے، جن کا انتخاب علماء کے گروہ سے کیا جاتا تھا، لیکن اس کے بعد منصب قضا منسوخ کر دیا گیا اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیے گئے۔ روضہ کی عیدگاہ کی امامت کی سند یہ ہے۔

سید ناصر علی ۱۲۰۰
مُہر

''نور بافان زمینداران وغیرہ	موضع سکٹھی کے انصاری
ساکنان موضع سکٹی بدانند	اور زمیندار مطلع ہوں کہ
چوں مسمی امام بخش رابعہدہ	امام بخش کو عیدین کی خطبہ
خطبہ خوانی در عیدین ثابت	خوانی کے عہدے پر مقرر
مقرر و مُفوّض نمودہ شد لازم کہ	و مفوض کیا گیا ہے۔

نام زدہ را مصوب و مستقیم دانستہ ہمراہان ایشاں بہ مسجد شریف حاضر شدہ نماز، خطبہ گزارند، دادا سازند کہ ایشان دین داری ظاہر شود و مشار الیہ را نیز باید کہ مردان را از حسن سلوک خود راضی شاکر دارد و بکار مرجوعہ خود حاضر و مستعد باشد، در صورت اختلاف امور دینداری دیگرے مقرر خواہد شد۔ دریں باب تاکید مزید بلیغ دانستہ حسب المسطور بعمل آرند۔''

(تحریر بتاریخ بست ہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۲۲۴ فصلی (۱۲۳۳ھ)۔

لازم ہے کہ امام بخش دار القضاء کی طرف سے مقرر کیا ہوا سمجھیں اور ان کے ساتھ مسجد میں حاضر ہو کر خطبۂ عیدین سنیں اور نمازِ عیدین ادا کریں۔ کیوں کہ ان کی پرہیزگاری نمایاں ہے اور امام بخش کو بھی چاہیے کہ لوگوں کو اپنے حسنِ سلوک سے خوش رکھیں اور اپنے سپرد کیے گئے کام کے لیے حاضر و مستعد رہیں۔ اس سلسلے میں مزید تاکید کو اہم سمجھتے ہوئے لکھنے کے مطابق عمل کریں۔ (قمر)

اس سند کی پشت پر یہ عبارت درج ہے:

''دوازدہ ماہ اگست ۱۸۱۷ء کاغذ ہذا بہ دست شاہ محمد ساکن مبارکپور''۔

آپ نیابتِ قضا کی جملہ ذمہ داریاں بوجوہ احسن انجام دیتے تھے۔ قضاۃ محمد آباد نے ان کے حالات دینداری و امانت داری خود دیکھ کر اور سن کر ان کی صلاحیت و قابلیت اور دیانت آثار ہونے کی تحریری شہادت دی۔ قصبہ اور ملحقات کے بارہ مقامات میں قضا کی نیابت فرماتے تھے۔ جس میں نکاح خوانی کے علاوہ ترویج رسوم دین، التزام سنت رسول، امامت جمعہ و جماعات، وعظ و تذکیر، مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا

فیصلہ، زن وشوئی کے معاملات وقضایا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام آپ کے سپرد تھے۔ جن کی ادائیگی میں یوں سعی بلیغ فرماتے تھے کہ دار القضا پوری طرح مطمئن رہتا تھا۔

ان کے زمانے میں جامع راجہ صاحب میں مسجد سے متعلق ایک واقعہ پیش آیا تھا، اس میں آپ کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔ مولوی علی حسن فاروقی نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں سولھواں واقعہ فخر الدین شاہی کے عنوان سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فخر الدین نامی ایک مفسد آدمی موضع آستانہ بھیرا سے آکر اپنی سسرال مبارکپور میں رہتا تھا۔ چوں کہ یہ آدمی بہت بے حیا اور بے شرم تھا، اس واسطے کوئی اس سے مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ بسبب خوفِ آبرو کے اس کی باتوں کو برداشت کر جاتے تھے۔ نام اس کا فخر الدین ہے، مگر اس کو مخرب الدین یا فخر الشیاطین کہنا بجا ہے۔ اس نے اپنی مصلحت کی بنا پر جامع مسجد کی سیڑھی پر سور کے بچے کا سر کاٹ کر رکھا، یہ حرکت اس نے فجر کی نماز کے وقت کرنا چاہی، مگر ہمت نہ پڑی اور نمازی فارغ ہوکر اپنے اپنے مکان چلے گئے اور میاں جی امام بخش کہ وہ اس مسجد کی نمازِ یومیہ کے امام تھے۔ ان کا معمول تھا کہ نمازِ صبح کے بعد درود اور وظیفہ میں رہتے تھے اور جب آفتاب طلوع ہوتا تھا تو نمازِ اشراق پڑھ کر مکان جاتے تھے۔ چناں چہ وہ نمازِ صبح کے بعد مسجد میں اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ جب آفتاب طلوع ہوا اور انھوں نے نمازِ اشراق ادا کی تو کہیں کچھ نہیں تھا اور وظیفہ سے فارغ ہوکر مکان کو چلے تو دیکھا کہ وہ مفسد فخر الدین مسجد کے دروازے پر ٹہل رہا ہے اور جب آپ اوٹ میں ہوئے تو وہ بچۂ خوک کو جلدی سے قدم بڑھا کر اس تختۂ سنگی کے نیچے رکھ کر چل دیا، جس پر نمازی دضو کرنے کے بعد پیر رکھ کر مسجد کے فرش پر جاتے تھے۔ دو گھڑی دن نکلنے تک کسی کو کچھ خبر نہیں لگ سکی تو خود اس نے دو چار شخصوں کو جمع کر کے شور مچایا۔ قصبہ میں ہنگامہ ہوا اور اعظم گڑھ سے گبن صاحب کلکٹر آیا اور مسلمانوں کے جوش وخروش کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ جاتے ہوئے

شاہ خادم علی زمیندار مبارکپور چک سکٹھی شیخ ولی محمد صاحب اور شیخ گدا حسین کو اپنے ساتھ لے جا کر حوالات میں ڈال دیا۔ اس وقت یہاں سید مبارک اشرف تھانیدار تھے۔ وہ تمام سرداران ومہتران وزمینداران مبارکپور کو جمع کر کے صلاح ومشورہ اور مفسد کی تلاش کرنے لگے اور معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس فخر الدین کی ہے۔ قوم کھٹک نے بھی بیان دیا کہ فلاں شخص سے فلاں شخص نے بچۂ خوک خریدا تھا اور اسے تین سال کی سزا ہوئی اور تھانیدار نے ایسا انتظام کیا کہ قصبہ وقوع فسادات سے محفوظ رہا۔[1]

یہ واقعہ حدود ۱۲۶۷ھ میں رونما ہوا۔ اس کے بعد شیخ امام بخش صاحب نے انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ آپ کے نام کی نیابت قضا کی چار سندیں ''مآثر ومعارف'' میں منقول ہیں۔

شیخ محمد رضاؒ

شیخ امام بخش بن شیخ علی کے دو صاحبزادے تھے۔ شیخ محمد رضا اور شیخ حسام الدین اور دونوں بھائی اپنے والد کی حیات ہی میں قصبہ اور ملحقات میں نیابتِ قضا کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ابتداء میں یہ عہدہ شیخ حسام الدین کو سونپا گیا تھا، مگر بعض شرعی معاملات میں وہ دار القضاء کے معیار پر پورے نہ اتر سکے، اس لیے ۱۲۴۷ھ میں ان کو معزول کر کے ان کے بھائی شیخ محمد رضا صاحب کو یہ عہدہ دیا گیا۔ مولوی قاضی محمد رؤف صاحب نے دار القضا سے جو سند شیخ محمد رضا صاحب کو عطا کی ہے، اس میں اس کی طرف یوں اشارہ موجود ہے۔ ''چوں سابق ازیں سند عہدۂ نکاح خوانی بنام حسام الدین بود وحالات بہ سبب قصورات چند کہ خلاف شرع از عہدہ مذکورہ نام زدہ را موقوف کردہ بجائے شان ایشان را بعہدہ نکاح خوانی بفصلہ ذیل مقرر نمودہ شد''

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص:۵۶ تا ۶۰۔ خلاصہ و مآثر ومعارف۔ ص:۳۴۹ تا ۳۵۴۔

قاضی محمد رؤف صاحب کی طرف سے یہ سند رمضان ۱۲۴۷ھ میں دی گئی اس کی پشت پر ۲۰ ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ موافق ۱۸۳۴ء درج ہے۔ دوسری سند قاضی محمد سلیم صاحب منصف کی طرف سے دی گئی۔ شیخ محمد رضا کی امانت گزاری و دیانت داری کے مکرر سماع و معائنہ کے بعد قاضی محمد سلیم صاحب نے ان کو نہ صرف سند جدید دی، بلکہ ان کا دائرۂ نیابت وسیع کر دیا گیا اور مکرر ارشاد کے ذریعہ ان کو مزید اعزاز دے کر پندرہ سولہ مقامات میں نائب قاضی بنایا گیا۔ پورب میں پرانی بستی تک، دکھن میں سٹھیاؤں تک، پچھّم میں بمہور اور حاجی پور تک اور اتر میں گونجر پار اور بنڈ بیا تک ان کے حدود قضا تھے اور وہی اس پورے علاقے کے مسلمانوں کے جملہ شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار تھے۔ جن میں نکاح خوانی سے لے کر امر بالمعروف، نہی عن المنکر امامت جمعہ و جماعات اور ہر قسم کے جھگڑے اور مقدمات کے فیصلے شامل تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ محمد رضا صاحب کی علمی و دینی قابلیت و بصیرت کس قدر بلند تھی۔ ان کی تین سندیں ''مآثر و معارف'' میں درج ہیں۔ جو قاضی محمد رؤف صاحب، قاضی محمد سلیم صاحب اور قاضی محمد شاہ عالم صاحب کی طرف سے دار القضا سے ملی تھیں[1]

شیخ حسام الدین شاہؒ

شیخ حسام الدین بن شیخ امام بخش بن شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ زہد و تقویٰ اور خدا ترسی و پارسائی میں بہت آگے تھے اور ولی کامل سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی بزرگی اور ولایت کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ قاضی محمد رؤف صاحب کے دور میں مبارکپور کے نائب قاضی تھے، مگر ۱۲۴۷ھ میں ایسے واقعات ان سے ظہور پزیر ہوئے، جو خلاف شرع معلوم ہوتے تھے اور باوجود زہد و تقویٰ و طہارت و پارسائی و بزرگی کے آپ ان کی وجہ سے شرعی امور

---

[1] مآثر و معارف۔ ص: ۳۵۵ تا ص: ۳۵۹۔

ومعاملات کے ذمہ دار اور نگراں نہیں بن سکتے تھے، اس لیے قاضی محمد رؤف صاحب نے ان کی جگہ ان کے بھائی شیخ محمد رضا کو نیابتِ قضا کا عہدہ سپرد فرمایا۔ چوں کہ شیخ حسام الدین صاحب اس واقعہ کے بعد قانونی طور سے وعظ وارشاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دوسرے شرعی معاملات میں مجاز وذمہ دار نہیں رہ گئے تھے۔ حالاں کہ ان کی زندگی ان ہی دینی کاموں میں گزری تھی، اس لیے وہ اس کے بعد درس وتدریس میں لگ گئے اور اسی دینی وعلمی خدمت میں باقی زندگی گزار دی۔ آخر وقت میں مجذوبانہ طور پر رہتے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے طے الارض کی کرامت سے نوازا تھا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان سے کہیں چلنے کے لیے کہا اور انھوں نے کہا کہ چلو میں آتا ہوں، اس کے بعد دیکھا گیا تو وہ وہاں پہلے سے موجود رہا کرتے تھے۔ ان کے اس طرح کے واقعات اب بھی بعض لوگ بیان کرتے ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق شیخ حسام الدین شاہ صاحب باہر کسی مقام پر مدرّس تھے اور وہیں سخت بیمار پڑے تو اٹھا کر مبارکپور لانے گئے۔ وہ عوام وخواص میں ''حسامدی بابا'' کے لقب سے مشہور تھے۔

۹ر یا ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو مبارکپور میں انتقال فرمایا۔ مولانا عبدالعلیم صاحب رسولپوری نے اپنی ایک کتاب میں یادداشت کے طور پر ان کی تاریخِ وفات ان تاثرات والفاظ کے ساتھ درج کی ہے اور آپ کو اولیائے کاملین میں شمار کیا ہے:

> ''حسام الدین شاہ از اولیائے کامل مبارکپوری انتقال کردہ بماہ جمادی الاولیٰ روز چہار شنبہ تاریخ ۹ د بہ قول بعضے ۱۰ ر کہ شش گھنٹہ روز باقی بودے ۱۲۹۷ھ''۔

آپ کی قبر گولہ بازار میں مسجد کے پیچھے کے صحن میں تھی، جہاں اکھاڑہ ہے۔ اب سے پہلے یہاں ربیع الاوّل یا جمادی الاولیٰ میں درگاہ اور عرس کی تقریب ہوتی تھی۔

شیخ محمد رجبؒ

شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی رحمہم اللہ اس خانوادۂ قضارت و مشیخت کے خاندانی عہدہ اور روایت کے آخری فرد تھے۔ جن پر صدیوں کی روایت کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے اسلامی عدالتوں کو بند کر کے عام قانونی عدالتیں قائم کیں، جن کی وجہ سے رہی سہی اسلامی روایت اور اس کے حاملین ختم ہو گئے۔ قاضی محمد سلیم صاحب نے ۱۵ رمضان ۱۲۵۱ھ کو شیخ امام بخش کو جو سند نیابت عطا کی تھی، اس میں شیخ محمد رجب کا نام بھی سرنامہ میں شامل ہے۔ ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور امورِ شرعیہ کے سلسلے میں خاندانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زبردست عالم اور نہایت متقی و دیندار بزرگ تھے۔ ساتھ ہی اسلامی شان و شوکت کے مالک تھے۔ خاندانی رسم کے مطابق پالکی نشینی ان کے دَور تک قائم رہی۔ جب ان کی پالکی نکلتی تھی تو اربابِ علم و فضل اس کے دائیں بائیں چلتے تھے۔ عموماً جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے پالکی ہی پر جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس خاندانی مخطوطات و نوادرات اور قلمی کتابوں کا بیش بہا کتب خانہ تھا، جسے بعد میں لوگوں نے راجہ صاحب کی مسجد کے پاس والے کنویں میں ڈال دیا۔ البتہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف، تسبیح و عصا خاندان میں موجود تھے، مگر بعد میں یہ تبرکات و متروکات بھی ضائع ہو گئے۔ راقم کو ان کا مملوکہ مجموعہ خطب مولانا اسماعیل شہیدؒ محلّہ پرانی بستی کی ایک مسجد سے دستیاب ہوا ہے، جو مطبوعہ ہے اور اس پر آپ کے ہاتھ کی تملیک کی تحریر اور دستخط موجود ہیں اور اس کے آخر میں آپ کے ہاتھ سے نہایت عمدہ عربی جلی خط میں خطبۂ ثانیہ اور خطبۂ عیدین لکھا ہوا ہے، جس پر ۱۲۹۷ھ درج ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ اور دوسرے مجاہدین کو مسلمانوں کا ایک طبقہ موردِ الزام ٹھہراتا تھا

اور ان کی تکفیر و تفسیق کرتا تھا۔ ان کی کتابوں کو گھروں میں رکھنا اور ان کو ہاتھ لگانا حرام سمجھتا تھا۔ اس زمانے میں شیخ محمد رجب صاحب مولانا مرحوم کے خطبات، جمعہ اور عیدین میں پڑھتے تھے۔ چوں کہ ۱۲۵۱ھ میں آپ کم عمر تھے، اس لیے نام کے ساتھ سند میں لفظ شیخ نہیں ہے۔ آپ کی وفات ۱۲۹۷ھ کے بعد تیرہویں صدی کے خاتمے پر ہوئی اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ شیخ محمد رجب صاحب کے دو صاحبزادے تھے، میاں جی حاجی لعل محمد اور میاں جی ولی محمد۔ میاں جی حاجی لعل محمد صاحب زندگی بھر کسی نہ کسی درجے میں خاندانی روایات کے حامل رہے۔ حج و زیارت کی دولت بھی پائی تھی۔ ان کے چار صاحبزادے تھے: (۱) میاں جی عبداللہ متوفی دوشنبہ ۱۵/رجب ۱۳۵۷ھ (۲) میاں جی حاجی اسداللہ متوفی شنبہ ۲۵/صفر ۱۳۸۲ھ (۳) میاں جی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵/رجب ۱۳۶۵ھ (۴) میاں جی حاجی محمد حسن صاحب جو راقم کے والد ماجد ہیں اور ابھی الحمدللہ حیات ہیں۔ ۲۸/فروری ۱۹۷۸ء مطابق ۱۱/ربیع الاوّل ۱۳۹۸ھ سہ شنبہ کا دن گزار کر چہارشنبہ ۹/بجے رات کو انتقال فرمایا اور دوسرے دن بدھ کو ظہر بعد شاہ کے پنجہ میں دفن کیے گئے۔ میاں جی عبداللہ سب بھائیوں میں بڑے تھے اور بڑے قد و قامت، رعب و داب اور سمجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ میاں جی شیخ علی مرحوم کی شہ زوری اور پہلوانی کی جھلک ان میں پائی جاتی تھی۔ ان کا ذکر تاریخ المنوال میں ہے۔ ان سے چھوٹے میاں جی حاجی اسداللہ تھے، ان میں خاندانی روحانیت کا رنگ نمایاں تھا، صوفیاء اور اہل دل کی صحبت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ ان سے چھوٹے میاں جی محمد حسین نیابتِ قضا کی رہی سہی روایت کی ذمہ داری سنبھالتے تھے۔ نکاح خوانی، جمعہ و عیدین وغیرہ کی امامت کرتے تھے۔ ویسے نکاح خوانی کا کام آج بھی جاری ہے۔ میاں جی حاجی محمد حسن سب بھائیوں سے چھوٹے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۲/سال کی ہے۔ ۱۱/ربیع الاوّل ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۸/فروری ۱۹۷۸ء سہ شنبہ کا دن گزار کر رات میں

۹ ربجے انتقال فرمایا اور دوسرے دن بدھ کو بعد نمازِ ظہر روضہ میں دفن کیے گئے۔ میاں جی ولی محمد کے دو لڑکے ہوئے ایک میاں جی محمد شفیع مرحوم اور دوسرے میاں جی حاجی محمد عمر جو حیات ہیں[1] تقریباً ۸۰ر سال کی عمر میں شنبہ ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۸ر جون ۱۹۷۵ء چھ بجے شام کو فوت ہوئے اور دوسرے دن صبح ۸ ربجے روضہ میں دفن کیے گئے۔ اس وقت میں وطن میں تھا اور تجہیز و تکفین میں شریک رہا۔

مولانا حکیم امان اللہ

مولانا حکیم امان اللہ صاحب اپنے زمانہ میں مبارکپور کے اطبائے حُذّاق میں سے تھے، ساتھ ہی قصبہ کے مہتر و سردار تھے، اسی لیے مرجع ہر خاص وعام تھے۔ حکیم صاحب مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری مصنف ''سیرۃ البخاری'' کے نانا تھے اور شاہ ابواسحاق لہراوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ مولانا عبدالسلام صاحب نے ''سیرۃ البخاری'' میں ایک مقام پر حاشیہ میں لکھا ہے:

"ثم اعلم ان اسم جدی	میرے نانا کا نام امان اللہ
الفاسد (ابواُمی) ایضاً	تھا۔ وہ قوم کے مہتر اور
کان امان اللّٰه وكان	سردار تھے۔ ساتھ ہی طبیب
رئیس القوم طبیباً	تھے۔ ان کے یہاں لوگوں
مرجعاً للخلائق	کی بھیڑ بھاڑ رہا کرتی تھی۔
توفی ۱۲۹۹ھ وقد تلمذ	انھوں نے شاہ ابواسحاق
علی الشیخ الشهير	صاحب لہراوی سے تعلیم

---

[1] مآثر و معارف۔ص:۳۶۰ و ۳۶۱۔

فی الآفــاق الشـاه ابی	حاصل کی تھی۔ ۱۲۹۹ھ میں
اسحاق اللهراوی"[۱]	انتقال کیا۔

جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوا ان کی وفات ۱۲۹۹ھ میں ہوئی۔

مولوی دھنا سے

مولوی دھنا سے صاحب کا نام معلوم نہیں، غالباً عبداللہ تھا، وہ اسی عرفیت سے مشہور تھے۔ گرہست، دھنی اور دھنا سیٹھ کے الفاظ پہلے زمانے میں قصبہ میں صاحب مال وثروت کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ دھنا سے دھنا سیٹھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مولوی صاحب اس زمانے کے مالداروں میں سے تھے۔ اسی لیے اس لقب سے مشہور ہو گئے۔ محلّہ پرانی بستی میں مکان تھا۔ شاہ ابو اسحاق لہراوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور اکثر کتب درسیہ ان ہی سے پڑھی تھیں۔ علم وعمل اور وضع قطع میں سلف کا نمونہ اور اپنے شیخ کا آئینہ تھے اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ لمبی عمر پائی تھی، آخری وقت میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک مرتبہ اپنے دروازے کے کنویں میں گر گئے اور اندر سے آواز دینی شروع کی کہ میں نالی میں گر گیا ہوں، آکر مجھے نکالو۔ جب لوگوں نے آواز سنی تو دوڑے ہوئے گئے اور دیکھا کہ مولوی صاحب کنویں کے اندر نہایت اطمینان سے کھڑے ہیں اور پانی معتاد سے بہت کم ہے، ان کو نکالا گیا اور کہیں خراش تک نہیں آئی تھی۔

ان کے پاس نہایت قیمتی کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم وفنون کی بہت سی کتابیں تھیں۔ اس کی دو قلمی کتابیں مولانا عبدالعلیم صاحب رسولپوری کے کتب خانے میں اب تک موجود ہیں۔ ایک "تحفۂ اثناء عشریہ" اور دوسری "نہج البلاغت"۔

---

[۱] سیرۃ البخاری۔ ص: ۳۸۔

تحفۂ اثناء عشریہ کی زیارت راقم نے کی ہے، نہایت اچھی حالت میں ہے، خط متوسط درجے کا ہے اور نہج البلاغت کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ عربی خطاطی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور نہایت پاکیزہ جلی خط میں لکھی ہوئی ہے۔ اس قیمتی نسخہ کو مولوی صاحب نے اپنے زمانے میں چالیس روپے میں خریدا تھا۔ اس سے ان کے علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے شیخ شاہ ابواسحاق لہراویؒ کے طرز پر پوری زندگی بسر کی اور تیرہویں صدی کے آخر میں انتقال فرمایا۔ ان ہی کے صاحبزادے حافظ عبداللطیف صاحب امام جامع مسجد راجہ صاحب متوفی ۱۳۳۴ھ تھے۔ (یہ حالات مولانا عبدالباقی صاحب رسولپوری نے بیان کیے ہیں)۔

مولوی نرہو

مولوی نرہو صاحب صوفی پورہ کے رہنے والے تھے۔ مذہباً اثناعشری شیعہ تھے۔ آپ بھی شاہ ابواسحاق لہراوی کے تلامذہ سے تھے۔ استاد اور شاگرد اگرچہ مسلک کے اعتبار سے مختلف تھے، مگر دونوں میں تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ شاہ ابواسحاق صاحب اپنے اس شاگرد سے بہت بے تکلف تھے، ان کے ساتھ نہایت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مولوی نرہو بھی اپنے شیخ کی عقیدت ومحبت میں بہت آگے تھے۔ استاد کی تعلیم نے ان کو اہل سنت والجماعت سے اتنا قریب کردیا تھا کہ وہ بلاتکلف وبلاتردد اہل سنت کے ساتھ ان کی مسجدوں میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر سنی مسجد میں اقامت ہونے والی ہوتی اور مولوی نرہو آجاتے تو تھوڑی دیر کے لیے اقامت روک دی جاتی تاکہ وہ بھی وضووغیرہ کرکے جماعت میں شریک ہوجائیں۔

ایک مرتبہ باتوں بات میں شاہ ابواسحاق صاحب نے ان سے فرمایا کہ تمھارے یہاں ایک بچہ پیدا ہوگا جو اپنا نام لے کر آئے گا۔ چناں چہ چند ماہ کے اندر ان کے یہاں

پوتا پیدا ہوا، جس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں، بعد میں وہ چھنگا کی عرفیت سے مشہور ہوا۔ یہ لڑکا طبیب حاذق ہو کر چھنگا کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد میں حکیم چھنگا مبارکپور سے مالیگاؤں چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ۱۸۱۳ء (۱۲۲۸ھ) کی جنگ میں فسادیوں نے مولوی نرہو کا گھر بھی لوٹا اور ان کے بہت سے مال واسباب لے گئے۔ اس کا ذکر عرضداشت میں یوں ہے:

"........ گور پرشاد جمعدار	گوری پرشاد جمعدار تھانہ پرگنہ
تھانہ پرگنہ کہ اوہم سی عدد	نے بھی تیس عدد مشروع کے
تھانہائے مشروع وچیزے	تھان، کچھ ریشم وتسر اور پہننے
ریشم وتسر و پارچہ ملبوس از جہلی	والے کپڑے بھی جہلی و رمضان
و رمضان ونرہو نور بافان	ونرہو نور بافوں کے گھروں سے
غارت گری کردہ بود......"۔	لوٹ کر لے گیا۔ (قمر)

یہ حالات مولوی حکیم عبدالمجید صاحب بکھری والے وفات بعارضہ فالج اتوار ۸ رجب ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۶ جون ۱۹۷۷ء تدفین دوشنبہ کو عائشہ تالاب اونچی تکیہ سے معلوم ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالوہاب سریانویؒ

شیخ عبدالوہاب سریانوی حضرت شاہ ابواسحاق صاحب لہراوی کے معاصر تھے۔ باقاعدہ عالم نہیں تھے، مگر اربابِ علم وفضل کی صحبت اور بقدرِ ضرورت تعلیم اور ذاتی صلاحیت نے آپ میں جوہر قابل پیدا کر دیا تھا۔ شہیدین سعیدین کی تحریکِ جہاد کے ہمنواؤں میں تھے۔ جب کہ املو کے شیخ محمد اکبر غازی اور شیخ الٰہی بخش غازی اس کے شرکاء میں تھے۔

شیخ عبدالوہاب عنفوانِ شباب میں مبارکپور سے پیدل سفر کر کے دہلی شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی متوفی ۱۲۴۸ھ کی خدمت میں پہنچے اور کچھ دنوں ان کی خدمت میں رہ کر کسبِ فیض کیا۔ جب واپس ہونے لگے تو حضرت شاہ صاحب نے ان کو اپنے فتاویٰ کا ایک مجموعہ عنایت فرمایا اور کہا کہ عبدالوہاب تمہارے دیار میں ان دنوں اہل علم کی کمی ہے، اس کتاب سے تم کو اور وہاں کے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ اس متبرک نسخہ کے کچھ اجزا بعد تک اس خاندان میں محفوظ تھے۔ جن کو شیخ صاحب کے صاحبزادے حافظ شاہ نظام الدین نے مولانا عبدالعلیم رسولپوری کو دیگر بہت سی علمی کتابوں کے ساتھ دے دیا تھا اور اب وہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ اس دیار کے ایک اور عالم مولوی حافظ غلام علی بن نجیب اللہ عباسی چریاکوٹی متوفی ۱۲۴۸ھ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے دہلی جا کر تعلیم کی تھی[1] جب مولوی کرامت علی جونپوری متوفی ۱۲۶۴ھ مبارکپور اور سریاں وغیرہ آتے تو شیخ صاحب رات دن کسب فیض میں لگے رہتے تھے۔ افسوس کہ ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ مل سکیں اور مستند طریقے سے اتنا ہی مل سکا۔ اولاد میں جناب حافظ نظام الدین صاحب رضا سریانوی بہت بزرگ اور باخدا انسان گزرے ہیں[2]

مولوی جان محمد

مولوی جان محمد محلّہ شاہ محمد پور کے رہنے والے تھے۔ ''واقعات وحادثات مبارکپور'' کی ایک تحریر سے ان کا کچھ حال معلوم ہوا ہے۔ ہم یہاں پر وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند۔ ص: ۱۵۵۔

[2] البلاغ بمبئی۔ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ وصدق جدید لکھنؤ ۱۳۹۲ھ۔

''مرزا ولی بیگ تھانیدار مبارکپور نے سات برس تک بڑے
کروفر کے ساتھ تھانیداری کی اور تاریخ ۲۶ رصفر شب جمعہ ۱۲۵۶ھ انتقال
فرمایا۔ تاریخی مصرعہ ''روانہ سوئے جنت از قضا شدہ'' ہے اور ان کی تاریخ
مولوی جان محمد صاحب ساکن محلّہ شاہ محمد پور من مُحلاتِ قصبہ مبارکپور نے یہ
کہی ہے: (رباعی)

در کشور انصاف ولی بیگ سرآمد ۔۔۔ در خلقِ خدا منبعِ فضل وہنر آمد
از دار فنا رفتہ سوئے منزل فردوس ۔۔۔ تاریخ وفاتش بہ غم ودرد برآمد

لفظ ''بہ غم ودرد'' سے ۱۲۵۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ مرزا بیگ نے
جو مجلس قصبہ مبارکپور میں کی اور اچھے اچھے مرثیہ خواں بلائے، اس کا بیان
بہت طویل ہے اور ضرورت نقل کی نہیں ہے۔''[۱]

مولوی جان محمد صاحب علمائے شیعہ میں تھے اور تیرہویں صدی کے نصف آخر
میں فوت ہوئے۔

مولوی بشارت علی فیض آبادی

مولوی بشارت علی تیرہویں صدی کے نصف اوّل میں تھے اور غالبًا اثناعشری
شیعہ تھے۔ ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں حادثۂ پنجم کے سلسلے میں ان کا حال صرف
اتنا درج ہے کہ ایک شخص مسمیٰ بشارت علی تھے اور رہنے والے تھے نگپور جلالپور ضلع فیض آباد
کے اور اس وقت لالن مہتر کے اماماڑے میں درس دیتے تھے۔[۲]

۱۔ واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۳۵۔

۲۔ واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۲۳۔

مولوی عنایت اللہ امام جامع مسجد

مولوی عنایت اللہ جامع مسجد راجہ صاحب کے امام تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں جامع مسجد میں تعمیر وتوسیع ہوئی۔ اس ضمن میں ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

''واسطے وسعت وکشادگی فرش کے ایک روز مولوی عنایت اللہ جو جامع مسجد کے امام تھے، بعد نمازِ جمعہ کے مع چار پانچ شخص دوسرے دانش مندوں کے ان باتوں کا مذکور اور چھیڑ چھاڑ کیا اور کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ بباعث تنگی فرش کے نمازیوں کو از حد تکلیف ہوتی ہے۔ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ جس کے سبب سے مصلیوں کو اطمیان ہو اور بہ سبب نشیب وفراز زمین کے بیرون فرش اکثر لوگ اپنی چادر ڈال کر شریک جماعت ہوتے ہیں۔ کہیں جگہ جوتا اتارنے کی باقی نہیں رہتی۔ اگر آپ بقدر مقدر اپنے اس بارے میں مدد کریں تو یہ تکلیف رفع ہو جائے، کیوں کہ اس کام میں ہزاروں روپیوں سے زیادہ کا صرفہ ہے۔ یہ رائے سب کو پسند آئی اور بروز جمعہ آئندہ بعد فراغِ نماز کے بمقابلہ کل مصلیوں کے کیفیت مجوزہ کا خلاصہ بیان ہوا۔ ہر کسی کو یہ پسند ہوا اور برغبت تمام ہر شخص نے حسب حیثیت چندہ دینے کا اقرار کیا اور ۱۲۸۲ھ میں ترمیم دیوار احاطہ وفرش وغسل خانہ کی ہوئی اور چاہ پختہ تیار ہو گیا''[1]

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۸۷-۸۸۔

غازی عبدالسبحان املویؒ

غازی عبدالسبحان بن بابو املوی، غازی محمد اسماعیل املوی اور غازی محمد اکبر املوی مجاہدین بالاکوٹ کی صفوں میں داخل ہوکر املو سے میدان کارزار کو روانہ ہوئے۔ واقف حال لوگوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں غازی عبدالسبحان نے خواب دیکھا کہ وہ مجاہدین کا کھانا تیار کررہے ہیں، اسی اثناء میں ان کو غنیم کی فوج کی گولی لگی اور وہ جاں بحق ہوگئے۔ دوسرے دن ان کے ساتھ بعینہ یہی واقعہ پیش آیا اور وہ اسی طرح جامِ شہادت نوش کر کے شہیدوں میں شامل ہوگئے۔ ان کے خاندان کے لوگ املو اور لوہیا میں آباد ہیں[1]

غازی محمد اسماعیل املویؒ

غازی محمد اسماعیل املوی محاذ جنگ پر گئے تو آج تک ان کی کوئی خبر نہ مل سکی کہ انھوں نے جامِ شہادت کب نوش کیا۔

شیخ محمد اکبر غازی املویؒ

شیخ محمد اکبر غازی املو کے رہنے والے تھے۔ حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد کے سرگرم غازیوں اور مجاہدوں میں تھے۔ سید صاحب کی امامت دامارت میں حدودِ افغانستان میں پانچ چھ سال تک جہاد میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ

[1] مقدمہ اہل حدیث اور سیاست۔ ص: ۱۳۰۔

کے مقام پر حضرت سید احمد اور حضرت مولانا اسماعیل کی شہادت ہوگئی۔ اس کے بعد جماعت مجاہدین متفرق ہوگئی۔ اس میں سے کچھ لوگ اسی طرف رہ گئے اور کچھ لوگ اپنے وطن چلے گئے۔ شیخ محمد اکبر اپنے وطن واپس آ گئے۔ غازی محمد اکبر املوی دو مرتبہ محاذ جنگ پر گئے اور واپس آئے۔ تیسری مرتبہ جاتے ہوئے پٹنہ میں گرفتار ہو گئے اور ان کے بارے میں گواہی کے لیے املو سے عبدالقدیر، محمد موسیٰ اور عبدالغفار صاحبان پٹنہ گئے، ان لوگوں کی گواہی پر غازی صاحب موصوف کو قید فرنگ سے رہائی ہوئی، مگر ان کی پیشانی کو جلتے ہوئے سرخ لوہے سے داغ دیا گیا۔ اس کے بعد غازی محمد اکبر صاحب سرحد نہ جا سکے اور اپنے وطن میں رہ کر مجاہدین کی امدادی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کی تنہا یادگار ان کے صاحبزادے میاں جی محمد یحییٰ مرحوم تھے، جو نہایت متقی پرہیز گار انسان تھے، ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت میں گزری۔ ان کی وفات وطن سے دور موضع شاہ پور میں ہوئی جہاں وہ تعلیم دیتے تھے[۱]

مبارکپور، املو اور لوہیا سے مستقل اعانتی رقمیں عرصۂ دراز تک مرکز مجاہدین میں بھیجی جاتی رہیں۔ اس کام کے لیے مولانا عبداللہ غازیپوری بارہا املو آئے آخر میں مولوی اسداللہ روانوی یہاں آتے اور مجاہدین سرحد کی مالی اعانت کے لیے رقوم حاصل کر کے معینہ مقامات کو بھیجتے تھے۔ لیکن چوں کہ اس طرح کا کام نہایت رازداری سے انجام پاتا تھا۔ اس لیے اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا[۲]

ان کے صاحبزادے میاں جی محمد یحییٰ نہایت صالح اور بزرگ انسان تھے۔ آخری دور میں ان پر مراق کا حملہ ہو جاتا تھا اور جب یہ کیفیت ہوتی تو مسجد میں چلے جاتے اور وہیں نماز میں مشغول رہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔

---

[۱] مقدمہ اہل حدیث اور سیاست۔ ص:۱۳-۱۴۔

[۲] مقدمہ اہل حدیث اور سیاست۔ ص:۱۶۔

شیخ الٰہی بخش غازی املویؒ

شیخ الٰہی بخش املوی بھی حضرت سید احمد بریلوی کے ہمراہ جہاد کے لیے روانہ ہو گئے اور سرحد میں مجاہدین کی جماعت سے وابستہ ہو گئے۔ مگر اثنائے جہاد میں وطن واپس چلے آئے تھے۔ ان کے جہاد سے واپس آ جانے کی وجہ سے لوگ ان کی امامت سے بچتے تھے۔ ایک سو پندرہ سال کی عمر میں املو میں انتقال کیا۔

شیخ جہانگیر غازی املویؒ

آپ بھی سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد کے سرگرم غزاۃ و مجاہدین میں سے تھے۔ املو میں جہاں گیر بابا کی مسجد آپ ہی سے منسوب ہے۔ جسے آپ نے اپنے مکان کے ایک حصے میں بنایا تھا۔ مولانا عبدالحق بن شیخ جہاں گیر املوی مشہور علماء میں سے تھے۔ جو علامہ ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی کے نام سے مشہور ہیں۔ امامِ ابن جوزی کی ''تلبیس ابلیس'' کا اُردو میں ترجمہ ان ہی کا ہے۔

مولانا حافظ خدا بخش مہاجر مکی

مولانا حافظ خدا بخش بن شیخ حاجی سمن بن شیخ عیسیٰ مبارکپوری مہاجر مکی کا آبائی وطن گھبڑا تھا۔ ان کے دادا شیخ عیسیٰ اپنے خاندان سمیت مبارکپور کی پرانی بستی میں آباد ہوئے۔ یہاں آنے پر ان کے دولڑکے شیخ سمن اور شیخ ببو خوب پھلے پھولے اور صاحب دولت و ثروت ہوئے۔ دینی اعتبار سے بھی یہ گھرانا ممتاز تھا۔ حافظ صاحب کے والد حاجی سمن متمول اور مخیّر تاجر تھے۔ غربا و مساکین کی خبر گیری کرنے میں مشہور تھے۔

مبارکپور کے سنگی غلطے کی تجارت تھی اور یہاں سے حیدرآباد دکن تک تجارتی سلسلہ جاری تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ اپنے دروازے پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا لہرایا اور اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

حافظ صاحب نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور کیا کیا علوم حاصل کیے، اس کے بارے میں قطعی معلومات نہیں ہیں، مگر اغلب گمان ہے کہ انھوں نے شاہ ابواسحاق لہراوی سے پڑھا ہے ان کی کتابوں میں کریما، ماقیمان، گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، میزان منشعب، شرح مأتہ عامل، پنج گنج وغیرہ بعد میں پائی گئی۔ اس زمانہ میں خانگی مکاتب ومدارس کا رواج عام تھا اور اس دیار میں بڑی درسگاہ شاہ ابواسحاق صاحب کا مدرسہ تھی اور یہاں کے طلبا وہیں جاتے تھے۔

حافظ صاحب باوجودیکہ خوشحال اور متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ نہایت سیدھے سادے، پاک نفس، منکسر المزاج، خداترس، غریب نواز اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے۔ کبھی کبھی ان پر جذب کی حالت طاری ہوجاتی تھی، جو بسا اوقات کئی کئی دن تک رہتی تھی، ان دنوں جوش عبادت اور ذوق بندگی بہت بڑھ جاتا تھا۔ اکثر گھر سے غائب ہوجاتے تھے اور تلاش کرنے پر اپنے آبائی وطن گھبڑا کی شاہی مسجد میں معتکف پائے جاتے، یا پھر خیرآباد کے قریب ملک جعفر کے خطیرے میں ملتے یہ دونوں مقامات اہل دل کے لیے سکون بخش تھے۔

حافظ صاحب کے بارے میں یہ بھی عام طور سے مشہور ہے کہ کبھی کبھی جب جذبے کے عالم میں ہوجاتے تو گھر والے ان کو مکان میں اس لیے بند کردیتے تھے کہ اس حال میں باہر نہ جائیں۔ مگر وہ اندر ہی اندر کھپریل چھت اُدھیڑ کر چھت کے اوپر چڑھ جاتے تھے اور ان کو سیڑھی کے ذریعہ اتارا جاتا تھا، حالاں کہ چھت بالکل صحیح وسالم ہوتی تھی۔

انتہائی تقویٰ وطہارت اور عبادت وریاضت کے ساتھ حافظ صاحب نہایت کامیاب تاجر اور صاحب ثروت آدمی تھے۔ ان کے کاروبار میں برکت تھی اور ہر کام میں نفع ہوتا تھا، تجارت میں احتیاط اور تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ان کے زمانے میں پیسوں کی طرح کوڑیاں بھی بازار میں چلتی تھیں۔ اگر کسی آدمی سے حساب وکتاب کے سلسلے میں کوڑی دو کوڑی کا معاملہ ہوتا تھا تو حافظ صاحب یا تو معاف کر کے اپنا اس کا حساب بیباق کر دیتے، یا اس سے معاف کرا کر خود اس سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔

اپنے والد کی خدمت ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ رات میں جب تک والد سو نہ جاتے ان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ ہر نماز کے وقت ان کے لیے وضو کا پانی رکھنا اور قضائے حاجت کے لیے لوٹا لے کر ان کے ساتھ میدان آنا جانا حافظ صاحب کے معمولات میں تھا۔ ضرورت مند لوگوں کی حاجت روائی کے لیے بڑے انشراح کے ساتھ قرضہ دیا کرتے تھے، مگر پہلے پوچھ لیتے کہ کب ادائیگی ہوگی، اس وقت تک کچھ نہ بولتے اور اگر وعدہ خلافی ہوتی تو اخلاقی دباؤ سے وصول کرتے۔ یہاں تک کہ کاروبار کے سلسلے میں اگر ان کے والد بھی ان سے قرض لیتے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے تھے اور جب تک وہ قرض ادا نہیں کرتے تھے، ان کی چادر یا رومال پکڑے رہتے تھے۔

نہایت خاموش، کم سخن اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے۔ شکوہ وشکایت اور غیبت سے بہت دُور رہتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی ان کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ ان کے تقویٰ کا رعب ہر خاص وعام پر چھایا رہتا تھا۔ حافظ صاحب غرباء ومساکین کے حالات معلوم کر کے خفیہ طور سے مدد کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک غریب آدمی تھا، اس کی بیوی اکثر لڑائی جھگڑا کرتی اور گھر سے بھاگ جاتی تھی۔ حافظ صاحب نے اس آدمی سے وجہ معلوم کی تو اس نے کہا کہ میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس کھانے تک کا انتظام نہیں ہے اور میری بیوی مجھ سے زیورات کا مطالبہ کرتی ہے۔ حافظ صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور وہ آدمی چلا گیا۔ پھر کچھ دنوں

کے بعد اسے کھجوا تالاب کے ایک گھاٹ پر بلایا۔ جہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا اور اسے زیورات کی ایک تھیلی دے کر کہا کہ یہ زیور اپنی بیوی کو دے دو، مگر اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا۔ انھوں نے مکہ مکرمہ کے لیے تین بار سفر کیا، دو بار واپس آئے اور تیسری بار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ پہلی بار جب سفر حجاز کا قصد کیا تو گھر کے جملہ سامان مہیا کیے اور اہل خانہ کے آرام و آسائش کی ہر چیز زیادہ سے زیادہ خرید کر رکھ دی اور بلا کسی کو خبر کیے روپیہ لے کر نکل گئے۔ گھر کے لوگ ان کے معاملات میں تعرض نہیں کرتے تھے، اس لیے کسی نے ان سے پوچھ گچھ نہیں کی، مگر چند دنوں کے بعد خالی ہاتھ واپس آ گئے اور حسب معمول کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ تیسری بار اسی طرح روانہ ہوئے تو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور مکہ معظّمہ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ حجاج سے ان کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی، مگر گھر آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چند سالوں کے بعد ان کی ایک رشتہ دار مالدار خاتون اپنے سرمائے سے اپنے نابالغ لڑکے کے ساتھ حج کو گئیں اور انھوں نے حافظ صاحب کو تلاش کرایا تو ایک دن طواف کرتے ہوئے نظر پڑے۔ انھوں نے بلایا اور بتایا کہ آپ کے بیوی بچے اور گھر والے بہت یاد کرتے ہیں، اب وطن چلنے کی تیاری کریں، کرایہ میں دیتی ہوں۔ حافظ صاحب نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے۔ اس کے بعد حافظ صاحب کے رشتے کے بھتیجے حاجی محمد علی حج کو گئے اور ان کو بہت تلاش کیا، مگر نہیں ملے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے بعد حرم محترم میں منبر کے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، جب میں اس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ مجھے اشارے سے بلاتا تھا۔ اس وقت حافظ صاحب کا خیال نہیں آیا اور سوچا کہ یہاں مجھے کون بلا سکتا ہے۔ مگر بعد میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ چچا حافظ خدا بخش ہوں اور نماز کے بعد ان کو بہت تلاش کیا، مگر نہیں ملے۔ البتہ تلاش بسیار کے بعد اتنا معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی آدمی حافظ خدا بخش نامی مکہ کے باہر کہیں رہتے ہیں اور روزانہ حرم میں آتے ہیں، مگر ادھر چند ماہ سے نظر نہیں پڑے۔

حاجی محمد علی خود بھی بہت بزرگ آدمی تھے، ان کا بیان ہے کہ چچا صاحب سے میری ملاقات خواب میں ہوتی رہتی ہے اور وہ مجھے اوراد و وظائف بتایا کرتے ہیں، اس کے سوا کوئی بات نہیں ہوئی۔ حافظ صاحب کا انتقال چودھویں صدی کی ابتداء میں مکہ مکرمہ میں ہوا۔ ان کی شادی محلّہ پورہ رانی میں شیخ عبدالسبحان بن شیخ پکھن کی صاحبزادی مسماۃ وجیہن سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے حافظ صاحب کے دولڑکے عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم تھے۔ ثانی الذکر عنفوان شباب میں انتقال کر گئے اور شیخ عبدالرحمٰن نے بڑی عمر پائی، ان میں اپنے والد کی جھلک پائی جاتی تھی۔ تقریباً سو سال کی عمر میں ۱۸؍ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ، ۲۹؍اگست ۱۹۵۳ء کو انتقال کیا۔ اس سال ایامِ حج میں معلو ہوا کہ مولوی خدا بخش نے مکہ مکرمہ میں متاہل زندگی بسر کی۔ ان کے دولڑکے احمد اور عبدالرحیم تھے، شیخ احمد کی صاحبزادی معلم محمود بخاری کی بیوی ہیں، جو ابھی حیات ہیں اور ان کے کئی اولاد ہیں، جیسا کہ معلم بخاری نے خود مجھ سے بیان کیا ہے۔

منشی حبیب اللہ حبیب

جناب منشی حبیب اللہ صاحب محلّہ کٹرہ کے مشہور شاعر اور روحانی بزرگ تھے۔

نمود سحر میں ہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے محلّہ کٹرہ میں ایک عالم متصوف اور شاعر فطرت شناس پیدا ہوا، جس کی رگ و پے میں علوم و فنون کا خونِ صالح جاری وساری تھا اور جسے دنیا منشی حبیب اللہ کے نام سے یاد کرتی تھی۔ آپ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے اور علم و فضل آپ کا خاندانی ورثہ تھا، لیکن انھوں نے کبھی نام و نمود کی تمنا نہ کی۔ ایک عرصہ تک ضلع بستی میں تھانہ انچارج رہے۔ بعد میں اعظم گڑھ میں سیشن جج کے پیشکار رہوئے۔ فارسی کے بڑے مشاق شاعر تھے، آپ کی غزلوں پر قدسی کا رنگ غالب ہے۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے نسبت بیعت وارادت رکھتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

گر خدا خواہی حبیب از ما سوا وارستہ شو کیں طریق حق رسی از فضل رحمان من است

شعر و سخن کی دنیا کے مشہور بزرگ مانے جاتے تھے۔ منشی محمد زماں صاحب زماں مبارکپوری ان کے اخص ترین تلامذہ میں سے ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے درزی تھے۔ اعظم گڑھ میں جامع مسجد کے قریب مزار ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

دل فدائے دلبر و جاں نذر جانان من است درہوائے وصل جاناں زیستن جان من است
تا خَلَقتُ آدم جلوہ نمود اندر دلم دیں من صورت پرستی، کفر، ایمان من است
محو کرد از من خیال کفر و دیں آں کس کہ گفت ہر چہ می بینی بداں کز مظہر شان من است
ما و تو واعظ متاع خود پرستی ہائے تست گم شدن از من متاع نقد عرفان من است
نیست مارا در سفر از بے نوائیہا غمے توشۂ عشق و طلب در راہ سامان من است
طعنۂ محتاجگی بر بے نوائیم مکن ہر چہ ہست از روز اول زیر فرمانِ من است

گر خدا خواہی حبیب از ما سوا وارستہ شو
کیں طریقِ حق رسی از فضل رحمان من است

خدا وند از لطف خویش گویا کن زبانم را زفیضان عنایت عنبر افشاں کن بیانم را
زعطر افشانیِ مضمونِ رنگین و دل آویزم معطر کن دماغ دوستانِ مخلصانم را

کس غضب کی تھی نگاہِ شوخ اس بے پیر کی تھی ادا جس میں کسی سفاک کی شمشیر کی
یہ رسائی ہے ستمگر آہِ پرتاثیر کی دیکھ وہ ہلتی ہیں کڑیاں عرش کی زنجیر کی
دیکھ اے قاتل شہیدِ ناز کے خوں کا مزا لے رہی ہے کس تمنا سے زباں شمشیر کی
اپنی ہستی ہی سے جب گزرے تو کیا پروا ہمیں ننگ کی، ناموس کی، توہین کی، تحقیر کی

ہو جسے اللہ کے محبوب سے الفت حبیبؔ
فکر اسے کیا عرصۂ محشر کے دارو گیر کی [1]

---

[1] نمونہ تحریر ص ۲۱، ۲۰ و ۳۰۔ مصنف شر[illegible] باقی، شائع کردہ انجمن تنظیم ادب مبارکپور۔

ملا پیر بھائی اسماعیلی

ملا نثار علی سرائے میری کی شہادت کے بعد یہاں کے اسماعیلی فرقہ کے مذہبی پیشوا اور عامل ملا اور امامباڑہ رمضان علی شاہ کے مدرّس تھے۔

مطوف شیخ فتح محمد مہاجر مکیؒ

مبارکپور کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ مختلف اسباب کی بنا پر دوسرے ممالک خصوصاً بلادِ عرب میں پھیلے اور آگے بڑھے۔ چناں چہ عدن میں کئی مبارکپوری خاندان آباد ہیں، جو ماضی قریب تک یہاں آتے جاتے تھے۔ ان مہاجرین میں عالم، تاجر، سرکاری ملازم، آفیسر سب ہی ہیں۔ ان ہی میں مکہ مکرمہ میں بیت الفتحی مشہور خاندان ہے، جس کو دینی اور دنیاوی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے جداعلیٰ مولوی شیخ فتح محمد بن شیخ احمد مبارکپوری ہیں۔ ان کے پوتے معلم عمر فتحی مکہ مکرمہ کے مشہور اور کامیاب معلموں میں سے ہیں۔ ہم نے اس سال کے سفر حج میں دوشنبہ ۲/ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ کو خاص طور سے ان سے ملاقات کر کے شیخ فتح محمد کے حالات معلوم کیے۔ انھوں نے زبانی اور تحریری معلومات دیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہمارے دادا شیخ فتح محمد بن شیخ احمد اب سے تقریباً ۱۴۰ سال قبل بادبانی کشتی کے ذریعہ مکہ مکرمہ آئے اور باب عالی یعنی سلطان ترکی کی طرف سے ان کی صلاحیت اور دینداری اور علمیت کے پیش نظر مطوفی اور معلّمی کی خدمت سپرد کی گئی اور اعظم گڑھ، بنارس، غازی پور، بلیا، جونپور، گورکھپور، بستی، گونڈہ، بلرامپور، احمد آباد، سورت، پٹن، بڑودہ اور سچین وغیرہ کے حجاج ان کی معلّمی میں دیے گئے۔ چناں چہ اس زمانے سے لے کر آج تک یہ خدمت ان کے خاندان میں چلی

آرہی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ہمارے دادا شیخ فتح محمد بن شیخ احمد پورہ خواجہ مبارکپور کے رہنے والے تھے۔ میں بچپن میں وہاں گیا تھا اور محمد عمر نامی چچازاد بھائی سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ میں شیخ فتح محمد کے لڑکے شیخ عبداللہ تھے، جن کے دولڑکے شیخ عمر بن شیخ عبداللہ اور شیخ حسین بن شیخ عبداللہ ہیں۔ شیخ عمر فتحی کے دولڑکے عبدالعزیز اور محمد علی ہیں اور شیخ حسین فتحی کے چار لڑکے حسن، سراج، ہلال اور احمد ہیں۔ ان دنوں بیت الفتحی مکہ مکرمہ کے متمول ومثقف گھرانوں میں سے ہے۔ تعلیم وتجارت اور ملازمت کے ساتھ معلّمی کا سلسلہ جاری ہے۔ معلم عمر فتحی ساعات اور احجار کریمہ کے تاجر بھی ہیں۔ ان کی دکان مکتب عمر عبداللہ فتحی، حی الشبیکہ مکہ المکرّمہ، سجل تجاری ۲۲۴۱ر کے نام سے باب العمرہ کے سامنے سڑک کے پار واقع ہے۔ ہمارے بڑے والد میاں جی حاجی اسد اللہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ معلم عمر فتحی ہمارے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا خاندان بعد میں پورہ خواجہ اور پرانی بستی میں پھیل گیا تھا اور فتح محمد اسی خاندان کے فرد تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب وہ حج کو گئے تو معلم عمر فتحی سے ملے تھے اور واپسی پر وثوق سے یہ بات کہتے تھے، واللہ اعلم۔ میاں جی جان اللہ اور مولوی نور محمد صاحب وغیرہ کا تعلق ہمارے خاندان سے ہے، جو پرانی بستی اور پورہ خواجہ میں تھے۔

مولوی غریب اللہ

مولوی غریب اللہ عرف میاں تولن مبارکپوری اثنا عشری عالم تھے۔ ان کی اولاد میں تین عالم تھے۔ مولوی غلام عباس، مولوی حسین اور مولوی فتح محمد۔ اتفاق سے تینوں مبارکپور سے ترکِ وطن کرکے دوسرے مقامات پر جا بسے اور ان کی اولاد وہیں پھولی پھلی، اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ ان کے صاحبزادے مولوی غلام عباس کا تذکرہ آرہا ہے۔

مولوی علی حسن فاروقی

مصنف ''واقعات وحادثات مبارکپور''

مولوی شیخ علی حسن بن شیخ غلام مرتضٰی بن شیخ وصی احمد بن شیخ غلام محمد بن شیخ عباد اللہ بن شیخ لطف اللہ بن شیخ رشید بن شیخ مخدوم سعید بن شیخ مخدوم محمد بن شیخ مخدوم خضر فاروقی، ساکن محلّہ پورہ رانی یہاں کے سرکاری مدرسہ میں مدرّس تھے۔ جو موجودہ دفتر ٹاؤن ایریا میں جاری تھا۔ ان کا حال اس سے زیادہ معلوم نہ ہوسکا۔ ۱۸۸۸ء میں فوت ہوئے۔ انھوں نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' کے نام سے ۱۸۸۲ء میں ایک مستقل کتاب لکھی، جس میں نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے دَور سے لے کر ۱۳۰۳ھ تک مبارکپور میں رونما ہونے والے حوادث وفتن کا ذکر نہایت مستند اور مفصل طریقے پر کیا ہے۔ اس کتاب سے قصبہ کی بہت سی اہم تاریخی واردات اور تاریخی شخصیتوں کے بارے میں نادر معلومات ملتی ہیں۔ اس میں اٹھارہ اہم واقعات درج ہیں۔ ۱۸۱۳ء (۱۲۲۸ھ) کی جنگ اور ۱۸۵۷ء کے واقعات بھی ہیں۔ زبان نہایت صاف وشستہ اور طرزِ بیان بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ملاحظہ ہو:

> ''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ بعد حمد پروردگار ونعت رسول مختار ومدح آل اطہار واصحاب کبار وائمہ ابرار کے یہ چند اوراق در بیان واقعات وحادثات قصبہ مبارکپور بفرمائش شیخ گدا حسین صاحب سلمہٗ نمبردار و زمیندار کے یہ راقم شیخ محمد علی حسن بن شیخ غلام مرتضٰی بن شیخ وصی احمد مرحوم یکے از شرفائے قصبہ مذکور

رقم طراز ہے کہ زمانۂ تعلیم مدرسہ میں یہ راقم بھی مدرسہ مبا کپور میں پڑھاتا تھا۔ ایک روز برخوردار بلند اقبال نور بصر شیخ غلام حیدر خلف الرشید شیخ گدا حسین صاحب موصوف بہ عمر نہ سالگی مکتب میں سبق پڑھ رہے تھے کہ تقریباً کسی نے حادثۂ رکھئی شاہی کا ذکر شروع کیا کہ ایسا حادثۂ عظیم کسی نے ساکنانِ قصبہ سے کبھی نہیں سنا اور اس قدر خوں ریزی ہوئی کہ الامان والحفیظ، اس پر برخوردار مسطور نے یہ ارشاد فرمایا کہ قبل آپ لوگوں کے اور بحالت موجودگی ایسے ایسے حوادث ظہور میں آئے، ہم لوگ کیا جانیں گے۔ اگر تذکرہ ان حوادث کا کسی طرح سے تکلیف گوارا فرما کے تھوڑا تھوڑا قلم بند فرمائیں تو ہم لوگوں کو واقفیت ہو اور آئندہ ایک رسالہ مختصر تیار ہو جائے۔ چناں چہ راقم نے باوجود عدیم الفرصتی شغل تعلیم وغیرہ سے حسب خواہش ان کی روزانہ دو دو ایک ایک صفحہ برابر لکھنا شروع کیا۔ ناظرین باتمکین سے التماس ہے کہ اگر کہیں خلاف محاورہ روز مرہ پاویں تو بقلم اصلاح درست فرماویں کہ راقم ان اوراق کا محض طفل مکتب اور باشندہ دیہات کا ہے۔ محاورۂ اُردو سے بالکل بے بہرہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق دبیدہ ازمۃ التحقیق (ص:۲-۳)۔

یہ کتاب مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہے۔ خط کشیدہ ہے، مگر صاف ہے۔ کاغذ بادامی بڑے سائز کے ۸۹ صفحات ہیں۔ ۱۸؍صفر ۱۳۸۸ھ کو مولانا وقار احمد صاحب صدیقی متوفی ۱۳۹۰ھ رحمۃ اللہ علیہ ساکن گھوسی نے اپنے کتب خانہ سے نکال کر راقم کو عنایت فرمایا ہے۔

خلیفہ دین علی شاہ

نابینا ہونے کے باوجود پوربی زبان میں شاعری کے خلیفہ اور استاد تھے۔ پورہ دولہن میں مکان تھا۔ ان کی نظم ''پھول'' کے نام سے بہت مشہور ہے، جس میں دنیا بھر کے پھولوں کے نام اور رنگ و بو کا ذکر ہے۔ یہ نظم برج بھاشا شاعری کا یوں شاہکار ہے کہ اندھے ہونے کے باوجود انھوں نے ایسی شاعری کی ہے۔

مولوی جان محمد

مبارکپور کے مشہور اثنا عشری علماء میں تھے۔ ان کی قبر قصبہ کے پچھّم شاہ کے پنجہ کے روضہ کی جنوبی دیوار کے مغربی گوشے میں ہے۔ ان کی وفات ۲۱؍جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ کو ہوئی۔ قبر کے سرہانے بہت بڑا پتھر نصب ہے۔ جس پر تاریخی اشعار درج ہیں۔ ایک سطر میں ایک مصرعہ ہے:

۷۸۶

تاریخ از تصنیف جناب مولوی سید محمد صاحب دام ظلّہٗ

مولوی جان محمد کہ نظیرش بجہاں — چشم گردوں ہمہ دیدو ہمہ دانست محال
عالم و معدنِ اخلاق و عزیز دلہا — زاہد و عابد و دیں پرور و بوذرؓ بہ مثال
یک جہاں شاہد فضلش ہمہ خاص و ہمہ عام — در کمالش بہ کسی ہیچ نہ قیل است نہ قال
بود بست و یکم از ماہِ جمادی الاولیٰ — کرد آہنگ سفر جانب رب متعال
یا الٰہی بجناں مسکن طیب باشد — ایں دعا از من و آمین زسمک تا بہ ہلال
آتشم ایں مصرعۂ تاریخ بہ قبرش بنوشت — شد بفردوسِ جناں راہ نما پیر و آلِ

۱۳۱۱ھ کتبہ حسن بخش

ملا شیخ عبدالحکیم اسماعیلی

ملا شیخ عبدالحکیم اسماعیلی تیرہویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے میں یہاں کے اسماعیلی فرقہ کے مذہبی پیشوا اور سورت کے بڑے ملا صاحب کی طرف سے عامل تھے۔ شیخ کا لفظ اس فرقہ میں دینی پیشوا کے لیے مخصوص ہے، جو ملا اور عامل سے بلند درجہ ہوتا ہے۔ شیخ عبدالحکیم بمبئی میں کاروبار کرتے تھے اور گجراتی زبان کے جو اس فرقہ کی عربی کے بعد دوسری مذہبی زبان ہے، اچھے عالم تھے۔ ملا رحمت علی اسماعیلی نے مبارکپور میں رہ کر گجراتی زبان انھیں سے سیکھی تھی اور وہی ملا صاحب کو تعلیم کے لیے بمبئی لے گئے اور ان کی تعلیم کا سبب بنے۔ شیخ عبدالحکیم کی ایک لڑکی بمبئی میں ایک اسماعیلی عالم سے بیاہی تھیں۔ ان اسماعیلی عالم سے راقم کی ملاقات ہوئی تھی۔

مولوی حکیم عبداللہ

مولوی حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ لعل عرف لالن بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد، پورہ دولھن کے رہنے والے اور مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب کے والد تھے۔ اپنے زمانے کے طبیب حاذق اور ماہر نباض تھے۔ طبابت کے ساتھ ساتھ گھر پر تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی رکھتے تھے۔ میاں صاحب عبداللہ شفا ساکن کٹرہ آپ کے مشہور شاگردوں میں تھے، بعد میں میاں صاحب سے حکیم الٰہی بخش نے فارسی پڑھی تھی۔ حکیم عبداللہ صاحب کی وفات شب یک شنبہ ۲۶ / ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ میں ہوئی۔

مولانا حافظ حکیم عبدالرّحیم

مولانا حاجی حافظ حکیم عبدالرحیم بن شیخ حاجی بہادر عرف بڑے حافظ صاحب مبارکپور کے مشہور علماء واطباء میں تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپوری کے والد ہیں۔ حفظ قرآن اور قرأت وتجوید کی تعلیم قاضی امام الدین صاحب جونپوری سے حاصل کی اورنحو وصرف ودیگر علوم کی تکمیل مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں مولانا محمد فیض اللہ صاحب مئوی تلمیذ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری اور مولانا محمد حسام الدین صاحب مئوی سے کی اور حدیث کی تحصیل مولانا قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری سے کی۔ جن کو مولانا شیخ عبدالحق بنارسی تلمیذ قاضی شوکانی سے سند حدیث حاصل ہوئی تھی۔ نیز شیخ عبدالحق نے مولانا سخاوت علی جونپوری، مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا احمد اللہ انامی تلمیذ شاہ محمد اسحاق دہلوی اور آخر میں مولانا محمد اسماعیل دہلوی اور مولانا عبدالحئی دہلوی سے تعلیم پائی تھی۔

حافظ عبدالرحیم صاحب نے قاضی شیخ محمد مچھلی شہری سے سند مسلسل بالا ولیہ سند مناولہ بلوغ المرام اور سند اتحاف الاکابر حاصل کی تھی۔ یہ سندیں آپ کے امتیازات میں ہیں۔ چوں کہ ان کے اکثر اساتذہ وشیوخ مسلک اہل حدیث کے داعی تھے اور ترکِ تقلید پر زور دیتے تھے، اس لیے اُن پر اپنے ان اساتذہ کا رنگ غالب رہا اور آپ نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا۔ طبابت کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی گھر پر رکھتے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حافظ صاحب اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے قاضی مبارک اور حمد اللہ جیسی معقولات کی ادق کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ نحو، صرف، عربی، فارسی اور حفظ وتجوید کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ قصبہ کے سینکڑوں حفاظ نے ان کی شاگردی میں حفظ قرآن کی نعمت پائی۔ ان کے مخصوص تلامذہ میں

مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری مصنف ''سیرۃ البخاری'' اور حافظ شاہ نظام الدین صاحب سریانوی تھے۔ موخر الذکر نے اپنے استاد کی طرح زندگی بھر خانگی زندگی میں مصروف رہ کر درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد بڑے حافظ صاحب کا لقب پایا۔

رمضان ۱۳۳۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۲ء میں انتقال فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ہی سے مبارکپور میں مسلک اہل حدیث کا رواج ہوا[1]

حافظ شاہ نظام الدین سریانویؒ

مولانا حافظ شاہ نظام الدین بن شیخ عبدالوہاب المتخلص بہ رضا سریانوی تیرہویں صدی کے نصف میں سریان میں پیدا ہوئے اور والدین کے زیر سایہ گھر کے علمی و دینی اور روحانی ماحول میں پرورش پائی۔ آپ اپنے والد کے سچے جانشین تھے۔ زہد و تقویٰ، علم و فضل، توکل و قناعت، خدمت خلق، عبادت و ریاضت اور تعلیم و تعلم میں پوری زندگی بسر کی۔ ان کی ولایت و بزرگی میں کسی کو شک نہیں تھا۔ اخلاص و محبت کا پیکر اور سادگی و بے تکلفی کا نمونہ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپوری کے والد ماجد مولانا حکیم حافظ عبدالرحیم کے علم و فضل کا شہرہ تھا۔ حافظ نظام الدین نے ان کی خدمت میں قرآن مجید حفظ کر کے قرأت و تجوید کی تعلیم حاصل کی اور ان کی درسگاہ کے ہونہار طالب علموں میں شمار ہوئے۔ حافظ عبدالرحیم نے حفظ و تجوید کی تعلیم مولانا قاضی امام الدین جونپوری سے حاصل کی تھی اور دیگر علوم مولانا فیض اللہ مئوی، مولانا حسام الدین مئوی، مولانا قاضی محمد مچھلی شہری سے حاصل کیے تھے۔ ان کے تمام شیوخ مسلک اہل حدیث کے تھے اور حافظ صاحب بھی اسی مسلک پر

[1] تذکرہ علمائے حال۔ ص: ۴۳۔ و تراجم علمائے اہل حدیث۔ ص: ۳۹۸۔

رہے۔ مگر آپ کے شاگرد رشید حافظ نظام الدین اپنے قدیم مسلک حنفیت پر قائم رہے اور اپنے گھر کو مدرسہ بنا کر اطراف و جوانب میں دینی تعلیم پھیلائی اور ذاتی کاروبار کے ساتھ پوری زندگی یہی مشغلہ جاری رکھا۔ سینکڑوں حفاظ اور کئی علماء آپ کی درسگاہ سے نکلے اور کتنے لوگ دین کی ضروری تعلیم حاصل کر کے اپنے کاروبار میں مشغول ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں دو زبردست عالم ہوئے ہیں، ایک مولانا احمد حسین رسولپوری، جو اُن کے داماد بھی تھے اور دوسرے مولانا شاہ محمد سریانوی۔ حافظ صاحب میری والدہ مرحومہ کے جد مادری ہیں۔

حافظ صاحب ذاکر وشاغل اور روحانی بزرگ تھے۔ ان کے تعلقات جنات سے بھی تھے۔ اس سلسلے میں ان کے عجیب عجیب واقعات مشہور ہیں۔ بے نفسی اور خلوص کے پیکر تھے۔ ایک دفعہ بادلِ ناخواستہ ایک مقدمہ کی گواہی میں جانا پڑا، حاکم مسلمان تھا، اس نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ حافظ قرآن ہیں، حافظ صاحب نے کہا کہ مجھے اس کا دعویٰ نہیں، البتہ میرے استاد بڑے حافظ صاحب واقعی حافظ قرآن تھے۔ پھر حاکم نے کچھ قرآن سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے بھری عدالت میں قرآن سنانا شروع کیا، جب سات پارے سنا چکے تو حاکم نے معذرت کرتے ہوئے بند کرنے کی درخواست کی اور پوچھا کہ آپ کے کتنے حافظ شاگرد ہیں۔ جواب دیا کہ بتیس شاگرد ایسے حافظ قرآن ہیں کہ اگر قبر میں بھی ان کو قرآن سنانا پڑے تو بلا تکلف سنا سکتے ہیں۔

آپ سچے عاشق رسول تھے اور اُردو زبان میں نعت خوب کہتے تھے۔ ان کی دو نعتیں ''نعت محبوب'' از شاہ عبداللہ صاحب شفا مبارکپوری کے آخر میں چھپی ہیں:

پہلا قصیدۂ نعتیہ

ہے تمنا مری یارب کہ میں کعبہ دیکھوں — دل کی بر آتی ہے کب تک یہ تمنا دیکھوں
تیرے محبوب کی جا خلد سے بھی ہے بڑھ کر — کھاتا ہے جس کی قسم تو وہ مدینہ دیکھوں
میں وہ عاجز ہوں کہ کچھ تاب وتواں مجھ میں نہیں — کر مدد میری خدا یا کہ مدینہ دیکھوں

میں گدا ہوں، تو غنی ہے، مری حاجت بَر لا — میرے مولا ترے محبوب کا روضہ دیکھوں
روز میں اپنی طبیعت کو کہاں تک بہلاؤں — کہ گھڑی اس دلِ بیتاب کو سمجھا دیکھوں
اِک زمانہ سے یہی ہے مرے دل کی حسرت — آرزو ہے کہ دیارِ شہِ بطحا دیکھوں
اپنی بخشش کا ہمیں کوئی وسیلہ ہی نہیں — جز محمدؐ کے، خدایا میں مدینہ دیکھوں
حق نے بخشی ہے انھیں دوزخ و جنت کی کلید — حشر میں معنیِ یعطیک فترضیٰ دیکھوں
ہیں گدا اس درِ اقدس کے سبھی جن و بشر — کر مجھے سگ درِ اشرف کا وہ کوچہ دیکھوں
خاک نعلینِ مبارک کی اگر مل جائے — دیدۂ کور کو پھر دیدۂ بینا دیکھوں
اے صبا تجھ کو مبارک ہو اُدھر کا جانا — میں بھی اے کاش! دیارِ شہِ والا دیکھوں
مجھ کو پہنچا تو مدینہ میں برائے محبوب — مجھ کو محبوب مدینہ ہے، مدینہ دیکھوں
دیکھوں میں روضۂ انور کو زبان پر ہو درود — زندگی کا ہے وہی لطف خدایا دیکھوں
کچھ نہ دیکھا جو مدینہ ہی نہ دیکھا اب تک — مجھ کو پہنچا کہ ان آنکھوں سے مدینہ دیکھوں
بہر بوبکرؓ و عمرؓ مجھ کو وہاں تک پہنچا — صدقہ عثمانؓ و علیؓ کا درِ والا دیکھوں

اپنے اللہ سے ہر دم یہ رضا کی ہے دعا
یا خدا میں بھی ان آنکھوں سے وہ روضہ دیکھوں

دوسرا قصیدۂ نعتیہ

جس نے دیکھا ہے ترا کوچۂ آرائے بہشت — اُس کو حاجت نہیں کرنے کی تمنائے بہشت
سیر کوچہ تری ہے رشک تماشائے بہشت — رشک گلزار اِرم غیرتِ گلہائے بہشت
جو بلندی کہ مدینے کے درختوں کی ہے — وہ کہاں ہے تری اے قامت طوبائے بہشت
کرے دربانی ترے کوچہ کی رضواں آکر — یک نظر دیکھے جو یہ کوچۂ زیبائے بہشت
جس کے دل میں ہے تمنائے مدینہ مخفی — اُس کے سر میں نہ سمائے کبھی سودائے بہشت
کیوں نہ صدقے ہو ترے کوچہ پہ گلزار جناں — ہے وہ صدقے سے ترے اے مرے مولائے بہشت
ذاتِ اکرم جو نہ ہوتی تو نہ ہوتا موجود — عرش سے فرش تک اور دوزخ ونعمائے بہشت

ترے کوچے کے تماشہ سے تماشائے جناں　　ہم کو بہتر ہے نہیں اے شہ یغمائے بہشت

گرد روضہ کے پھروں اور تصدق ہوں میں

آرزو ہے یہی اے سید والائے بہشت

حافظ صاحب کا دستور تھا کہ ہر سال رمضان میں تراویح پڑھانے کلکتہ جایا کرتے تھے۔ جب ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں آخری بار جانے کے لیے تیار ہوئے تو اپنے صاحبزادے محمد محسن مرحوم کو ساتھ لیا اور کہا کہ کلکتہ کے احباب سے اس کی ملاقات کرادوں، معلوم نہیں اب کے واپسی ہوتی ہے یا نہیں۔ نیز اب کے اپنے اعزہ واقارب، احباب اور تلامذہ سے اس طرح ملے جیسے کہ یہ آخری ملاقات ہو۔ چناں چہ واقعی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ پورا رمضان نہایت صحت وتندرستی سے گزرا۔ حسب معمول تراویح میں قرآن ختم کیا اور عین عید کے دن کلکتہ میں فوت ہوگئے۔ جس مسجد میں قرآن شریف سناتے تھے، اسی کے سامنے صحن میں دفن کیے گئے اور قبر کے اردگرد معمولی سی چہار دیواری بنادی گئی۔ حافظ صاحب کی وفات ۱۹۰۴ء مطابق یکم شوال ۱۳۲۲ھ کو ہوئی۔

اس حادثۂ فاجعہ پر آپ کے تلمیذ اور داماد مولانا احمد حسین رسولپوری نے عربی میں ۳۳ شعروں کا مرثیہ لکھا ہے، جس میں دل کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیے ہیں۔ یہ قصیدہ ان کے دیوان میں چھپا ہے۔ مطلع یہ ہے:

ذكرى لمن واراه بالقيعان

متصدّع قلبي من الاشجان

حافظ صاحب کی چھ اولاد تھی۔ تین ذکور اور تین اناث۔ (۱) مولانا ممتاز علی، (۲) شمشاد علی، (۳) محمد محسن، یہ عین عنفوانِ شباب میں فوت ہوگئے تھے، (۴) رحیمہ سب اولاد سے بڑی تھیں، یہ میری نانی ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین رسولپوری تھے، (۵) کلثوم اور (۶) خدیجہ، ان کے بطن سے مولانا محمد ظہیر الدین بن شیخ عبدالسبحان حسین آبادی ہیں۔ حافظ صاحب کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد خوب

پھلی پھولی۔ ان کے آخری شاگرد حاجی محمد صابر سریانوی متوفی جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ تھے۔ جنھوں نے اپنے استاد کی یادگار میں ایک دیہات میں مدرسہ نظام العلوم قائم کر کے مدتوں اس میں درس دیا۔ یہ مدرسہ اب بھی جاری ہے۔ نیز سریان میں حافظ صاحب کے مکان کا ایک حصہ آج بھی مدرسہ ہے۔ جہاں مقامی بچے اور بچیاں تعلیم پاتے ہیں اور ان کے گھر سے اب تک فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہے۔ سریان کا نیا مدرسہ نظام العلوم بھی حافظ صاحب ہی کے نام پر ہے۔ ان کی اولاد میں علمی و دینی چرچا اب بھی پایا جاتا ہے اور ان کے تلامیذ التلامیذ اپنے اپنے طور پر دینی خدمت کر رہے ہیں۔

مولوی سلامت اللہ

مولوی سلامت اللہ صاحب دیوریا اور گورکھپور کے اطراف کے رہنے والے تھے۔ گولہ بازار کی مسجد میں مستقل طور سے تعلیم دیتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی یہ درسگاہ مبارکپور کا سب سے بڑا مدرسہ تھی اور یہاں کے اکثر لکھے پڑھے آپ کے شاگرد تھے۔ ان کے تلامذہ میں مولوی عنایت اللہ صاحب ساکن پرانی بستی متوفی ۱۳۹۱ھ آخری عالم تھے۔ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

مولوی اشرف علی بمھوری

مولانا اشرف علی بن شیخ امیر علی موضع بمھور کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے علم وفضل اور شان وشوکت میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ بمھور اور آس پاس کے مواضعات پر ان کا اثر تھا اور ان کے حکم اور مشورہ کے بغیر کوئی اجتماعی کام انجام نہیں پاتا تھا۔ ان کی اولاد میں علم کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۳۲۷ھ میں مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مولوی عبدالصمد مبارکپوری

مولوی عبدالصمد صاحب مبارکپور کے باشندے تھے۔ مگر مستقل قیام بمبئی میں تھا اور یہاں کھانڈار محلے میں ایک چھاپ خانے کے ناظم و مہتمم تھے[۱]

مولوی حکیم امیر علی مبارکپوری سورتی

مولوی حکیم امیر علی مبارکپور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں۔ ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں اپنے بیٹے کے مرنے پر اپنے نو سالہ پوتے محمد یٰسین فغاں کو لے کر سورت چلے آئے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کر کے پوتے کو تعلیم دلائی اور سورت ہی میں ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں انتقال کیا۔ ان کے پوتے محمد یٰسین صاحب فغاں گجرات کے استاذ الشعراء مانے گئے ہیں[۲]

مولوی غلام عباس

مولوی غلام عباس بن مولوی غریب اللہ عرف میاں تولن مبارکپوری تین بھائی تھے اور عجیب بات ہے کہ تینوں الگ الگ مقام پر آباد ہوئے۔ (۱) مولوی غلام عباس بن مولوی غریب اللہ موضع سمبھی میں رہے اور ان کے دو لڑکے بمبئی میں رہ بس گئے، (۲) مولوی علی حسین بن مولوی غریب اللہ نے بردوان کو اپنا مسکن بنایا اور (۳) مولوی فتح محمد بن مولوی غریب اللہ نے بڑہل گنج کو پسند کیا۔ ان کے ایک لڑکے سجاد حسین بڑا گاؤں

---

۱ البلاغ بمبئی ربیع الاول ۱۳۹۰ھ۔

۲ اخبار اردو ٹائمز بمبئی ۹ رستمبر ۱۹۶۹ء۔

گھوسی میں آباد ہوئے اور دوسرے لڑکے عبدالرحیم بڑہل گنج ہی میں رہے۔

مولوی غلام عباس اچھے عالم اور اچھے شاعر تھے، عباسؔ تخلص تھا، مذہباً اثنا عشری تھے۔ ان کا مختصر حال اور مختصر نمونۂ کلام ''خم خانۂ جاوید'' جلد پنجم مصنفہ لالہ سری رام ایم.اے. دہلوی میں مذکور ہے۔ جسے ہم نقل کرتے ہیں:

مولوی عباس صاحب قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کے باشندے ہیں۔ اپنے والد سے عربی و فارسی کی تعلیم پائی۔ عرصۂ دراز سے قصبہ سمبھی میں سکونت پزیر ہیں۔ علم دوست و اخلاق پرست دوست ہیں۔ اکثر اصحاب آپ کے فیضان علمی سے مستفید ہوچکے ہیں۔ عربی و فارسی میں اعلیٰ درجے کی لیاقت ہے۔ احادیث وآیات قرآن کو بے تکلف اردو شعر میں نظم کر دیتے ہیں۔ فن شعر میں آپ کو صابرؔ نظام آبادی سے تلمذ ہے۔ جو حضرت ناسخؔ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ متعدد رسالہ جات میں آپ کا کلام شائع ہوچکا ہے۔ کلام بغایت بامزہ ہوتا ہے، جو پختہ مشقی کا ثبوت ہے۔ آپ جس طرح پرمغز شاعر ہیں، اسی طرح مشاق نثار بھی ہیں۔ عرصے تک اخبارات میں مضامین لکھتے رہے۔ غزل کے علاوہ سلام بھی کہتے ہیں۔ کلام جو منشی محمد احسن صاحب نے روانہ کیا ہے۔ اس کا انتخاب درج ذیل ہے:

جس کو طوفانِ نوح کہتے ہیں تھا وہ طوفان دیدۂ تر کا
نزع میں چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے بس یہ جھگڑا ہے اور دم بھر کا

سنگ اسود کو چومتے ہیں بشر
یہ بھی پتھر ہے کیا ترے در کا

نعت در صنعت غیر منقوط

ملک و ملک و حور کا سردار محمدؐ واللہ دو عالم کا مددگار محمدؐ
ممدوح ہوا مہر و مہ و لوح سما کا اللہ کا وہ محرمِ اسرار محمدؐ

معصوم وہ، محمود وہ، طاہر وہ مطہر   عالم کا مدد اور مددگار محمدؐ
واللہ مرا ہوگا مددگار علَم دار
وہ داد رسِ عام مددگار محمدؐ

اس کے علاوہ خم خانۂ جاوید میں تیس سے زائد غزل کے متفرق اشعار اور تین بند کا ایک مسدّس نمونۂ کلام کے طور پر درج ہے[1] عباسؔ کے تلامذہ میں دو اصحاب کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ ایک ان کے لڑکے منشی غلام حسین عاشق اور دوسرے محمد احسن اللہ عارفؔ ساکن سمبھی ضلع اعظم گڑھ۔

حضرت مولانا ابوالعلی عبدالرحمٰن محدث مبارکپوریؒ

حضرت مولانا، محدث، فقیہ، مفتی حکیم ابوالعلی عبدالرحمٰن بن حافظ عبدالرحیم بن شیخ حاجی بہادر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی پورے عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں مشہور و متعارف ہے اور ہمارے تعارف کی مطلق محتاج نہیں ہے۔ ''تحفۃ الاحوذی'' شرح جامع ترمذی آپ کی وہ شہرۂ آفاق اور مقبول کتاب ہے، جو علمائے سلف اور محدثین کی تصانیف کی ہمسری کرتی ہے۔ فی الجملہ آپ کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔

آپ کے دادا حاجی بہادر قصبہ کے ممتاز شخص تھے۔ شنبہ ۲۸ محرم ۱۲۵۸ھ کو مبارکپور میں ایک خونی ہنگامہ ہوا، جس میں دو شخصوں کو پھانسی ہوئی۔ اس فتنہ و فساد میں حاجی بہادر اور حاجی جہانگیر پر بعض الزامات لگائے گئے اور اس حادثے کے بعد ان دونوں صاحبان نے حج کیا[2]

مولانا کے والد ماجد حافظ عبدالرحیم عالم باعمل اور مشہور طبیب تھے۔ ان کے تین

---

[1] خم خانۂ جاوید۔ ج:۵۔ ص:۵٦۸ تا ۵۷۱۔

[2] واقعات و حادثات مبارکپور۔ ص:۴۵۔

لڑکے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن محدث، مولوی حکیم محمد شفیع اور شیخ محمد علی، مولانا عبدالرحمٰن لاولد فوت ہوئے۔ حکیم محمد شفیع کی اولاد پھلی پھولی اور اس میں علمی وطبی سلسلہ جاری رہا اور شیخ محمد علی کے صاحبزادے مولوی محمد اصغر صاحب تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن ۱۲۸۳ھ میں محلہ پورہ صوفی میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کا گھر قصبہ کا مدرسہ تھا، اس کے بعد قصبہ کے اطراف کے علماء واساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ مولوی خدابخش مہراج گنجی، مولوی محمد سلیم پھریہادی متوفی ۱۳۳۴ھ مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اور مولانا فیض اللہ مئوی سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور نورالانوار وغیرہ پڑھ کر مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور گئے، جو اُن دنوں مشرقی یوپی کی مشہور علمی ودینی درسگاہ تھی اور اس میں نامی گرامی اساتذہ درس دیتے تھے۔ مولانا کے والد بھی اسی درسگاہ سے فیضیاب تھے۔ ان کی مرضی اور اجازت سے چشمۂ رحمت گئے۔ جہاں مولانا حافظ عبداللہ مئوی غازیپوری کے علومِ دینیہ اور مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے علومِ عقلیہ وادبیہ کا فیض جاری تھا۔ مولانا نے ان دونوں حضرات سے متوسطات اور منتہی کتابیں تک پڑھیں اور یہیں نحو وصرف، ادب، عربیت، معانی، بیان، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، فقہ، اصول حدیث، تفسیر وغیرہ مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی۔ یہاں پانچ سال رہ کر مولانا عبداللہ غازیپور کے ایما پر مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشکوٰۃ، جلالین، بلوغ المرام، اوائل ہدایہ، تفسیر بیضاوی، اکثر نخبۃ الفکر، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کے اواخر اور سنن ابن ماجہ کے اوائل پڑھے۔ نیز قرآن مجید کے چھ پاروں کا ترجمہ سنا اور سند حاصل کی۔ اس کے بعد علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری خزرجی یمانی سے صحاح ستہ، مؤطا امام مالک، مسند دارمی، مسند امام شافعی، مسند امام احمد بن حنبل، الادب المفرد، معجم طبرانی الصغیر اور سنن دارمی کے اطراف پڑھ کر ان کتابوں کی روایت کی اجازت حاصل کی اور اپنے والد کی طرح مولانا قاضی

محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری سے ۱۳۱۳ھ میں حدیث مسلسل بالاولیت کی سند لی۔

مولانا سید نذیر حسین دہلوی کا سلسلۂ سند یوں ہے، عبدالرحمٰن عن الشیخ السید نذیر حسین الدہلوی عن الشاہ محمد اسحاق الدہلوی عن مسند الوقت الشاہ عبدالعزیز الدہلوی عن بقیۃ السلف الشاہ ولی اللہ الدہلوی عن الشیخ ابراہیم الکردی۔ اس کے علاوہ مولانا سید نذیر حسین نے مزید تین سلاسل سے حدیث کی روایت کی ہے، جو المکتوب اللطیف اور مقدمۂ عین المعبود میں مذکور ہے۔

شیخ حسین یمانی کا سلسلۂ سند یہ ہے، عبدالرحمٰن عن الشیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی عن الشیخ عبدالباری الاہدل والشیخ محمد ناصر الحازمی والشیخ احمد بن محمد الشوکانی وکلہم عن الامام الشوکانی۔

مولانا قاضی محمد مچھلی شہری کا سلسلۂ سند یہ ہے، عبدالرحمٰن عن الشیخ محمد المچھلی شہری الجونفوری عن الشیخ عبدالحق البنارسی، عن القاضی الشوکانی۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی سلاسل ہیں، جو امام شوکانی سے ملتے ہیں۔ ان کی سند حدیث مسلسل بالاولیت یہ ہے:

"قلت سمع منی اولا ھذا الحدیث المسلسل بالاولیہ المولوی عبدالرحمن بن الحافظ عبدالرحیم من اھل مبارکفور فاجزتہ انہ یرویہ عنی بالشروط المعتبرۃ عند مھرۃ ھذا الفن، واوصیہ بتقوی اللہ فی السر والعلن، وعدم القبول بالراء فی معنی الحدیث واتباع السلف الصالح فی فھم مرادہ واسئال اللہ ان یوفقہ لذالک ویختم لی ولہ بخیر وکتبہ محمد بن عبدالعزیز المدعو بشیخ محمد بخطہ فی ۱۳۱۳ من الھجرۃ"[1]

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ ص:۵۔

اسی سند پر مولانا نے فاتحۂ الفراغ پڑھی اور ۱۳۱۳ھ میں جملہ مروجہ علوم وفنون سے فراغت حاصل کی اور اسی سال مدرسہ دار التعلیم کی بنیاد رکھی۔

مولانا نے فراغت کے بعد تعلیمی وتدریسی مشغلہ اختیار کیا اور مبارکپور میں مدرسہ دار التعلیم قائم کیا۔ پھر بلرام پور (گونڈہ) میں ایک مدرسہ قائم کیا، کچھ دنوں اس میں تعلیم دی اور پھر وہاں سے اللہ نگر (گونڈہ) کے مدرسے میں تعلیم دی۔ اس کے بعد ضلع گونڈہ کے مدرسہ سراج العلوم میں تشریف لائے، جو آپ ہی کے لیے قائم کیا گیا تھا، یہاں کافی دنوں تک تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اسی زمانے میں آپ کے استاذ مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) کے صدرِ مدرّس تھے۔ شاگرد نے استاد کی طلب پر مدرسہ احمدیہ آرہ کا رخ کیا، اس زمانے میں مولانا ابومحمد ابراہیم آروی اس مدرسہ کے ناظم تھے۔ انھوں نے مولانا کو مدرّسِ اوّل مقرر کیا اور استاد وشاگرد دونوں ایک ساتھ دینی وعلمی خدمت انجام دینے لگے۔ اس دوران میں مولانا کی علمی قابلیت کا شہرہ ہوگیا اور دُور دُور کے اہلِ مدارس کی نظر آپ پر اٹھنے لگی۔ چناں چہ مدرسہ دار القرآن والسنہ کلکتہ کے ناظم نے مولانا کو دعوت دی اور مولانا اپنے استاد کی اجازت ومرضی کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ چند سال وہاں تدریسی خدمت انجام دی۔ مولانا کے تعلیمی وتدریسی سفر کی یہ آخری منزل تھی۔ اس کے بعد کسی مدرسہ میں نہیں گئے، بلکہ تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے۔

مولانا نے ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۳ھ تک مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی کے یہاں تصنیفی وتالیفی کام کیے۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے سنن ابوداؤد کی ایک نہایت بسیط شرح غایت المقصود کے نام سے لکھی تھی۔ بعد میں ابوداؤد کی ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اس میں مدد کے لیے مولانا عبدالرحمٰن کو دعوت دی اور مولانا نے تقریباً چار سال تک ان کے ساتھ رہ کر ''عون المعبود'' شرح سنن ابی داؤد کی تصنیف وتالیف

میں پوری مدد کی۔ ''عون المعبود'' شائع کردہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ کے مقدمہ نگار شیخ عبدالرحمٰن محمد عثمان نے لکھا ہے:

''کتب العلامة ابوالطیب شمس الحق العظیم آبادی وتوفر علی معاونة فی اکماله العلامة ابوالعلیٰ محمد عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم المبارکفوری صاحب تحفة الاحوذی مُدَّة اربع سنین حتی تم علی احسن مایکون احاطةً وشمولةً وایضاحاً، لکل مشکل وابانة عن کل معنی نفیس''[1]

''عون المعبود'' میں تعاون واشتراک کے بعد مولانا نے ''تحفۃ الاحوذی'' کا کام یوں شروع کیا کہ گھر کو مدرسہ اور دارالتصنیف بنا کر تدریس وتالیف کا شغل اختیار فرمایا۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علم وعمل سے بھر پور نوازا تھا۔ دقتِ نظر، حدت ذہن، ذکاوت طبع اور کثرتِ مطالعہ کے اوصاف وکمالات نے آپ کو جامع شخصیت بنا دیا تھا۔ خاص طور سے علم حدیث میں تبحر وامامت کا درجہ رکھتے تھے۔ روایت کے ساتھ درایت کے مالک اور جملہ علوم آلیۃ واصلیۃ میں یگانۂ روزگار تھے۔ طب وحکمت خاندانی ورثہ میں ملی تھی۔ قوت حافظہ بھی خداداد تھی۔ بینائی سے محروم ہوجانے کے بعد بعض درسی کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھا کرتے تھے اور ہر قسم کے فتاویٰ لکھوایا کرتے تھے۔ معقولات کے زبردست عالم تھے۔ ایک عالم جنھوں نے مولانا سے ''تصریح'' پڑھی تھی، اپنا تاثر یوں ظاہر کیا کہ مولانا سے تصریح پڑھنے کے بعد ہی مجھے علم فلکیات کی حقیقت معلوم ہوئی۔ راقم طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو دریافت فرمایا کہ کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ شرح وقایہ اور مرقات وغیرہ، فرمایا کہ منطق میں بہت پیچھے ہو، اس میں محنت کرو۔ مولانا اپنی تصانیف میں مجتہدانہ شان رکھتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ عون المعبود۔ ص: ۷۔

روایت و درایت کے امام معلوم ہوتے ہیں۔ فقہاء خاص طور سے احناف کے بارے میں نہایت شدید رویہ رکھتے تھے اور بڑی شدومد سے ان کا رد کرتے تھے۔ مگر یہ معاملہ صرف تصانیف تک محدود تھا جو سراسر علمی و تحقیقی تھا۔ ہر مکتب خیال کے لوگ مولانا سے علمی مسائل دریافت کرتے تھے اور وہ ہر مسلک والے کو اس کے مسلک کے مطابق مسئلہ بتایا کرتے تھے۔ مولانا بھی اپنے والد ''بڑے حافظ'' صاحب کی طرح ''بڑے مولانا صاحب'' کے لقب سے متعارف تھے۔

مولانا کی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی۔ علم و فضل، تقویٰ، طہارت، زہد و قناعت انزواء و عزلت اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے۔ دنیا میں رہ کر دنیا سے بیگانہ رہے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، طبابت و حکمت زندگی کے مشاغل تھے۔ خشیت الٰہی کا غلبہ تھا۔ سنا ہے کہ جہری نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، کیوں کہ رو دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک عزیز شیخ محمد شبلی کا انتقال ہوا، مولانا نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تو آخری تکبیر میں بے قابو ہو گئے اور مشکل سے تکبیر پوری کر سکے۔ اس جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ مشہور ہے کہ دس بارہ سال تک گھر سے باہر نہیں نکلے اور مکان و مسجد کے علاوہ کہیں نہیں گئے۔ ایسے کئی واقعات مشہور ہیں کہ قصبہ میں کہیں گئے تو راستہ بھول کر کہیں کے کہیں چلے گئے۔ توکل کا یہ عالم تھا کہ سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود نے خاص طور سے دارالحدیث مکہ مکرمہ کی مدرسی کے لیے گراں قدر مشاہرے پر مولانا کو طلب کیا، مگر آپ نے جواب دیا کہ میں فی الحال ''تحفۃ الاحوذی'' کی تکمیل میں ہوں، اس کے بعد سوچوں گا۔ اسی طرح دارالحدیث رحمانیہ کی صدر مدرسی کے لیے معقول مشاہرہ پر آپ کی طلبی ہوئی، مگر آپ نے گوشۂ عافیت و قناعت نہیں چھوڑا۔

براہِ راست عامل بالحدیث تھے۔ صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ماورد بہ الکتاب والسنۃ پر ایمان رکھتے تھے۔ ''تحفۃ الاحوذی'' میں اس سلسلے میں ان کے خاص مختارات بھی ہیں۔ ان کی ہیئت یہ تھی، قد میانہ، بدن گداز، رنگ گندمی، چہرہ خوبصورت

ابھرا ہوا سفید گاڑھے کا مغلئی پائجامہ، نیچا کرتہ، گول ٹوپی، کندھے پر بڑا رومال، ہاتھ میں چھڑی۔ نزول الماء کی وجہ سے دونوں آنکھوں سے آخری وقت میں معذور ہو گئے تھے۔

مولانا کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں عرب وعجم کے علماء شامل ہیں۔ چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں: مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری صاحبِ سیرۃ البخاری، شیخ عبداللہ نجدی قویعی، چند سال پہلے تک مصر میں موجود تھے، اب معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا نہیں، شیخ علامہ ڈاکٹر محمد بن عبدالقادر تقی الدین الہلالی المراکشی حال استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، ست رقیہ بنت شیخ خلیل بن شیخ محمد بن شیخ محسن انصاری یمانی، مولانا عبیداللہ مبارکپوری صاحب مرعاۃ المصابیح، مولانا حکیم الٰہی بخش مبارکپوری، مولانا محمد محمود معروفی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا عبدالصمد حسین آبادی، مولانا نذیر احمد املوی، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی جے پوری، مولانا محمد اسحاق آروی، مولانا عبدالرحمٰن نگرنہسوی، مولانا ابوالنعمان عبدالرحمٰن مئوی، مولانا نعمت اللہ بردوانی، مولوی عبدالرزاق صادق پوری، مولوی محمد جعفر ٹونکی، مولوی عبدالحکیم فتح پوری، مولوی محمد اسماعیل مبارکپوری، مولوی محمد اصغر مبارکپوری وغیرہ۔

مولانا کے تبحر علمی اور علم حدیث میں مہارت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں۔ یوں تو آپ کی بہت سی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف ہیں، مگر ان میں ''تحفۃ الاحوذی'' شرح جامع ترمذی کو اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام اور عرب ممالک میں جو شہرت ومقبولیت دی ہے، شاید متاخرین علمائے ہند میں سے کسی کی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ اسی طرح ابکار المنن اور تحقیق الکلام آپ کے تبحر علمی کا شاہکار ہیں۔ نیز عون المعبود شرح سنن ابوداؤد کی تالیف وتصنیف میں آپ کی صلاحیت نے چار چاند لگائے۔ آپ کی تصانیف اور ان کا مختصر تعارف یہ ہے:

(۱) تحفۃ الاحوذی:۔ شرح جامع الترمذی مع مقدمہ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۱۳۴۶ھ میں چھپی، دوسری جلد کی اشاعت کے بعد مولانا کو ضعفِ بصارت اور

نزول الماء کی شکایت ہوئی اور آخری دونوں جلدوں کی تبییض کے لیے علماء کی ایک جماعت نے کام کیا۔ سیرۃ البخاری کے حاشیے میں تحفۃ الاحوذی کی حسب ذیل خصوصیات کا ذکر ہے: (۱) جامع ترمذی کے ہر راوی کا بقدر ضرورت ترجمہ (۲) جملہ احادیث کی تخریج یعنی امام ترمذی کے علاوہ کن محدثین نے کن کن کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔ (۳) امام ترمذی نے ''فی الباب'' کے عنوان سے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی مفصل تخریج، دیگر احادیث کی بھی حسب ضرورت تخریج (۴) احادیث کی تخریج وتحسین میں امام ترمذی کا تساہل مشہور ہے، اس لیے ہر حدیث کی تخریج وتحسین کے متعلق دیگر ائمہ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں اور جہاں امام ترمذی سے تساہل ہوا، اس کی تصریح کی گئی ہے (۵) سند اور متن کے اشکالات کا حل اور ان کی ایضاح (۶) احادیث کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں مقلدین اور اہل اہوا کی تغلیط (۷) اختلاف مذاہب کے بیان میں ہر مذہب کے دلائل بیان کر کے مذہب راجح کے ساتھ مذہب مرجوح کے حوالے دیے گئے ہیں۔

چوں کہ مولانا مسلک اہل حدیث کے پیشوا اور امام تھے، اس لیے اس شرح میں مذاہب اربعہ کے مقلدین خصوصاً علمائے احناف میں متاخرین ومعاصرین کا شدومد کے ساتھ رد کیا ہے۔ پچاسوں سال پہلے رجال واسناد اور متون واحادیث پر بحث کے ساتھ جرح وتعدیل اور تخریج احادیث کا کام بہت مشکل اور بہت ہی دقت طلب تھا۔ آج کل احادیث کی تخاریج وفہارس پر بہتر سے بہتر قدیم وجدید کتابیں شائع ہوگئی ہیں اور ان کی مراجعت سے یہ کام نہایت آسانی سے فوراً ہو جاتا ہے۔ کنوز مفتاح السنۃ، تحفۃ الاشراف، المعجم المفہرس وغیرہ کی اشاعت وطباعت کے بعد یہ کام بہت آسان ہوگیا ہے۔ مولانا نے یہ خدمات اس وقت انجام دی ہیں، جب کہ ان کتابوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ تحفۃ الاحوذی پہلے ہندستان میں چھپی، پھر ۱۳۸۵ھ میں مدینہ منورہ کے ایک مکتبہ نے مصر میں طبع کرا کر دس جلدوں میں شائع کی۔ اس کے بعد ہندوستانی نسخے کا آفسیٹ فوٹو

بیروت سے شائع ہوا۔ یہ تینوں مطبوعہ نسخے ہم نے دیکھے ہیں اور عام طور سے عرب ممالک میں بکتے ہیں۔

(۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی:۔ اس میں علم اصولِ حدیث کے اہم مباحث اور جامع ترمذی پر نہایت نادر معلومات ہیں۔ یہ مقدمہ بجائے خود علم حدیث پر ایک مستقل کتاب ہے۔ مولانا نے اس کے مسودے میں جگہ جگہ بیاضات چھوڑی تھیں اور تحفۃ الاحوذی کی تکمیل کے بعد اس کی تکمیل کا ارادہ تھا، مگر اس کا موقع نہ مل سکا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے تلامذہ میں سے مولانا عبدالصمد حسین آبادی اور مولانا عبیداللہ صاحب مبارکپوری نے اس کی تکمیل کی، تشنہ مباحث کو پورا کیا، بیاضات واشارات کے ابواب وفصول تحریر کیے اور یہ مقدمہ ۱۳۵۹ھ میں شائع ہو سکا۔ تحفۃ الاحوذی کے ساتھ بیروت میں مقدمہ بھی آفسیٹ فوٹو پر چھپا ہوا ہے۔ مولانا نے مقدمہ میں کتب احادیث کے مخطوطات اور نوادر کے بارے میں نشان دہی کی ہے کہ فلاں کتاب یورپ اور ایشیا کے فلاں فلاں کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ کام بھی پچاسوں سال پہلے دشوار تھا اور آج جب کہ دنیا کے ہر مشہور کتب خانے کی مفصل فہرست اور کیٹلاگ مرتب ہو کر چھپ چکی ہے، گھر بیٹھے دنیا بھر کے کتب خانوں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ چوں کہ ادھر پچھلے سالوں میں یورپ اور ایشیا میں متعدد جنگیں ہو چکی ہیں اور انقلابات آچکے ہیں، اس لیے بہت سے ممالک کے کتب خانوں پر زوال آیا اور ان کے نظام میں ابتری پیدا ہوئی۔ ان کی کتابیں اِدھر سے اُدھر ہوئیں اور بہت سی کتابیں غائب ہو گئیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس مقدمہ کی نشان دہی بعض کتابوں کے بارے میں بے محل معلوم ہوتی ہو۔

(۳) ابکار المنن فی تنقید آثار السنن:۔ مولانا محمد ظہیر احسن حنفی نیموی بہاری متوفی ۱۳۲۲ھ نے بلوغ المرام کے طرز پر آثار السنن لکھی، جس میں فقہ حنفی کے مطابق احادیث کو جمع کیا۔ نیز احادیث کی تصحیح وتضعیف کی۔ مولانا نے اس کے جواب میں ابکار المنن لکھی اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”ھذہ فوائد علقتھا علی آثار السنن وعلی تعلیقہ المسمی بالتعلیق الحسن وعلی تعلیقہ المسمی بتعلیق التعلیق کلھا للمرلوی ظھیر احسن النیموی اکثرھا اعتراضات علیہ ومناقشات لہ ومباحث معہٗ“۔

(۴) تحقیق الکلام فی وجوب القرأۃ خلف الامام (اردو):۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قرأۃ خلف الامام کے معرکۃ الآراء مسئلہ پر ہے، اس میں اس کے وجوب کو ثابت کرنے کے ساتھ حنفیہ کے دلائل کے جوابات دیے گئے ہیں۔ دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوا اور دوسرا حصہ ۱۳۳۵ھ میں پھر ۱۳۵۵ھ میں چھپا۔ مولانا کی یہ کتاب بھی ان کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

(۵) خیر الماعون فی منع الفرار عن الطاعون (اردو):۔ اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں ان احادیث وآثار کا ذکر ہے، جو طاعون زدہ مقام سے بھاگنے کے عدم جواز پر دلالت کرتے ہیں اور دوسرے حصہ میں جواز کے قائلوں کے دلائل اور ان کے جوابات ہیں۔

(۶) المقالۃ الحسنٰی فی سنیۃ المصافحۃ بالید الیمنی (اردو):۔ اس رسالہ میں داہنے ہاتھ سے مصافحہ کو سنت قرار دیا گیا ہے۔

(۷) کتاب الجنائز (اردو):۔ اس میں میت اور جنازہ کے مسائل اور احکام درج ہیں۔

(۸) نور الابصار (اردو):۔ دیہات میں جمعہ کے وجوب پر یہ رسالہ ہے۔

(۹) ضیاء الابصار بتائید نور الابصار (اردو)۔

(۱۰) تنویر الابصار بتائید نور الابصار (اردو):۔ یہ دونوں مختصر رسالے دراصل نور الابصار کے ابواب ہیں۔ جن کو مستقل نام دے کر الگ الگ شائع کیا گیا ہے۔

(۱۱) القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید (اردو):۔ یہ مختصر رسالہ تکبیراتِ عیدین کے بیان میں ہے۔

ان کتابوں کا ذکر مقدمہ تحفۃ الاحوذی کے آخر میں مولانا کے حالات میں موجود ہے اور تذکرۂ علمائے حال میں ۱۳۱۵ھ سے پہلے آپ کی تصانیف میں رسالہ ترجمان کا ذکر موجود ہے۔

ان مطبوعہ کتب ورسائل کے علاوہ مولانا کی متعدد کتابیں اور رسائل غیر مطبوعہ ہیں۔ اور یہ سب اردو میں ہیں۔ مثلاً (۱) الدر المکنون فی تائید خیر الماعون (۲) الوشاح الابریزی فی حکم الدواء الانگلیزی (۳) ارشاد الہائم الی منع خصاء البہائم (۴) الکلمۃ الحسنیٰ فی المصافحۃ بالید الیمنیٰ (ناتمام) (۵) رسالہ فرائض کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بیان میں (ناتمام) (۶) مسائل عشر (ناتمام)۔

مولانا نے اپنے استاد سید نذیر حسین دہلویؒ کے فتاوے کو مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی فرمائش پر دو ضخیم جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کے ساتھ اپنے استاذ مولانا عبداللہ غازیپوری کے فتاوے بھی فقہی ابواب پر جمع کیے، جواب تک چھپ نہیں سکے ہیں اور خود مولانا کے بہت سے مطول اور مختصر فتاوے کئی جلدوں میں آسکتے ہیں، جن کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی ہے۔ مجموعہ فتاوائے نذیریہ میں بھی مولانا کے بہت سے فتاوے درج ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ ذوق اس کی طرف توجہ کرے تو بڑا کام ہوسکتا ہے۔

آخری زمانے میں مولانا کو نزول الماء یعنی موتیا بند کا مرض لاحق ہوگیا تھا اور دونوں آنکھوں سے معذور ہوچکے تھے۔ رجب ۱۳۵۳ھ میں تحفۃ الاحوذی کی چوتھی جلد چھپوانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور اس سلسلے میں آنکھ کا علاج بھی کرایا۔ ایک آنکھ کا آپریشن ہوا جو کامیاب رہا۔ وطن آنے کے بعد اختلاجِ قلب کا دورہ پڑنے لگا۔ نصف شعبان اور پورا رمضان بڑی تکلیف میں گزرا اور دورۂ قلب کے بار بار ہونے سے امید و یاس کا عالم رہا اسی دوران میں بخار بھی رہنے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۶؍شوال ۱۳۵۳ھ

کو احادیثِ رسول کا یہ مہرِ درخشاں رات کے پچھلے پہر غروب ہو گیا، رحمۃ اللہ علیہ۔ اور اسی دن عصر کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ جو قصبہ کے پچھّم طرف روضہ کے احاطے میں عیدگاہ کی قبلی دیوار سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اور قبر کے سرہانے تاریخ وفات کا کتبہ نصب ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب المتوفی ۱۶؍شوال ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۵ء آپ کا جنازہ جنازۂ مشہودہ تھا۔ شاید مبارکپور کی تاریخ میں اس سے پہلے کسی میت کے جنازے میں اتنا بڑا مجمع شریک نہیں ہوا تھا۔ آپ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے حال ص ۴۳، تراجم علمائے اہل حدیث، مقدمہ تحفۃ الاحوذی، مجلّہ الحج مکہ مکرمہ کے دو نمبرات، معجم المولفین شیخ محمد رضا کحالہ، نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۲۴۲، مقدمہ مختارات الاحادیث والحکم النبویہ عبدالوہاب عبداللطیف مصری ص ۲۰۔

حضرت مولانا ابوالامجد عبدالعلیم رسولپوریؒ

حضرت مولانا حاجی حکیم مفتی ابوالامجد عبدالعلیم بن شیخ عبدالرحیم عرف باب اللہ بن شیخ جمال الدین عرف جمن بن شیخ بھکاری بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسولپوری مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد شیخ کھیدو تین بھائی تھے، زین الدین عرف زین، جمال الدین عرف جمال اور کھیدو۔ یہ تینوں بھائی دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل میں بعہد بادشاہ جہاں گیر کھورہٹ کے پاس موضع اماری کساری سے ترک وطن کر کے رسولپور میں آباد ہوئے۔ اس بستی میں ان کی اولاد پھلی پھولی۔

شیخ عبدالرحیم عرف باب اللہ کے پانچ لڑکے تھے۔ (۱) یار محمد، (۲) لعل محمد، (۳) ولی محمد، (۴) عنایت اللہ، (۵) احمد حسین۔ ان پنج تنوں میں دو شیخین ہوئے، ایک لعل محمد جو بعد میں مولانا عبدالعلیم کے نام سے علمی دنیا میں مشہور ہوئے اور دوسرے مولانا احمد حسین جو راقم کے جد مادری ہیں۔

مولانا عبدالعلیم رسولپور میں ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۸۰ھ کے درمیان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا شیخ جمن باخدا اور بزرگ شخص تھے اور ایک مشہور روحانی بزرگ سے بیعت تھے۔نماز ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔نمازِ فجر غلس میں ادا کرتے تھے۔ساتھ ہی اپنے یہاں کے خوشحال اور مالدار آدمی تھے۔مولانا عبدالعلیم کی تعلیم وتربیت میں ان کے دادا شیخ جمن اور نانا شیخ چاند گرہست (محلّہ پورہ صوفی مبارکپور) کا بڑا ہاتھ تھا اور ان دو بزرگوں نے ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی۔مولانا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور فارسی کی تعلیم املو میں ایک میاں صاحب سے حاصل کر کے مبارکپور میں میاں صاحب جان محمد سے تکمیل کی۔اس کے بعد گورکھپور گئے اور متوسطات کی تعلیم حاصل کی۔افسوس کہ یہاں کے اساتذہ کے نام معلوم نہ ہو سکے۔اس کے بعد مرزاپور میں مولانا ابوالخیر معین الدین بن خیرات علی حسینی کڑوی متوفی ۱۳۰۴ھ سے چند ماہ تعلیم حاصل کی۔مولانا معین الدین کڑوی نے مولانا عبدالحکیم بن عبدالرب فرنگی محلی، مفتی ظہوراللہ اور محدث مرزا علی حسن سے تعلیم حاصل کی تھی۔مرزاپور کے بعد مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ کی خدمت میں لکھنؤ پہنچے اور ان سے فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور اسطرلاب کی تعلیم حاصل کی۔پھر مولانا مفتی ابوالحیاء محمد نعیم بن مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی سے حدیث کی تکمیل کی اور ان ہی کے ہاتھ پر بیعت کی۔اس کے بعد بنارس میں مولانا حکیم عبدالعلی صاحب لکھنوی سے علم طب کی تحصیل کر کے ان ہی کے یہاں نسخہ نویسی سیکھی۔اس زمانے کا مجموعہ نسخ ایک بیاض کی شکل میں اب تک موجود ہے۔موجز کی ابتدا ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ میں کی تھی، جیسا کہ اس کتاب میں ان کے قلم سے درج ہے۔یہ عجیب بات ہے کہ سراپائے غم اور دوسری کتابوں میں مولانا عبدالحیٔ کے تلامذہ کے ذکر میں اعظم گڑھ کے متعدد علماء کا نام موجود ہے، مگر مولانا عبدالعلیم کا نام نہیں ہے، حالاں کہ ان کی متعدد کتابوں پر میں نے ان کے قلم سے مولانا عبدالحیٔ سے تلمذ کی تصریح دیکھی ہے۔مولانا نے جن شیوخ واساتذہ سے علم حدیث کی تکمیل کی ہے اپنی سند

میں ان کے ناموں کی تصریح کی ہے ان میں ان کے ان دونوں فرنگی محلی شیوخ کے اسمائے گرامی بھی ہیں۔ چناں چہ ان کی سند میں ہے:

''منهم العلامة الجليل رحلة عصره معتمد دهره، ذوالتصانيف الجليلة، مجدد دين الله علىٰ راس ثلثمائة والف شيخنا وسيدنا مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی الكنوی ومنهم العارف الربانی فقيد المثل والثانی معتمد العلم والعلماء ولی من اولياء الله شيخنا وسيدنا ومولانا ابوالحيا محمد نعيم الكنوی من احفاد الملا نظام الدين صاحب السلسلة النظامية''۔

معلوم نہیں ان کو مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے تلامذہ کی فہرست میں کیوں نہیں ذکر کیا گیا۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں اطراف لکھنؤ کی ایک ریاست میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد قصبہ مئو میں شیخ نور علی عباسی کے مدرسے میں جو اُن کے مکان کے ایک حصے میں تھا، تعلیم دی۔ وہیں پر شیخ عبدالمجید اسسٹنٹ کلکٹر کے لڑکوں نے آپ سے تعلیم حاصل کی اور جب شیخ عبدالمجید کا تقرر غازیپور ہوا تو مولانا نے چشمۂ رحمت غازیپور میں تدریسی خدمت کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس مدرسہ کو مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ۱۲۸۶ھ میں قائم کیا تھا۔ اس زمانے میں مدرسہ چشمۂ رحمت میں مولانا حافظ عبداللہ مئوی غازیپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا امانت اللہ غازیپوری اپنے ذوق اور معیار کے مطابق خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا کے جانے کے بعد اس فرنگی محلی درسگاہ میں وہیں کے ایک فاضل کا اضافہ ہوا۔ یہاں آنے کے بعد مولانا نے متوسطات سے لے کر منتہی کتابوں تک کا درس دینا شروع کیا۔ آپ کے برادر خورد مولانا احمد حسین رسولپوری نے یہیں پر ان سے ۱۳۰۹ھ سے پہلے نورالانوار اور میبذی وغیرہ پڑھی۔

اسی زمانے میں مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب بناری نے ان سے حدیث پڑھ کر سند فراغت لی۔ ۱۳۱۵ھ میں ان کی تعلیمی اور تدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اسی زمانے میں تذکرۂ علمائے حال میں آپ کے بارے میں لکھا گیا کہ مولوی عبدالعلیم صاحب مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کے مدرس ہیں۔ اکثر طلباء آپ سے مستفیذ و کامیاب ہوئے اور ہوتے ہیں[1]

مولانا چشمۂ رحمت میں گئے تو آخری وقت تک اس سے جدا نہ ہوئے اور کم و بیش ۳۵ رسال تک یہاں صدرِ مدرّس کے فرائض انجام دیے اور اس پوری مدت میں مفتی شہر بھی رہے۔

مولانا عبدالعلیم کو مولانا عبدالحیٔ اور مفتی محمد نعیم کی شاگردی اور صحبت نے حنفی مسلک اور فقہ حنفی میں بہت ہی صاحب نظر بنا دیا تھا۔ اس زمانے میں علمائے اہل حدیث اور علمائے احناف میں جگہ جگہ مناظرے اور مناقشے جاری تھے اور طرفین میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔ مئو اور مبارکپور وغیرہ میں اس زمانے میں مسلک اہل حدیث کے اچھے اچھے علماء تھے اور مولانا عبدالعلیم ان کے مقابلے میں حنفیت کے علم برداروں میں تھے۔ چناں چہ قیامِ مئو کے زمانے ہی میں مولانا عبداللہ مئوی غازیپوری سے چند مختلف فیہ مسائل میں تحریری مناظرہ و مباحثہ شروع ہو چکا تھا۔ بعد میں جب مولانا چشمۂ رحمت میں پہنچے تو وہاں مولانا عبداللہ صدر مدرّس تھے اور ان کی علمی شہرت عام تھی۔ ان ہی ایام میں شہر غازیپور میں احناف اور اہل حدیث کے درمیان آمین بالجہر اور رفع یدین پر بحث و مباحثہ اٹھ کھڑا ہوا اور اہلِ حدیث اس کے لیے مصر تھے۔ اس جھگڑے میں احناف کے سربراہ مولانا عبدالعلیم اور اہل حدیث کے سربراہ مولانا عبداللہ تھے۔ جھگڑا ہوا، مقدمہ بازی کی نوبت آئی اور دیوانی میں مقدمہ دائر ہوا۔ اہل حدیث کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کے لیے مولانا ابوالطیب شمس الحق عظیم آبادی بلائے گئے اور احناف کی طرف سے

---

[1] تذکرۂ علمائے حال۔ ص: ۴۷۔

مولانا عبدالعلیم اس پر مامور کیے گئے۔ مقدمے کا فیصلہ احناف کے حق میں ہوا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا عبدالعلیم کی شہرت و مقبولیت بہت بڑھ گئی اور کہنا چاہیے کہ میدان ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ (بہ روایت مولانا عبدالباقی صاحب فرزند مولانا)

ان ہی دنوں دونوں بزرگوں میں ایک فقہی جزیہ پر اختلاف برپا ہو گیا اور یہ بحث چل پڑی کہ کسی بلند چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔ ایک صاحب اس کے جواز کے قائل تھے اور دوسرے صاحب عدم جواز پر مصر تھے۔ اس میں جانبین سے اتنا شدید اختلاف ہوا کہ مار پیٹ تک کی باری آ گئی۔ بعد میں یہ محقق ہوا کہ شیئی مرفوع پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ شیئی مرتفع پر جائز ہے۔ (بہ روایت مولانا ابوالحسن حیدری غازیپوری شاگرد مولانا مرحوم درسفر حج ۱۳۸۵ھ)

ایک مرتبہ مولانا عبدالعلیم اور مولانا احمد رضا خاں کے درمیان اذان بین یدی المنبر پر تحریری بحث و مباحثہ ہوا۔ مولانا عبدالعلیم قائل تھے کہ جمعہ کے دن خطبہ کی اذان منبر کے پاس ہی خطیب کے سامنے ہونی چاہیے اور مولانا احمد رضا خان صاحب کا دعویٰ تھا کہ اذان منبر سے دور باہر ہونی چاہیے۔ دونوں نے تحریری دلائل پیش کیے اور مولانا نے اس موضوع پر ایک کتاب ''درۃ التاج الانور فی اذان الجمعۃ عند المنبر'' کے نام سے ۱۳۲۷ھ میں تحریر فرمائی۔ اور جب حج و زیارت کو گئے تو پورے عالم اسلام کے فضلاء و علماء سے مل کر اس بارے میں ان کا تعامل معلوم کیا اور پتہ چلا کہ ہر ملک میں جمعہ کے خطبہ کی اذان منبر کے پاس ہوتی ہے۔ بعد میں سفرنامۂ حجاز میں اس کو بیان کیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں اور مولانا عبدالقادر بدایونی میں اسی مسئلے پر بحث چلی اور جمعہ کی اذانِ ثانی کے مسئلے پر بریلی اور بدایوں کے علمی و دینی مرکزوں میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ تو اتحاد عقائد اور مولانا احمد رضا خاں کے مولانا عبدالقادر سے شرف تلمذ رکھنے اور ان کی مدح میں قصیدہ کہنے کے باوجود معاملہ تفسیق و تضلیل تک پہنچ گیا۔ مولانا احمد رضا خاں کو علمائے بدایوں نے ترکی بہ ترکی جواب

دیا اور مقدمہ بازی تک نوبت آگئی۔نواب حامد علی خاں والی رامپور کی حکمت عملی نے اس قضیے کو جیسے تیسے ختم کرایا۔[1]

مولانا عبدالعلیم اپنے زمانے میں اس دیار کے زبردست فقیہ، اصولی، مفتی اور حنفی عالم تھے۔علومِ عقلیہ ونقلیہ میں جامع المعقول والمنقول اور علم کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔طب وحکمت میں اپنی مثال آپ تھے۔ذہانت وطباعی بلا کی تھی۔علمی وفقہی مباحث ومناقشات میں حصہ لیتے تھے۔ان کو اپنے علم وتحقیق پر پورا اعتماد تھا اور دوسرے اہل علم بھی ان کی تحقیقات پر مطمئن تھے۔طب وطبابت میں حذاقت ومہارت کا یہ حال تھا کہ روتے ہوئے مریض کو معمولی معمولی دواؤں سے تھوڑی دیر میں ہنسا دیتے تھے۔ان کے طبی چٹکلے مشہور تھے۔خطاطی اور خوش نویسی میں کمال حاصل تھا اور ہمہ اقسام کے خطوط پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ایک مرتبہ ایک مشہور عالم سے بحث ومباحثہ کی باری آئی تو سب سے پہلے ان سے سوال کیا کہ فلک اوّل کا محرک کون ہے؟ یہ سنتے ہی اس عالم نے کہا کہ منقولات کی بحث میں معقولات کی بات فضول ہے اور اسی پر مناظرہ ختم ہوگیا اور گویا فتح حاصل ہوگئی۔میں نے اپنے بچپن میں ان کو دیکھا ہے۔مگر شکل وصورت ذہن میں باقی نہیں رہی۔

اس دَور میں مبارکپور میں تدریس وتصنیف کے جید علماء موجود تھے اور اپنے اپنے انداز میں خوب کام کررہے تھے۔یہ دور علمی ودینی اعتبار سے عصر ذہبی تھا۔ان میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا عبدالعلیم صاحب اور ان کے برادرِخورد مولانا احمد حسین صاحب، مولانا ظفر حسن صاحب عینی اور مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی آسمانِ علم وتحقیق کے آفتاب وماہتاب تھے۔

مولانا عبدالعلیم کے علمی وفقہی تبحر کا شہرہ دور دور تک تھا اور ان کے پاس طلبہ کھنیچ کھنیچ کر آتے تھے۔خاص طور پر فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کے پڑھانے میں یکتا

---

[1] فاران کراچی۔ماہ اپریل ۱۹۶۷ء۔ص:۲۹۔

مانے جاتے تھے۔ کم وبیش چالیس سال تک مروجہ علوم وفنون کا درس دیا اور تصنیف وتالیف کا شغل جاری رکھا۔ ان کی درسگاہ سے ہزارہا طلبہ فارغ ہوکر نکلے۔ ان میں سے چند علماء کے نام یہ ہیں: مولانا مفتی محمد ابراہیم بناری متوفی ۱۳۸۴ھ، مولانا احمد حسین رسولپوری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا شیخ محمد عباسی مئوی صدر قانون گو گورکھپور، مولانا ابومحسن حیدری غازیپوری، مولانا محمد طفیل املوی، مولانا حکیم شاہ فیاض عالم املوی، مولوی حکیم الطاف حسین سکٹھوی، مولوی نور محمد امام جامع مسجد مبارکپور۔

مولانا نے تعلیم وتدریس، افتاء، طبابت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور متعدد کتابیں لکھیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اساس التوحید:۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ جسے فراغت کے بعد ۱۳۰۴ھ میں اس زمانے کے ذوق کے مطابق فارسی زبان میں لکھا۔ یہ کتاب علم کلام وعقائد میں ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود نہایت مفید اور اہم کتاب ہے۔ صاحب معارف العوارف (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند) نے اس کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"اساس التوحید مختصر بالفارسی فی العقائد للمولوی عبدالعلیم بن باب اللہ المبارکفوری صنّفه سنة ١٣٠٤[1]

یہ کتاب دوسری بار ۱۳۱۲ھ میں چھپی اور اس زمانے میں بمبئی کے مشہور کتب خانوں کی فہرست میں اس کا نام ملتا ہے۔

(۲) سید التخریج مسمی بہ توضیح الفرائض:۔ یہ کتاب علم الفرائض والمواریث میں مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع، مفید اور سہل ہے۔ اس کا

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ ص: ۲۴۔

سنہ تالیف ۱۳۱۹ھ ہے۔ اس میں اُردو زبان میں فرائض کے پیچ در پیچ مسائل کو نہایت آسان پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) التبصرہ فی تحقیق الاشربہ :۔ یہ رسالہ حقہ وغیرہ (دخان) کی حلت وحرمت اور کراہت کی بحث میں ہے۔

(۴) کتاب الشہادت :۔ یہ کتاب اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں ایک خاص موضوع پر احادیث وآثار کو نہایت جامعیت اور تحقیق کے ساتھ مختلف ابواب میں جمع کیا گیا ہے۔ اس اہم کتاب کی تصنیف کا باعث مبارکپور میں ۱۳۲۱ھ و ۱۳۲۲ھ کا وہ قیامت خیز طاعون ہے، جس سے ہزاروں گھر کے چراغ گل ہو گئے۔ مولانا حمد وصلوٰۃ کے بعد مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''معلوم ہو کہ کچھ دنوں سے ہندوستان میں طاعون کی آسمانی بلا اس طرح عالمگیر ہے کہ صدہا خاندان کو برباد کر دیا اور ہزاروں مکان کے چراغ گل کر دیے۔ جس سے صدہا یتیم وبیکس گلی کوچوں میں بلک رہے ہیں اور ہزاروں بیوہ ولاوارث آہ ونالۂ دل خراش سے سامعین کے کلیجوں کو پاش پاش کر رہے ہیں۔ جب ۱۳۲۱ھ میں یہ بلا اعظم گڑھ کے اطراف ونواحی میں پہنچی تو وہاں کی بھی یہی حالت ہوئی کہ ہزاروں مکانات بے مالک ہو گئے۔ جن میں کوئی چراغ کا جلانے والا نہ رہا۔ اور یتامیٰ ولاوارثین کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ پس اکثر برادرانِ دینی وایمانی خاص کر یادگار سلف نمونۂ خلف جناب مَلَکی صفات حافظ عبداللطیف صاحب امام وخطیب جامع مسجد مبارکپور (متوفی ۱۳۳۴ء، ۲۵ر فروری ۱۹۱۵ء) نے اس فقیر ابوالامجد محمد عبدالعلیم اعظمی سے فرمائش کی کہ اگر طاعونی شہداء اور جو لوگ شہادت کی نعمت سے شرف یاب ہوئے ہیں ان کے باب میں کوئی رسالہ لکھا جاتا تو مصیبت زدوں کے زخم کا مرہم ہوتا۔ اس واسطے میں نے ان لوگوں کا

حال جو شہادت کی موت سے شرف یاب ہوئے ہیں، کتب احادیث وغیرہ
سے تلاش کر کے نہایت آسان زبان میں اس رسالہ کو مرتب کیا اور ان کا نام
''کتاب الشہادۃ'' رکھا[1]

یہ کتاب مولانا کے تلمیذ رشید مولوی شیخ محمد عباسی صدر قانون گو کے اہتمام وارشاد سے ۱۳۳۲ھ میں گورکھپور میں چھپی تھی۔ خدا کی شان کہ کتاب الشہادت لکھنے والے کی موت بھی شہادت کی ہوئی۔

(۵) **الخطب المنبریه من الآیات القرآنیه** :۔ اس مجموعۂ خطب کو قرآنی آیات سے مرتب کیا گیا ہے، جو نہایت مقبول ہوا۔

(۶) **درۃ التاج الانور فی اذان الجمعة عندالمنبر** :۔ جیسا کہ گزر چکا ہے ۱۳۲۷ھ میں لکھی۔ اس رسالے میں جمعہ کی اذان ثانی کا منبر کے سامنے ہونا ثابت کیا گیا ہے اور کتب احادیث وفقہ اور تعامل امت سے اس کے دلائل دیے گئے ہیں۔ ۱۶ر صفحات میں غوثیہ پریس غازیپور میں ماہ اگست ۱۹۰۹ء میں چھپی۔

(۷) **سفرنامۂ حجاز** :۔ حج وزیارت کے دوران مولانا نے ممالک اسلامیہ سے آئے ہوئے علماء وفضلاء سے مل کر جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں ان کا تعامل معلوم کر کے اس رسالہ میں بیان کیا ہے۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ آپ کی کئی علمی وتحقیقی اور فنی تصانیف غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ان میں سے جن کتابوں کے مسوادات ہم نے دیکھے ہیں، یہ ہیں:

(۱) **اصولِ فقہ** :۔ یہ اصول فقہ میں اُردو زبان میں غالباً پہلی کتاب ہے، جو نہایت جامع اور مفید ہے۔ اس پر سنہ تصنیف ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ درج ہے۔ اسی سال آپ کا وصال ہوا۔ یہ آپ کی آخری تصنیف ہے۔ اچھی خاصی ضخیم اور نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اے کاش! یہ کتاب چھپ جاتی اور ہمارے مدارس اسلامیہ کے کام آتی۔

---

[1] کتاب الشہادت۔ ص:۲-۳۔

(۲) الدوحة الناظرة فی علم المناظرة :۔فن مناظرہ وجدلیات سے مولانا کو شروع ہی سے دلچسپی تھی اور اپنے معاصرین سے علمی انداز میں بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔اس لیے فن مناظرہ کے اصول وفروع سے اچھی طرح واقف تھے۔اس کتاب میں اُردو زبان میں اس فن کے جملہ مباحث نہایت سلیس انداز میں درج ہیں۔اس کے مسودہ پر تاریخ تصنیف یوم جمعہ ۲۶ رشوال ۱۳۲۴ھ ہے۔

(۳) الفریدة الوضعیه فی الحکمة الالٰهیة :۔یہ کتاب عربی زبان میں الٰہیات پر ہے اور ان چند نادر اور مخصوص کتابوں میں سے ہے جو آخری دور میں اس فن پر لکھی گئی ہیں۔دقیق سے دقیق تر مسائل ومباحث کو نہایت سہل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور عربیت وادبیت کا اعلیٰ معیار سطر سطر سے نمایاں ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے۔اسی زمانے میں ان کے معاصر اور ہم وطن عالم مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی نے "الافاضة القدسیه فی المباحث الحکمیه" لکھی جو طبع ہو کر مشہور ومقبول ہوئی۔

(۴) رواة البخاری المجروحون :۔یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اور صحیح بخاری کے بعض رجال ورواۃ پر امام دارقطنی کے انداز میں نقد ونظر ہے۔اس موضوع سے قریب تر ابن حبان کی کتاب ''المجروحین من المحدثین'' ہے۔جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

(۵) مجموعه فتاوائے علیمی :۔یہ مولانا کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے۔اس میں آخر فتویٰ پر یکم اپریل ۱۹۲۱ء (۱۳۴۰ھ) درج ہے اور اس کے ایک سال کے بعد ۲۲ راپریل ۱۹۲۲ء (۱۳۴۱ھ) کو ریل کے حادثہ میں ان کا وصال ہوا۔

ان کے شاگرد مولوی حکیم احمد حسین غازیپوری نے ایک سفر میں مجھے بتایا ہے کہ مولانا بنارس تشریف لے جا رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، اوڑیہاڑ جنکشن پر

غازیپور سے آنے والی ٹرین کھڑی تھی۔ جس میں ہم لوگ بیٹھے تھے کہ یکبارگی میں نے دیکھا کہ ڈبے کی چھت پھٹ گئی اور آسمان نظر آیا۔ اس کے بعد بنارس اسپتال میں مجھے ہوش آیا اور مولانا عبدالعلیم صاحب اس قدر شدید زخمی ہوئے کہ آخر تک وہ ہوش میں نہ آسکے۔ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور بنارس اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ واقعہ ۲۲ راپریل ۱۹۲۲ء (۱۳۴۱ھ) کا ہے۔ محلّہ کچی باغ میں بٹاؤ شہید کے مزار کے قریب بلندی پر دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام مبارکپوری

حضرت مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین مبارکپور کے مشہور علمائے دین سے تھے۔ جنھوں نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ حکمت وطبابت میں زندگی بسر کی۔ مولانا کا خاندان قصبہ میں بڑی عزت وشہرت کا مالک تھا اور اس میں علم وفضل کا چرچا بہت پہلے سے چلا آتا تھا۔ ان کے والد شیخ خان محمد بڑے نیک اور متقی آدمی تھے۔ قرآن حکیم، ادعیۂ ماثورہ اور دینی مسائل سے خاص طور سے شغف رکھتے تھے ان کی ولادت ۱۲۸۹ھ میں اور وفات یوم یکشنبہ ۱۸ ررجب ۱۳۴۲ھ (۲۴ رفروری ۱۹۲۴ء) میں عین نماز مغرب کی اذان کے وقت ہوئی اور مولانا کے نانا حکیم امان اللہ صاحب شاہ ابواسحاق لہراوی کے شاگرد رشید تھے[1]

تذکرہ علمائے حال میں لکھا ہے کہ مولوی حکیم سلامت اللہ (عبدالسلام) صاحب مبارکپوری کی ولادت مبارکپور میں ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔ کافیہ، شافیہ تک مولوی حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر مبارکپوری اور دیگر علماء سے پڑھا۔ پھر شرح تہذیب اور

[1] سیرۃ البخاری۔ ص:۳۸۔

شرح جامی مولانا عبدالرحمٰن بن حافظ عبدالرحیم صاحب مبارکپوری سے پڑھا اور شرح وقایہ مولانا حسام الدین صاحب مئوی سے پڑھ کر بقیہ کتب مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب مئوی غازیپوری سے پڑھ کر دہلی گئے اور مولوی عبدالحق صاحب ولایتی مدرّس مدرسہ فتح پوری سے تحصیل علم کرنے کے بعد مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے صحاح ستہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، نخبۃ الفکر پڑھی اور ان سے ہی علم حدیث کی سند اجازت حاصل کی۔ نیز مولانا شیخ حسین عرب سے حدیث کی اجازت عامہ حاصل کر کے مولانا شیخ محمد صاحب مچھلی شہری سے اجازت حدیث مسلسل بالادلیہ حاصل فرمائی اور طب وحکمت کی تعلیم حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی صاحب لکھنوی سے پائی[1] آپ کا سلسلہ سند ہر سہ شیوخ سے یوں ہے:

(۱) عبدالسلام عن الشيخ السيد نذير حسين المحدث الدهلوی فی ۹ ۱۳۰ھ عن الشيخ المكرم فی الأفاق الشاه محمد اسحاق، عن مسند الوقت الشاه عبدالعزيز عن بقية السلف الشاه ولی الله، عن الشيخ ابی طاهر المدنی عن الشيخ ابراهيم الكروی، الخ۔

(۲) عبدالسلام عن الشيخ حسين بن محسن الانصاری فی ۹ ۱۳۰ھ فی دهلی لما نزل به۔ عن الشيخ حسن بن عبدالباری الاهدل ومحمد ناصر الحازمی واحمد بن الشوكانی وكلهم عن الشوكانی۔ الخ

(۳) عبدالسلام عن الشيخ محمد المچهلی شهری

[1] تذکرۂ علمائے حال۔ ص:۲۹۔

فی ۱۳۱۳ھ عن الشیخ عبدالحق البنارسی عن القاضی الشوکانی۔ الخ[1]

مولانا عبدالسلام کے اکثر اساتذہ وشیوخ اہل حدیث مسلک کے تھے اور خود مولانا بھی اسی مسلک کے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب سیرۃ البخاری میں جگہ جگہ ان شیوخ کا تذکرہ کر کے ان کے افادات درج کیے ہیں۔ مثلاً ناصرالدین احمد المنیر میں منیّر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''یہ لفظ بہ تشدید یاء واقع ہے، ہذا ما افادشیخنا الشیخ حسین عرب الیمنی رحمۃ اللہ علیہ[2] ایک جگہ لکھتے ہیں۔'' شیخنا المحترم استاذ الاساتذہ جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری نے بھی (مقدمہ صحیح مسلم کی) ایک شرح طویل اور نہایت مفید لکھی ہے، جس کا نام ''البحرالمواج'' ہے[3] اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کو اپنے اساتذہ وشیوخ سے کیسا علمی ودینی تعلق ہوا کرتا تھا اور اس تعلق سے وہ کس قدر فیض اٹھاتے تھے۔ مولانا نے مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کے بعد تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں زندگی بسر کی۔ پندرہ سال تک صادق پور پٹنہ کے مدرسہ میں تعلیم دی اور اسی دوران میں اپنی مشہور کتاب ''تاریخ المنوال واہلہ'' تصنیف کی۔ تین سال تک مدرسہ فیض عام مئو میں مدرّس رہے۔ اس کے بعد ضلع گونڈہ کے ایک مدرسہ میں چار سال تک پڑھایا۔ آخر میں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تشریف لے گئے اور یہیں زمانۂ تعلیم وتدریس میں ۲۸؍رجب ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۴؍فروری ۱۹۲۴ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تدریسی قابلیت وخدمت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چناں چہ آپ کی وفات کے بعد مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے اخبار اہل حدیث میں آپ کی تدریسی خدمات کا یوں اعتراف کیا ہے:

---

۱ سیرۃ البخاری۔ ص:۴۴۸۔

۲ سیرۃ البخاری۔ ص:۴۴۸۔

۳ سیرۃ البخاری۔ ص:۱۸۹۔

''آہ عبدالسلام مرحوم مولانا موصوف صحیح معنوں میں ایک عالم،
علوم کے مدرّس تھے۔ مدرسین کے تلاش میں جب نظر پڑتی تو آپ ہی پر
پہلے پڑتی''۔[1]

مولانا تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور تحقیق کا کام جاری رکھتے تھے اور ہر دَور میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔ چناں چہ مدرسہ صادق پور کے دورانِ قیام میں تاریخ المنوال جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ جس نے علمی اور تمدنی حلقوں میں حرکت پیدا کردی۔ ایک زمانہ میں اخبار اہل حدیث امرتسر میں ''تراجم علمائے اہل حدیث'' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع ہوا تھا، جو ۳۰/ اگست ۱۹۱۸ء سے ۱۷/ اگست ۱۹۲۲ء (۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۱ھ) تک جاری رہا۔ جس میں بیاسی علماء کے سوانح حیات شائع ہوئے۔ ان میں ایک تہائی تراجم وسوانح مولانا عبدالسلام نے تحریر فرمائے تھے۔ ۱۳۲۹ھ میں ''سیرۃ البخاری'' جیسی عظیم الشان کتاب لکھی، جو اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے۔ مولانا نے ''کتاب التمدن'' کے نام سے ایک سلسلۂ تصنیف وتالیف شروع کیا تھا، جس کے دو حصے تھے۔ دوسرا حصہ ''تاریخ المنوال واہلہ'' کے نام سے چھپا۔ مگر اس پر مصنف کی حیثیت سے نام اپنے صاحبزادے عبیداللہ مبارکپوری کا رکھا۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اور شائع ہوئی، مسلمانوں کے عرفی شرفاء میں پیشہ ور برادریوں خصوصاً پارچہ بافوں کے بارے میں نہایت حقارت آمیز خیالات پائے جاتے تھے اور ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیت اور علمی، تمدنی اور اخلاقی ترقی کو دیکھ کر وہ چراغ پا ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے اس طبقہ کے بعض علم وفضل احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے کو چھپاتے تھے۔ مگر مولانا نے کمال جرأت سے کام لے کر اسلامی مساوات اور تاریخی واقعات وحقائق کی روشنی میں تحقیق وتلاش کے بعد یہ کتاب لکھی اور اس کا نہایت

---

[1] اخبار اہلحدیث۔ مورخہ ۳۰/ رجب ۱۳۴۲ھ مطابق ۷/ مارچ ۱۹۲۴ء
بحوالہ تراجم علمائے اہلحدیث

خوش گوار نتیجہ نکلا۔ اس کتاب میں اپنے وطن مبارک پور کے انصاری مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دینی تعلیم کا شوق بہت ہے، ان کے اپنے متعدد مدرسے ہیں۔ شیعہ، سنی کے مدرسے علیحدہ۔ شیعوں میں دو جماعت اسماعیلیہ (بوہری)، اثناعشریہ۔ سنیوں میں اہل حدیث، حنفی۔ حنفیوں میں دیوبندی، رضائی۔ سب کے مدارس علیحدہ، جامع مسجد نہایت شاندار، جمعہ کی جماعت بہت بڑی ہے، یتیم خانہ بھی ہے۔ مبارک پور میں ۲۸ محلے ہیں اور ان ہی سے مملو ہیں۔ دیگر اقوام ان کے خدام ہیں۔ حضرات شیخ انصاریوں کے جیسا کہ ابھی ہم لکھ آئے ہیں، متعدد مدارس ہیں اور علوم دینیہ کی طرف بڑی توجہ ہے۔ اسی وجہ سے سند یافتہ علماء، فضلا، مدرسین، مصنفین، حفاظ قرآن کی کثرت ہے۔ جا بجا دور دراز جگہوں میں یہاں کے لوگ مدرس ہیں، طبیب ہیں، مفتی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ زمانہ حال کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہے اور دولت مندوں میں بجز تجارتی تعلیم کے علومِ انگریزی یا علومِ دینیہ کا شوق نہیں ہے''[1]

یہ کتاب مطبع احمدی پٹنہ میں چھپی ہے۔

''سیرت البخاری'' مولانا کی علمی و تاریخی اور تحقیقی کاوشوں کا شاہکار ہے۔ ان کے معاصر علامہ شبلی نعمانی نے ۱۳۰۹ھ میں ''سیرت النعمان'' لکھی تو اس کے مضامین و معلومات کی وجہ سے اہل حدیث طبقہ میں برہمی پھیل گئی اور اس کے جوابات لکھے گئے، جن میں ''حسن البیان'' نامی کتاب بھی ہے۔ مولانا عبدالسلام بھی ''سیرۃ البخاری'' میں ہم عصر نعمانی اور صاحب سیرۃ النعمان کے مد مقابل ہیں اور ''سیرۃ البخاری'' کے دوسرے حصے میں اپنے ہم عصر نعمانی اور ان کی کتاب ''سیرۃ النعمان'' پر کڑی تنقید کی ہے۔ اس سلسلے میں بعض مقامات پر حنفیوں اور عراقیوں کے بارے میں بڑی شدت آ گئی ہے

[1] تاریخ المنوال۔ ج:۲۔ ص:۵۱۔

اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوانح عمری نہیں ہے بلکہ مناظرے کی کتاب ہے۔ اس کا احساس خود مولانا کو بھی تھا۔ چناں چہ مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> ''ہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب میں کچھ ایسے مضامین بھی ملیں گے جن سے عام لوگوں کو چنداں دلچسپی نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ تاریخی حیثیت سے الگ محدثانہ یا فقیہانہ رنگ کے ہوں گے''۔

اس کے باوجود ''سیرۃ البخاری'' اُردو زبان میں اپنی جامعیت اور معیار کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے اور اس کتاب سے حضرت امام بخاریؒ کی سوانح عمری کا قرضہ امت کے سر سے ہلکا ہو گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۳۲۹ھ میں بڑے آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کے تیرہ سال کے بعد مولانا کا انتقال ہوا اور دوسری بار ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ تیسری بار آفسیٹ فوٹو کے ذریعہ پاکستان میں شائع ہوئی اور مصنف کے صاحبزادے مولانا عبیداللہ صاحب کے فرمانے کے مطابق ''سیرۃ البخاری'' کا ترجمہ عربی زبان میں ہو رہا ہے۔ ان دو اہم کتابوں کے علاوہ مولانا نے اور بہت کچھ لکھا ہے۔ چناں چہ ''تراجم علمائے اہل حدیث'' کے سلسلے میں بہت سے علماء کے سوانح لکھے، جو اخبار اہل حدیث میں شائع ہوئے۔ کتاب التمدن کے دو حصے تھے، دوسرا حصہ ''تاریخ المنوال'' کے نام سے ۱۹۱۴ء میں چھپا، پہلا حصہ معلوم نہیں لکھا یا نہیں۔ اسی طرح ''سیرۃ البخاری'' میں متعدد مقامات پر اس کے حصہ ثالثہ کا وعدہ ہے، جس میں علم حدیث کی تاریخ وتدوین، اس کی حجیت اور شیعوں اور دیگر فرقوں کے اعتراضات کے جوابات کا بیان ہوگا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انشاء اللہ حصہ ثالثہ میں جب ہم ان کو نقل کریں گے تو خود اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ (ص ۲۶۸) ایک جگہ حدیث میں شدت اختیار و اہتمام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''گو ہم نے اس بحث کو بخوف طوالت حصہ ثالثہ کے لیے رکھا ہے تاہم کسی قدر عرض کر دینا ضروری ہے''۔ (ص ۳۴۰) اس طرح صفحہ ۳۴۶ پر حصہ ثالثہ کا حوالہ درج ہے، مگر بعد میں اس حصہ کا پتہ نہ چل سکا کہ مولانا کو اس کی

تکمیل کا موقع مل سکا یا نہیں۔ تراجم علمائے اہل حدیث میں ہے کہ آپ کی ایک کتاب تصوف میں بھی ہے، جو ابھی طبع نہیں ہو سکی ہے۔ (ص ۴۰۰) ایک مرتبہ مبارکپور میں آنے جانے والے ایک پیر صاحب سے مولانا کی مڈبھیڑ ہوگئی تھی اور پیر صاحب نے ''نوکِ تیر برجگر بے پیر'' نام کی ایک کتاب لکھی تھی۔ شاید اسی قضیہ نامرضیہ کے سلسلے میں مولانا نے علمی اور دینی انداز میں تصوف پر کوئی کتاب تحریر کی ہو۔

ہم ''سیرۃ البخاری'' سے تصوف کے بارے میں مولانا کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان کا نقطہ نظر معلوم ہونے کے ساتھ ان کا طرز نگارش اور زبان و اسلوب بھی معلوم ہوگا اور اندازہ ہوگا کہ مولانا اُردو زبان کے نہایت اچھے انشاء پرداز، ادیب اور مصنف ونقاد تھے۔ ''سیرۃ البخاری'' میں جہاں امام بخاری کو علمائے زمرۂ صوفیا میں شمار کیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ امام بخاری کو طبقۂ صوفیہ میں شمار کرنے کو دو جماعتیں حیرت کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ ان میں جماعت موجودہ صوفیوں کی ہے۔ اس لیے کہ موجودہ زمانہ کے عملی تصوف اور موجودہ صوفیت پر نظر کرتے ہوئے یہ جملہ کہ امام بخاری مانے ہوئے کامل صوفی تھے، نہایت بے جوڑسی بات معلوم ہوتی ہے۔ امام بخاری کے دربار میں نہ عرس تھا، نہ محفل قوالی، نہ تصور شیخ، نہ آنکھیں بند کرنی، نہ چلہ کشی، نہ رسم گاگر نہ مردوں سے مدد مانگنی، نہ کوئی درگاہ، نہ قل، نہ مریدوں کے نذرانے پر گزارہ، نہ قبروں کا چڑھاوا، نہ قیام مولد، نہ مجلس مولود کی ہیئت کذائی، نہ گلے ملا ملا کر غزلیات گانے، نہ اہل حال کا اچھل کود، نہ وحدت وجود کا عقیدہ، نہ صلوٰۃ غوثیہ، نہ مراقبۂ کشف قبور، بلکہ صرف احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درس، اسی کی پابندی، اسی کا چرچا تھا۔ جو موجودہ تصوف کی بیخ وبنیاد کا استیصال ہے۔

دوسری جماعت اہل حدیث کی ہے۔ امام بخاری کی نسبت یہ جماعت یقین کرتی ہے کہ وہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دلدادہ تھے۔ اسی کی تدوین واشاعت و پابندی میں اپنی عمر کا سارا حصہ تمام کر دیا، بدعات سے محترز تھے۔ اسی وجہ سے جس قدر فرقے

نئے نئے پیدا ہو گئے تھے، اس کو امام صاحب بدعتی اور محدث کہتے تھے۔ اور ان کا رد نہایت جوش سے صحیح بخاری میں لکھا ہے یہاں تک کہ اعمال کے جز و ایمانی ہونے کا صراحۃً حدیثوں میں تذکرہ وارد ہوا ہے۔ اس وجہ سے جو اس کا قائل نہ ہوتا، اس کو امام صاحب مُرجی کہتے۔ امام صاحب کی اس طرزِ زندگی پر نظر کرتے ہوئے کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوفی تھے۔ کیوں کہ تصوف بھی ایک محدث چیز ہے۔ امام صاحب کو صوفی کہنا امام صاحب کے دامن تقدس پر بدعت کا دھبہ لگانا ہے۔ اس میں کہاں تک ہے کہ تصوف جس نے آج اپنے اتباع کو حد سے زیادہ بدنام کر رکھا ہے، کسی زمانے میں بڑی خیر و برکت اور بہت ہی محمود چیز تھی۔ احکامِ شرعی کی سختی سے پابندی، ایثارِ نفس، ہدایت مخلوق میں سعی کرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کا شوق، مصائب پر صبر و استقامت، جہاد کے لیے ہمہ تن مستعد رہنا اپنے نفس کا انتقام نہ لینا، مکارم اخلاق کا پھیلانا، دنیا سے بے رغبتی، پابندی تقویٰ، بدعات سے اجتناب، غرض شریعت نے جن باتوں کو عزم امور (تاکیدی باتیں اور اصلی مقاصد) فرمائی ہیں، انہیں کا اصلی مرقع تھا۔ ان کو کون محمود نہ کہے گا؟ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں باتوں سے اکسیر اور مس سے کندن بن گئے اور ان کا تصوف نام رکھنا، اصطلاحِ جدید تو بیشک ہے، لیکن مقصود واضح ہو جانے پر چنداں مضائقہ نہیں ''و لا مشاحة في الاصطلاح ''[1] ایک موقع پر حاشیہ میں صوفی صافی امام محی الدین ابن عربی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''یہ برتاؤ اہل الرائے کا محدثین کے ساتھ ہمیشہ جاری رہا اور گیارہ سو برس کے تجربے نے ثابت کر دیا۔ غالباً دنیا کے قیام تک یہی برتاؤ رہے گا۔ صوفی صافی امام محی الدین ابن عربی نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ امام آخر الزماں کے دشمن یہی ہوں گے''۔ (ص ۳۶۴ و ص ۳۶۵)

مولانا مرحوم بے نظیر مدرس اور بے مثال عالم ہونے کے ساتھ نہایت اچھے

---

[1] سیرۃ البخاری۔ ص: ۱۴۰ و ص: ۱۴۱۔

مصنف وادیب اور مؤرخ ونقاد تھے۔ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا نہایت ستھرا انداز رکھتے تھے اور مبارکپور کے علماء ومصنّفین میں اس بارے میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ آپ کی وفات بصورتِ شہادت دارالحدیث رحمانیہ کی مدرّسی کے زمانے میں ۱۸؍رجب ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۲۴ء کو دہلی میں ہوئی۔ ایک روز چاندنی چوک میں سڑک پر جارہے تھے کہ گھنٹہ گھر کے سامنے (اب گھنٹہ گھر باقی نہیں رہا) ایک گھوڑے سے دب کر اس قدر زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور دہلی میں دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔ اس حادثے سے دو سال پہلے ۱۹۲۲ء میں مبارکپور کے مشہور حنفی عالم ومصنف مولانا عبدالعلیم رسولپوری ریل کے حادثے میں زخمی ہوکر بنارس میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں کو شہادت کی موت عطا فرمائی۔ مولانا عبدالسلام صاحب کے حالات تذکرہ علمائے حال ص ۲۹، نزہۃ الخواطر ص ۱۶۱ ج ۸، تراجم علمائے اہل حدیث وغیرہ میں ملاحظہ ہوں۔

حضرت مولانا احمد حسین رسولپوریؒ

حضرت مولانا حکیم حاجی احمد حسین بن عبدالرحیم عرف باب اللہ بن شیخ جمال الدین عرف جمن بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسولپوری مبارکپوری اعظمی رحمۃ اللہ علیہ خانوادۂ علمائے رسولپور کے ثانی اثنین اور وہاں کے دوسرے علمی سلسلے کے واسطۃ العقد اور راقم کے جد مادری ہیں۔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں رسولپور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان عہد جہاں گیری میں رسولپور آکر آباد ہوا اور دین ودیانت، علم وفضل اور دنیاوی دولت وثروت میں نمایاں رہا۔ آپ کے دادا شیخ جمن باخدا بزرگ تھے۔ ننہال محلّہ پورہ صوفی قصبہ مبارکپور میں تھا۔ نانا شیخ چاندگرہست دیندار اور صاحب ثروت آدمی تھے اور بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم اس دیار کے مشہور

مفتی و فقیہ اور مدرّس و مصنف تھے۔ ان کو اپنے اس سب سے چھوٹے بھائی سے بہت پیار تھا۔ ایک مرتبہ مولانا نو دس سال کی عمر میں سخت بیمار پڑے اور زندگی سے مایوسی ہوگئی تو مولانا عبدالعلیم نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ بار الٰہا! احمد حسین کو حیات دیدے اور اس کے بدلے میرے بچے امجد علی کو اٹھالے، چناں چہ وہ صحت یاب ہوگئے اور جب امجد علی نو دس سال کے ہوئے تو ان کا انتقال ہوگیا۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد سریاں میں حافظ شاہ نظام الدین سے عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعد میں حافظ صاحب کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔ یہاں سے مدرسۂ چشمۂ رحمت غازیپور گئے۔ جہاں اپنے برادر بزرگ مولانا عبدالعلیم رسولپوری سے نور الانوار اور میبذی وغیرہ پڑھی اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے شافیہ، قطبی، تلخیص المفتاح اور سبعہ معلقہ وغیرہ کی تعلیم پائی۔ اس زمانے میں مدرسہ چشمۂ رحمت کے بعد دیارِ مشرق میں دوسرا علمی مرکز مدرسہ حنفیہ جونپور تھا۔ جو مولانا ہدایت اللہ خان رامپوری کی وجہ سے مرجع بنا ہوا تھا۔ مولانا نے ۱۳۰۹ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب سے ملا حسن، ملا جلال، رسالہ میر زاہد مع حاشیہ غلام یحییٰ، حاشیہ بحر العلوم اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ پھر یہاں سے مدرسہ جامع العلوم کانپور گئے۔ جہاں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کے علم و فضل کا شباب سرگرم عمل تھا۔ آپ نے مولانا تھانوی سے ہدایہ، جلالین، مشکوٰۃ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھیں اور کتاب وسنت میں ان سے خصوصی تلمذ کرکے، مستند و معتبر علم حاصل فرماکر، دینی علوم وفقہ وحدیث میں سلسلۂ ولی اللہی سے منسلک ہوئے۔

اس کے بعد مدرسہ عالیہ رامپور گئے، جو نواب کلب علی خاں اور نواب حامد علی خاں کی علمی قدردانی کی وجہ سے علوم وفنون کا مرکز تھا۔ یہاں آپ نے مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا ظہور الحسن فاروقی رامپوری اور مولانا حافظ وزیر علی محدث رامپوری سے بقیہ کتابیں پڑھیں۔ اور ادب وعربیت کی تعلیم مولانا شیخ محمد طیب عرب مکی سے

حاصل کر کے عربی ادب اور عربی شاعری میں یوں کمال پیدا کیا کہ دیار مشرق میں عربی شاعری میں کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں تھا۔ نیز وہیں مولانا حکیم محمد حسین خاں صاحب سے طب وحکمت کی تعلیم پائی اور ان کے مطب میں نباضی کر کے طب کی سند لی۔ قیامِ رامپور کے زمانے میں فلکیات وریاضی میں مہارت تامہ حاصل کی اور ایک کرہ بنایا۔ جس میں دوائر صغار اور دوائر کبار بنائے۔ الغرض ۱۳۲۰ھ میں مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل سے فارغ ہوکر اور روحانی واحسانی سلسلہ میں مولانا شاہ ضیاء النبی صاحب رائے بریلی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جب کہ آپ کی زوجہ محترمہ آپ کے استاذ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھیں۔

فراغت کے بعد ہی مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں تعلیمی خدمات پر مامور ہو گئے اور ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۳ھ تک یہاں تعلیم دی۔ اس کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا عبد العلیم کی طلب پر مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں عربی کے مدرّس ہوئے اور ۱۳۲۶ھ تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس درمیان میں آپ کی علمی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور مختلف مقامات سے طلبی آنے لگی۔ چناں چہ ڈھاکہ سے بھی آپ کی طلبی کے خطوط آنے لگے اور آپ نے ۱۳۲۶ھ میں ڈھاکہ کو اپنا علمی مرکز بنایا۔ اس زمانے میں ڈھاکہ علم وفضل اور علماء وفضلا کا مرکز تھا۔ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری اور ان کے خاندان کے علماء کے ارشاد وتبلیغ کی وجہ سے تمام بنگال دینی فضا سے معمور تھا اور نواب سلیم اللہ صاحب کے خاندان سے مشرقی تہذیب پروان چڑھ رہی تھی۔ اس زمانے میں مبارکپور کے دو فضلاء ڈھاکہ کو گلزارِ علم وفن بنا رہے تھے۔ شمس العلماء مولانا ظفر حسن عینی فاروقی مبارکپوری اور مولانا احمد حسین رسولپوری مبارکپوری۔ نیز اس ضلع کے شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ بندوی وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد حسین نے سب سے پہلے مدرسہ حسینیہ ڈھاکہ میں صدرِ مدرّس کی حیثیت سے تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی۔ وہاں سے علیحدگی کے موقع پر مدرسہ کے مہتمم نے آپ کے بارے میں اپنے یہ تاثرات تحریر کیے:

”برترک تعلقش انگشت	ہم اُن کے ترکِ تعلق پر انگشت
بدندان گرفتیم و بصد حسرت	بدنداں ہیں اور بصد حسرت اُنھیں
دواعش کردیم ودولت گرانمایہ	رخصت کررہے ہیں اور بیش بہا
گم کردیم، جملہ کارکنان	دولت ضائع کررہے ہیں۔ تمام
مدرسہ برحسن کارگزاری	اراکین مدرسہ ان کی اچھی کارگزاری
اوشاں شہادت می دہیم“۔	کی گواہی دیتے ہیں۔ (قمر)

اس کے بعد اسی مدرسہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب بندوی صدر مدرّس ہوئے پھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

مولانا مدرسہ حسینیہ سے علیحدہ ہوکر مدرسہ حمادیہ میں، پھر مدرسہ دارالعلوم میں صدرِمدرّس ہوئے۔ ڈھاکہ کے ان تینوں مدارس میں تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد ایک سال مدرسہ عالیہ ہوگلی میں صدرِمدرّس رہے۔ پھر مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ میں چارسال تک نظامت ومدرّسی فرمائی اور یہیں کے دورانِ قیام میں ۱۳۴۲ھ میں حج ادافرمایا۔ واپسی پر مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ میں تقریباً دس سال تک رہے۔ اس کے بعد انجمن اسلامیہ گورکھپور میں چھ سال تک صدرِ مدرّس رہ کر ۱۳۵۷ھ میں وہاں سے مستعفی ہوگئے۔ یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۵۷ھ تک کامل ۳۷ رسال مسلسل درس وتعلیم کا مشغلہ جاری رکھا اور ایک دن بھی اس سے جدا نہ ہوئے اور اسی کے ساتھ تصنیف وتالیف اور طبابت وحکمت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

مولانا جملہ علوم وفنون میں ماہر تھے اور ہرفن کو بلاتکلف نہایت بہتر طریقے پر پڑھاتے تھے۔ منقولات میں فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث، علومِ ادبیہ، معانی، بیان اور معقولات میں منطق، فلسفہ، ریاضی، فلکیات، علم کلام، مناظر، مرایا، اکر، اسطرلاب کے ماہر تھے۔ ہیئت اور فلکیات میں خاص طور سے تبحر کا درجہ رکھتے تھے اور طب وحکمت میں تو مجتہدانہ حیثیت کے مالک تھے۔ علم الادویہ اور علم العقاقیر سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

ان کی تدریسی خدمات کا ابتدائی زمانہ بنارس اور غازیپور میں گزرا اور چھ سال تک ان علاقوں میں تعلیم دی۔ ظاہر ہے کہ اس مدت میں سینکڑوں طلبہ نے ان سے کسبِ فیض کیا ہوگا، مگر ان کے نام اور حالات معلوم نہ ہوسکے۔ البتہ مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی کو مولانا نے حدیث کی جوسند دی ہے، اسے ہم نے دیکھا ہے۔ اس کے بعد مشرقی بنگال اور ڈھاکہ کے مختلف مدارس میں تعلیم دی۔ وہاں عام طور سے ان کی درسگاہ سے ہر سال ستر، اَسّی طلبہ فارغ التحصیل ہوکر نکلتے تھے۔ ایک سال ایک سو بتیس طلبہ فارغ ہوئے۔ ان کی بیاض میں ان کے بہت سے ایسے تلامذہ کے نام اور پتے موجود ہیں، جنھوں نے ان کی خدمت میں رہ کر فراغت پائی۔ مشرقی بنگال میں ان کے تلامذہ اکثر مقامات پر مدرسوں، اسکولوں، کالجوں میں معلم و مدرّس تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی پروفیسر اور لیکچرار تھے۔ آج بھی ان کے تلامذہ کا تعلیمی وتدریسی سلسلہ مشرقی بنگال میں قریہ قریہ اور شہر شہر پھیلا ہوا ہے اور ان کے علمی ودینی فیوض وبرکات جاری ہیں۔ مولانا کا قد لانبا، بدن چھریرا، ناک کھڑی، رنگ گندمی تھا۔ بڑے چاق وچوبند آدمی تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رہا کرتے تھے، کبھی بےکار نہیں رہتے تھے۔ دن میں سونے کے بالکل قائل نہیں تھے۔ پیدل چلنے کے عادی تھے، رات کے ہر حصے اور ہر موسم میں بلاتکلف تن تنہا چلتے تھے۔ چھٹیوں میں مکان تشریف لاتے تو آتے ہی کوئی نہ کوئی مستقل کام نکال لیتے۔ ویسے دواسازی، کتب بینی اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ یہاں جاری رہتا تھا۔ سادگی، شرافت نفس اور زہد وتقویٰ کا نمونہ تھے۔ کبھی ان کو کسی سے بلند آواز سے بات چیت کرتے نہیں سنا گیا، چہ جائے کہ کسی سے لڑائی جھگڑا ہو۔ ان کے یہاں غصہ اور خفگی کے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ گھر کے اندر انتہائی سادگی مگر باہر عالمانہ وقار کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ کیا مجال کہ گھر سے باہر گھریلو لباس میں نکلیں۔ سر پر سفید عمامہ، سفید کمانی کا چشمہ، رنگین پھولدار اور کلی دار انگرکھا، بڑے پائچے کا پائجامہ، ہاتھ میں چھڑی، کاندھے پر بڑا سا رومال، باہر آتے جاتے وقت یہ ان کی ہیئت کذائی ہوتی تھی، سبک رفتار بلا کے تھے۔

تھوڑی دیر میں کئی کئی میل نکل جاتے تھے۔ خطاطی اور خوش خطی کے ہمہ اقسام کے ماہر تھے، اپنی تصانیف کی طباعت کے وقت کتابت خود فرماتے تھے۔ عربی، نسخ، نستعلیق وغیرہ کے بہترین کاتب تھے اور استاذانہ نظر رکھتے تھے۔ ان کے قلمدان میں کئی اقسام کے قلم ہی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ سرمہ کی شیشی، سوئی دھاگا، عطر کی شیشی، چاقو، بٹن، پیسے وغیرہ بھی اس میں رہا کرتے تھے۔ مختلف قسموں اور رنگوں کی سیاہی اور روشنائی خود تیار کرتے تھے۔ گھر آتے تو مریضوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ مرکبات ومعاجین، کشتہ جات، عروق اکثر خود تیار کرتے تھے۔ علم الادویہ اور دواسازی سے خوب واقف تھے۔

آپ کا گھر یتیموں کا مسکن تھا۔ ان کی پرورش کر کے تعلیم وتربیت سے آراستہ کرتے اور اپنے بچوں کی طرح ان کی شادی کر کے ہر قسم کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور ہر ضرورت پوری کرتے تھے۔ چوں کہ پورے گھر میں زوجین کے علاوہ ایک صاحبزادی اور ایک صاحبزادے ہی سب کچھ تھے۔ خود باہر رہتے تھے اور صاحبزادی مبارکپور میں رہتی تھیں۔ اس لیے یتیم بچوں اور بچیوں سے گھر میں رونق رہتی تھی۔ خود شاہ ضیاء النبی رائے بریلوی سے بیعت تھے اور ان کی زوجہ محترمہ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) سے بیعت تھیں۔ زوجین میں سے ایک کو حضرت تھانوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور دوسرے کو مولانا شاہ اشرف علی تھانوی سے شرفِ بیعت۔ مبارکپور میں حضرت تھانوی سے تلمذ وبیعت کا یہ شرف اسی گھرانے کو سب سے پہلے حاصل ہوا اور اس کے بعد یہاں کے لوگ ان سے واقف ہوئے۔

مولانا کا مکان تقریباً پچاس سال تک رسولپور کا واحد مدرسہ تھا، جہاں گاؤں بھر کے لڑکے لڑکیاں پڑھتے تھے۔ اس مدرسہ کی معلّمہ ان کی زوجۂ محترمہ (میری نانی مرحومہ) رحیمہ بنت حافظ نظام الدین سریانوی تھیں، جو ایک علمی اور دینی خاندان کی پروردہ اور تربیت یافتہ تھیں۔ اس مدرسہ میں قاعدہ، پارہ، قرآن شریف راہِ نجات، مفتاح الجنۃ،

تعلیم النساء، حکایات الصالحین، صبح کا ستارا کے علاوہ کریما اور مقیما بھی پڑھانے کا رواج تھا۔ وہ پورے گاؤں میں ملانی چچی کے لقب سے مشہور تھیں اور بچوں، بچیوں سے لے کر بوڑھوں اور بوڑھیوں تک کی استاد تھیں۔ لوگ ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔ ملانی چچی صرف معلّمہ ہی نہیں تھیں، بلکہ وہ بچوں اور بچیوں کی بہترین تربیت بھی کیا کرتی تھیں اور ان کو امورِ خانہ داری سے پوری طرح واقف کراتی تھیں۔ اکثر مقدمات ان کے گھر آیا کرتے تھے اور بعض میں وہ خود اُٹھ کر جایا کرتی تھیں۔ بوقتِ ضرورت اپنے دست و پا سے بھی معاملات ٹھیک کیا کرتی تھیں۔ ان کی ڈانٹ اور مار سے ہر چھوٹا بڑا ڈرتا تھا، کیوں کہ وہ اپنے حق کے استعمال میں چھوٹے بڑے کا فرق نہیں کرتی تھیں اور نہ کسی کے ساتھ رورعایت کرتی تھیں۔

ان کی دعا میں بڑا اثر تھا۔ عام طور سے صبح و شام ان کے یہاں بچے، بچیاں اور دوسرے مریض دعا کرانے آتے تھے۔ بعض اوقات خود بھی دعا کرنے چلی جاتی تھیں۔ صبح کو تلاوتِ قرآن کے بعد اور رات کو عشاء کے بعد اوراد و وظائف و معمولات کا سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔ آج بھی ان کے بڑے بوڑھے شاگرد اپنی ملانی چچی کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ مرحومہ بڑی عابدہ، زاہدہ اور بزرگ خاتون تھیں۔ وہ ایمان عجائز کی چلتی پھرتی تصویر تھیں۔ دنیا سے اس یقین پر گئی ہیں کہ ان کے لیے جنت میں گھر پہلے سے تیار ہے۔ مرحومہ میری نانی ہیں اور میں نے ان کا دودھ پیا ہے۔ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ تقریباً اَسّی سال کی عمر میں جمعۃ الوداع ۲۶/رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کو فوت ہوئیں اور شب قدر میں دفن کی گئیں۔ میری والدۂ مرحومہ حمیدہ متوفیہ سہ شنبہ ۲۲/ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ نے بھی اپنی والدۂ مرحومہ کے انداز پر زندگی بسر کی اور ہمیشہ گھر پر بچوں اور بچیوں کو تعلیم دیتی رہیں۔

ہم یہاں ایک خواب اور اس کی تعبیر درج کر رہے ہیں۔ جس سے نانا مرحوم،

نانی مرحومہ اور والدۂ مرحومہ کی دینی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کے لیے بلندیِ درجات کی امید ہے۔

جس زمانہ میں نانا مرحوم ڈھاکہ میں مدرّس تھے، میری والدۂ مرحومہ نے ایک خواب دیکھا، جسے ان کی خدمت میں لکھ کر تعبیر دریافت کی۔ اس وقت نانا مرحوم نے کیا جواب دیا؟ معلوم نہیں۔ مگر ۱۳۴۲ھ میں جب حج کو گئے تو وہاں سے اس کی تعبیر کے بارے میں مفصل خط تحریر فرمایا۔ یہ خواب اور اس کا تعبیری جواب والدہ مرحومہ کے قرآن شریف میں مدتوں محفوظ رہا:

> ''جناب چچا صاحب دام ظلہٗ!
>
> السلام علیکم۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے، جس سے طبیعت بہت پریشان ہے۔ آج یہ خواب آپ کو لکھ رہی ہوں۔ آپ تعبیر لکھ کر روانہ کریں تاکہ مجھے اطمینان ہو۔ میں نے خواب دیکھا ہے کہ قیامت قائم ہے، تمام خلق اللہ میدانِ محشر میں جمع ہے اور ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے، ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں، کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔ اتنے میں میری نظر ایک مکان پر پڑی، جو نہایت چمک دار صاف وشفاف بنا ہوا ہے۔ اس میں چند حضرات نہایت اطمینان سے بیٹھے ہیں، ان میں آپ بھی ہیں۔ میں آپ کو دیکھ کر دروازہ پکڑ کر کھڑی ہوگئی تاکہ آپ مجھے بھی اندر بلالیں، مگر آپ نے جب نظر اُٹھا کر دیکھا تو کہا کہ یہاں تمھارے لیے جگہ نہیں ہے، البتہ میں تمھیں گھر دلاؤں گا، تم اطمینان رکھو، میں تمھارے لیے انتظام کردوں گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی''۔

نانا مرحوم ۱۳۴۲ھ میں حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں سے یہ پہلا خط اپنی صاحبزادی کو لکھا:

''نور چشمی حمیدہ سلمہا!

بعد دعا کے معلوم ہو کہ جس وقت بیت اللہ پر میری پہلی نظر پڑی، فوراً تمھارا خواب یاد آ گیا اور اس کی تعبیر بھی سمجھ میں آ گئی، کہ میں نے تم کو جنت میں گھر دلانے کا جو وعدہ کیا ہے، اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چناں چہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بیت اللہ شریف کا سات طواف کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کا ثواب تمھارے نامۂ اعمال میں شامل کر دیا اور تمھاری والدہ (یعنی یحییٰ کی والدہ) کے لیے بھی بیت اللہ شریف کا سات طواف کر کے دو رکعت نماز پڑھ کر اس کے نامۂ اعمال میں اس کا ثواب شامل کیا۔ میں نے تم کو گھر دلانے کا جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر دیا۔ اب اس گھر کو آباد رکھنا نہ رکھنا تمھارا کام ہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا اور نفع و نقصان صرف اس کے قبضے میں ہے۔ اس اعتقاد اور اس عمل سے اس گھر کی آبادی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں اس کی بربادی ہے۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب تم دونوں کا کام ہے کہ اسے آباد رکھو یا نہ رکھو''۔ (احمد حسین از مکہ معظّمہ)

نانی مرحومہ اور والدۂ مرحومہ دنیا سے اس عقیدے پر گئی ہیں کہ ان کے لیے جنت میں گھر پہلے ہی سے موجود ہے۔

مولانا مرحوم علوم و فنون میں جامع و کامل ہونے کے ساتھ زہد و تقویٰ اور کتاب و سنت کی اتباع میں بھی پیش پیش تھے۔ عالم باعمل اور عامل باعلم کا مجمع البحرین تھے۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار رہا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ اور شہدائے احد کے مناقب و فضائل میں ایک کتاب لکھی تو اس کی چوتھائی قیمت فقرائے مدینہ پر وقف کی۔ حج کے موقع پر مکہ مکرمہ سے اپنے ذوق کے مطابق بہت سی کتابیں خریدیں، جن میں کئی

مجلد تھیں۔ بعد میں ان کی جلدیں خراب ہوئیں اور دوبارہ تجلید کی باری آئی تو وہی حرم محترم والی دفتیاں خاص طور سے تاکید کر کے لگوائیں اور فرمایا کہ یہ حرم سے آئی ہیں، اس میں خیر و برکت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک بنام شاہ مصر مقوس کا عکسی فوٹو اپنے کپڑوں کے اندر صندوق میں رکھتے تھے اور جب کوئی خاص آدمی آتا تو خاص طور سے اسے دکھاتے تھے۔ آپ کی صاحبزادی یعنی والدۂ مرحومہ کو خاندان ہی کے ایک صاحب نے ایک پیشہ ور پیر سے بیعت کرایا۔ جب مولانا ڈھاکہ سے تشریف لائے اور اس کی خبر ہوئی تو شجرہ منگا کر چاک کر دیا اور فرمایا کہ تم یہ بیعت توڑ دو، یہ دنیا دار پیر ہیں، ان سے کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا۔ گھر پر ہمیشہ تاکید فرماتے کہ دروازے سے کوئی بھوکا نہ جائے۔ چناں چہ سائل، دوست احباب اور رشتہ دار میں سے کوئی شخص ان کے یہاں سے بغیر کچھ کھائے پیے واپس نہیں ہوتا تھا۔ وہ مکان پر ہوں یا باہر اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ کئی یتیم بچوں اور بچیوں کو پالا، ویسے بھی کبھی کبھی یتیموں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر تاکید رہا کرتی تھی کہ ان کے سامنے سے روٹیاں نہ اٹھائی جائیں۔ چناں چہ جب یتیم کھا کر جانے لگتے تو وہ روٹیاں اٹھا لیتے تھے۔ یہ تماشا آپ کے لیے بڑا خوش منظر ہوتا تھا اور جب وہ روٹی کے لیے آپس میں جھگڑا کرتے تھے تو ان کی اس ادا پر بہت خوش ہوتے تھے۔ مروّت اور شرافتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ جس نے جو مانگا، گھر میں رہا تو اٹھا کر دے دیا، ان کی اس شرافت سے بعض لوگ غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ بعض اوقات اس زمانے کے لحاظ سے بڑی بڑی رقم مضاربت کے طور پر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے اور جب آخر میں وہ نقصان دکھا دیتے تو خاموش رہ جاتے۔ ان کے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ مرحوم کا خیال تھا کہ اس طرح والد صاحب پسماندہ رقم کو امداد کے طور پر لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اس لیے کبھی تقاضا تک نہیں کرتے تھے۔ ان تمام نیک کاموں میں ان کی اہلیہ مرحومہ بھی ان ہی جیسا ذہن و مزاج رکھتی تھیں اور گاؤں بھر کے لوگ بلا تکلف ان کے یہاں سے ضرورت کی چیزیں لے جایا کرتے تھے۔ عاریت اور منگنی دینے کے لیے

خاص طور سے مختلف قسم کی با کار اور بے کار چیزیں الگ رکھی رہتی تھیں، جو صرف گاؤں محلّہ کے کام آتی تھیں۔

ان کے دوست احباب کا حلقہ محدود تھا اور ان سے انتہائی بے تکلفی، خندہ پیشانی اور مکارمِ اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ صاحب اور ان کے خاندان سے خصوصی تعلقات تھے۔ نیز ڈھاکہ کے ایک معمر بزرگ حضرت شاہ عبداللہ صاحب رمنہ میں رہتے تھے۔ ان کی عمر بہت زیادہ تھی اور تجربات ومشاہدات بھی تھے۔ شاہ صاحب بھی ان پر بہت مہربان تھے۔ نواب صاحب اور شاہ صاحب کے بہت سے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ بہت سے اب تک مجھے یاد ہیں۔ کتابوں کے عاشق تھے۔ ان کا کتب خانہ جملہ علوم وفنون کے نوادرات سے پُر تھا۔ بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں نہایت قرینے اور حفاظت سے رہتی تھیں۔ کتاب خریدتے وقت اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ ان کا کاغذ سفید، چکنا اور چمک دار نہ ہو۔ فرماتے تھے کہ ایسی کتاب کے مطالعہ سے آنکھ کی روشنی پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کتب خانے میں کئی کتابیں سرخ اور سبز رنگ کے کاغذ کی تھیں۔ بچپن میں جب میں نانہال جاتا تھا تو کچھ پتہ نہ چلنے کے باوجود اسی کتب خانے اور الماریوں میں پڑا رہتا تھا۔ اسی زمانے سے مجھے کتابوں کا ذوق ہوا، جو آگے چل کر کام آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا یہ علمی ذوق میرے نانہال کی دین ہے، جو والدہ کے ذریعہ مجھے نصیب ہوئی ہے۔

مولانا مرحوم مبارکپور کے ان علمائے مصنفین میں سے ہیں، جنھوں نے پوری زندگی تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور تحقیق ومطالعہ میں بسر کی۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں کئی ایک مطبوعہ اور کئی ایک غیر مطبوعہ ہیں۔ مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) تحفة الاحباء فی فضل المدینة ومناقب سید الشهداء:۔ یہ اسی نام کی ایک کتاب کا اُردو ترجمہ ہے، جس میں مدینہ منورہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

کے فضائل ومناقب درج ہیں۔ یہ کتاب غالباً آپ کی پہلی تالیف ہے۔ ڈھاکہ میں اُردو ٹائپ میں چھپی تھی۔ اس کے سرورق پر درج تھا کہ اس کتاب کی چوتھائی قیمت فقرائے مدینہ پر وقف ہے۔

(۲) احسن المبرّات في هدية الأحياء الى الاموات:۔اصل رسالہ عربی زبان میں مولانا شیخ احمد بن شیخ عثمان مکی کا ہے۔ جو ۱۲۷۷ھ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ میں ہندوستان آکر کتاب وسنت کی تعلیم حاصل کی۔ وہ حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید تھے۔ جب مولانا ۱۳۴۲ھ میں حج کے لیے گئے تو مکہ مکرمہ میں شیخ موصوف سے ملاقات کرکے اس کتاب کے ترجمے کی اجازت حاصل کی۔ ان میں مُردوں کے لیے ایصال ثواب پر احادیث وآثار درج ہیں۔ اس کی طباعت کے لیے کتابت اپنی دیگر کتب کی طرح خود ہی فرمائی ہے۔ ایک صفحہ میں ایک طرف متن اور دوسری طرف ترجمہ درج ہے۔

(۳) القلائد من الفرائد فی شرح الفرائد :۔علم معانی وبیان میں ملامحمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کی کتاب ''الفرائد'' اپنے محتویات ومضامین اور اسلوب بیان کے اعتبار سے نہایت ہی اہم اور مفید کتاب ہے۔ مگر بعض مقامات بہت مشکل ہیں۔ مولانا نے عربی میں اس کی شرح ''سمط الفرائد'' کے نام سے لکھی۔ پھر طلبہ کی سہولت کے پیش نظر اسے اختصار کرکے فارسی میں حاشیہ کے طور پر لکھا، جو عربی متن کے نیچے درج ہے۔ اس کے عربی متن اور فارسی شرح کی کاپی نویسی بھی خود آپ نے ہی کی ہے۔

(۴) حاشیہ ملتقی الابحر (عربی):۔علامہ شیخ ابراہیم حلبیؒ کی کتاب ''ملتقی الابحر'' فقہ حنفی میں نہایت جامع اور مختصر کتاب ہے۔ اس کی مشہور شرح ''مجمع الانہر'' ہے۔ مولانا نے اس میں سے بقدر نصاب حصہ الگ کرکے اس کا حاشیہ تحریر فرمایا اور خود ہی کتابت کی۔

(۵) حاشیہ قصیدہ بردہ وقصیدہ فرزوق (عربی):۔ امام شیخ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدہ بردہ نہایت متبرک قصیدہ ہے۔ جس کو بطور وظیفہ کے پڑھا جاتا ہے اور مشہور شاعر فرزوق کا امام زین العابدین کی مدح میں قصیدہ بہت مشہور ہے۔ مولانا نے ان دونوں قصائد کا عربی میں مختصر حاشیہ لکھا۔ یہ کتاب ڈھاکہ میں چھوٹے سائز پر ٹائپ میں چھپی ہے۔

(۶) سبیل الآخرت:۔ مولانا کی یہ نہایت مقبول کتاب ہے۔ جس میں عالمِ برزخ کے حالات اُردو زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب نے بہت سے لوگوں کو فکرِ آخرت میں لگا دیا ہے۔ مولانا کی مطبوعہ تصانیف میں یہ کتاب سب سے بڑی اور اہم ہے۔ راقم کے علم میں اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دو بار حضرت مصنف نے خود کتابت کر کے گورکھپور سے شائع کیا تھا۔ تیسری بار مولانا محمد عیسیٰ الٰہ آبادی خلیفہ مولانا تھانویؒ نے یوں شائع کیا کہ امام سیوطی کی کتاب ''شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور'' کا ترجمہ شروع کیا اور معتد بہ حصہ کے ترجمہ کے بعد ''سبیل الآخرت'' پر نظر پڑی تو ترجمہ کر کے اس کو شائع کیا اور مقدمہ میں لکھا کہ ایک معتد بہ حصہ اس کا ترجمہ ہوا تھا کہ اتفاقاً ''سبیل الآخرت'' مؤلفہ مولوی احمد حسین صاحب مبارکپوری کی دستیاب ہوئی۔ جس میں مولوی صاحب نے روایات معتبرہ شرح الصدور سے نیز دیگر معتبر کتابوں سے جمع کیا تھا۔ مولوی صاحب کے لیے دل سے دعا نکلی کہ انھوں نے ہمارا کام ہلکا کر دیا۔ چناں چہ میں نے مستقل ترجمہ بند کر دیا۔ مگر مولانا محمد عیسیٰ صاحب نے سبیل الآخرت کے بجائے اس کا نام شرح الصدور رکھا۔ نیز مولانا تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کے بعض مواعظ کا اضافہ کر کے اصل کتاب میں کہیں کہیں معمولی توضیح کیا اور کتاب کے اندر مولانا کا نام دے کر لکھا کہ یہ کتاب ان ہی کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن الٰہ آباد میں، دوسرا ڈھاکہ میں اور تیسرا نہایت آب وتاب کے ساتھ کراچی میں شائع ہوا ہے۔ مگر کسی کے سرورق پر نہ مولانا کا نام ہے اور نہ ''سبیل الآخرت'' کا نام ہے۔

البتہ کتاب کے اندر تصریح ضرور ہے۔ راقم نے اس کے پانچوں ایڈیشن دیکھے ہیں۔ اس کتاب کی یہ مقبولیت حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے حسن نیت اور اخلاص کا ثمرہ ہے۔

(۷) ''تجہیز الاموات:۔ سبیل الآخرت کی تصنیف کے بعد مولانا نے رسالہ تجہیز الاموات تحریر فرمایا۔ جس میں نہایت جامع طور سے مردوں کی تکفین و تدفین کے مسائل فقہ کی معتبر و مستند کتابوں سے بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب بھی اپنے باب میں نہایت مفید اور ضروری ہے اور سبیل الآخرت کی پانچوں اشاعتوں میں اس کے آخر میں چھپی ہے اور چھٹی بار راقم نے اسے بمبئی میں الگ سے طبع کرایا ہے۔

(۸) ''مجرباتِ احمدی:۔ مولانا طب و حکمت میں بے نظیر تھے اور فقیروں اور سنیاسیوں تک سے مل کر ان کے طبی چٹکلے اور مجربات حاصل کرتے تھے۔ اس کتاب میں ان کے خاص خاص مجرب نسخے درج ہیں اور سر سے لے کر پیر تک کے جملہ امراض کا علاج بیان کیا ہے۔ یہ کتاب بڑے کام کی ہے اور اس کے نسخے عموماً تیر بہ ہدف ہیں۔ خود کتابت کر کے گورکھپور میں طبع کرائی تھی۔ مولانا کی یہ آخری تصنیف ہے۔

یہ آٹھ تصانیف فقہ، ادب، معانی و بیان، زہد و رقائق اور فن طب پر ہیں۔ جو ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ آپ نے قدماء کی بعض اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ مثلاً امام رازی کی ''لباب الاشارات'' کتابت کر کے بنارس سے شائع کی۔ اسی طرح بعض کتابوں کے منتخبات چھاپ کر شائع کیے۔

(۹) دیوان احمد:۔ یہ آپ کے عربی اشعار کا مجموعہ ہے، جسے میں نے اور مرحوم ماموں صاحب نے ۱۳۷۷ھ میں بمبئی میں چھپوایا ہے۔ اس کے کل ۴۸ صفحات ہیں۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ اور کئی اہم کتابیں اور حواشی تصنیف کیں اور بعض کتابوں کے مسودات تیار کیے، ان میں ذیل کی کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) منطق میں حاشیہ سلم العلوم۔

(۲) اصول فقہ میں حاشیہ مسلم الثبوت۔

(۳) فلسفہ میں حاشیہ میبذی، یہ ہر سہ حواشی مکمل نہ ہو سکے۔

(۴) الخطب المنبریه من الحِكَمِ العلية ۔ یہ کتاب جمعہ اور عیدین کے خطبات میں ہے۔ اس میں احکام شرعیہ کے اسرار کا بیان ہے اور اکثر عبارت از قسم نثر عاری اور بعض مُسجّع ہے۔

(۵) التحصیل والتکمیل (اُردو) تعلیم المتعلم کے انداز میں نہایت عمدہ کتاب ہے اور اسی نام سے رسالہ ''البلاغ'' بمبئی میں قسط وار پوری شائع ہو چکی ہے۔ جس سے دوسرے رسائل نے شائع کیا۔

(۶) کتاب الفروق فی اللغة (عربی) علم اللغۃ میں یہ کتاب جدید طور پر تصنیف فرمائی تھی۔ جس میں صرف چھ سات ابواب قائم کیے تھے اور ایک ایک لفظ کے ہزاروں مترادف الفاظ جمع کیے تھے جیسے: ''باب اسماء الرجال ''، ''باب اسماء النساء ''، ''باب اسماء الاسد ''، ''باب اسماء الاعضاء ''وغیرہ۔ ان ابواب میں ایک ایک لفظ پر بہت سے مترادفات جمع کر دیے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ مترادف نہ تھے اور ہر لفظ میں وصفی اختلاف ضرور ملحوظ تھا۔ ان ہی وصفی اختلاف وفروق کو ہر لفظ کے ضمن میں بیان فرمایا تھا۔ اس عظیم اور اہم کتاب کی طباعت کے لیے حسب عادت کتابت بھی خود ہی شروع کر دی تھی۔ ابھی کتابت ۸۷ صفحات تک پہنچی تھی کہ کسی ظالم نے کتاب کا اصل مسودہ ہی غائب کر دیا اور یہ اہم کتاب معدوم ہو گئی۔ کتابت شدہ کاپیاں میں نے دیکھی ہیں۔ حمد وصلوٰۃ کے بعد ابتدا یوں تھی: ''الجملة الاولىٰ فی اسماء الرجال التی تخصهم باختلاف لغونهم باب الالف ''۔ یہ جملہ ۸۲ صفحات میں ختم ہوا تھا۔ اس کے بعد ''الجملة الثانية فی اسماء النسوة التی تخصهن باختلاف لغونهن باب الالف ''۔

اس باب کی کتابت کے درمیان کسی نے اصل مسودہ چرا لیا تھا۔

(۷) سبیل الآخرت عالم برزخ کے حالات میں ہے۔ اس کے بعد کے حالات کے لیے مولانا نے دوسری کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور اسی سلسلے میں بہت سا مواد بھی فراہم کر لیا تھا مگر اس کام سے پہلے ان کی زندگی کی کتاب بند ہوگئی۔

آخر کے چند سالوں میں گھر پر زیادہ رہنے لگے تھے اور تصنیف و تالیف اور طبابت کے مشاغل رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک دوست کے علاج کے لیے بڑہل گنج گئے۔ واپسی پر جین پور میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے یہاں رات بسر کی، صبح ہوتے ہوتے دو تین دست آئے اور طبیعت قدرے سست ہوگئی اور قریب ہی عظمت گڑھ میں اپنے بھتیجے مولوی حکیم عبدالمجید کے یہاں گئے۔ یہاں دست کی کثرت ہوگئی اور دن بھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی حال میں رات گزر گئی اور صبح سات بجے ۲۶؍رجب ۱۳۵۹ھ کو وہیں انتقال فرما گئے اور بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم کی طرح آپ کو بھی مکان سے دور ہیضہ میں شہادت کی موت نصیب ہوئی۔ المبطون شھید حدیث میں آیا ہے اور وہاں سے میت چارپائی پر رسولپور میں لائی گئی۔ مولانا کی موت کی خبر قصبہ مبارکپور اور اطراف و جوانب میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور اسی روز شام کو چار بجے رسولپور کے اپنے آبائی باغ میں دفن کیے گئے۔ قبر کی پہلی رات شب معراج تھی۔ مدرسہ احیاء العلوم بند کر دیا گیا اور ہزاروں عوام، علماء اور طلبہ جنازہ میں شریک ہوئے، رحمۃ اللہ علیہ۔ عظمت گڑھ میں جب ہیضہ کا شدید حملہ ہوا تو رائے ہوئی کہ آپ کو انجکشن دیا جائے، جب اس کی اجازت طلب کی گئی تو فرمایا کہ زندگی بھر میں نے انگریزی دوا استعمال نہیں کی، اس کی سیال دواؤں میں الکحل ہوتا ہے، معلوم نہیں زندگی باقی ہے یا نہیں، میں قبر میں حرام چیز لے کر جانا نہیں چاہتا۔ اس واقعہ میں اربابِ عزیمت کے لیے بڑی عبرت ہے۔ راقم اس زمانے میں مرادآباد میں تعلیم کا آخری سال پورا کر رہا تھا۔ مبارکپور کے مشہور اسماعیلی عالم جناب ملا رحمت علی صاحب نے مولانا مرحوم کا یہ مرثیہ کہا ہے:

والھفتا صرف الزمان الانکد — ینعیٰ لنا فقد الفرید الاوحدِ
لھفی علیٰ فقد العلیم المتقی — المرتقی احمد حسین الازھدِ
فی الدین والدنیا سعیداً عاش ، قد — مات شهیداً بالقضاء الاسعدِ
قدمات فی عظمت کدٍ ثم نُقِل — نحو رسول بور حیث المولدِ
فی الیوم ظل ثاویاً فی قبرہ — باللیل اسری عبدہ فی المسجدِ
اخلف نجلاً واحداً یحییٰ بہ — یبقی لہ اذکی ثناءٍ سرمدی

یارب قدس روحہ والطف بہٖ
واغفرلہٗ بالمصطفیٰ محمدِ

اور حجاز مقدس کے مشہور عالم وادیب اور شاعر الشیخ السید محمود المدنی مدرس الحرم المدنی نے آپ کے عربی دیوان پر منظوم تقریظ لکھتے ہوئے آپ کے فضائل ومناقب میں یہ اشعار کہے ہیں:

لاحمد حسین الحبر دُرّۃ عصرہ — ادیب مبارکفور سابق الاقرانِ
حریری اقلیم البلاغۃ من غدا — بتائید رب العرش محمودِ سبحانِ
لقد جمع اللّٰہ محاسن کلھا — لاجدادہ کانوا ائمۃ ازمانِ
توارثھا عنھم و اورث بعدَہ — لاحفادہ الغرالکرام ذوی الشانِ
سعی لبنی الاسلام طول حیاتہ — بوعظٍ وارشادٍ ودرسٍ وتبیانِ
وکان اماماً فی العلوم ، مؤیداً — من اللّٰہ منصوراً باوضح برھانِ
مضیٰ وتوفاہ المھیمن لیلۃً — زھت کان فیھا المصطفیٰ ضیف رحمٰنِ

ومات ولٰکن لم یمت بعد علمہ
علیہ من المولیٰ سحائب رضوانِ

منظومۂ تقریظ کتاب ”خزینۃ العقیان“ مؤلفہ مجی مولوی احمد حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ:

وہ چہ خوشا صلِ علی حبّذا ہر دو جہاں نقدِ روانم فدا
برضے منتخبِ روزگار رشک دہِ لعبتِ چین وتتار
جلوہ فزائے خرد وفہم و ہوش نطق دہِ ناطقہ و خود خموش
زلفِ کشِ لیلیِ زیبا طراز پردہ کشائے بسر ودِ حجاز
زیورِ منشور کلامِ عرب گوہر منظوم نظامِ ادب

یعنی ہماں نامۂ سلکِ گہر
در عجم از بحرِ عرب جلوہ گر

(منقول از دیوان ظفر عینی مبارکپوری قلمی)

مولانا کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ زوجین، صاحبزادی محترمہ حمیدہ اور صاحبزادے محترم مولانا محمد یحییٰ۔ صاحبزادی میری والدہ مرحومہ نے ان کی زندگی ہی میں سہ شنبہ ۲۲ ؍ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ کو انتقال کیا۔ بعدہٗ آپ نے ۲۶ ؍ رجب المرجب ۱۳۵۹ھ میں وصال فرمایا۔ پھر زوجہ محترمہ میری نانی صاحبہ جمعۃ الوداع ۲۶ ؍ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ میں وفات پائی اور آخر میں میرے ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے دوشنبہ ۱۱ ؍ صفر ۱۳۸۷ھ میں انتقال کیا، رحمہم اللہ وغفرلہم۔ مولانا احمد حسین صاحب کے حالات کے لیے مقدمہ دیوانِ احمد رسالہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۰ء، رسالہ البلاغ بمبئی تعلیمی نمبر و نیز بابت ماہ فروری ۱۹۷۰ء ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی

حضرت مولانا حکیم محمد شریف بن شیخ خدا بخش بن شیخ فتح قلندر بن شیخ حسین علی بن شیخ غلام نبی صدیقی مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ یہاں کے علمائے مصنفین میں جامع المعقولات والمنقولات عالم تھے۔ ان کا وطن مصطفیٰ آباد سوادِ مبارکپور میں بجانب شمال مغرب ایک

میل پر واقع ہے۔مولانا کے دادا شیخ فتح قلندر اپنے زمانے کے بڑے رعب وداب کے رئیس وزمیندار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔اس علاقہ میں بھیم سنگھ ساکن موضع سونا بر کی رہنمائی میں یہ تحریک چلی تھی، جس میں بارہ گیاں (بارہ گاؤں) کے زمیندار وسردار شریک تھے، ان ہی میں شیخ فتح قلندر بھی تھے۔مولوی حسن علی نے ''واقعات وحادثات مبارکپور'' میں لکھا ہے کہ شیخ فتح قلندر و باقر علی زمینداران موضع مصطفیٰ آباد، وحسین بخش و برکت علی ساکنان موضع سرائے مبارک یہ سب کے سب سردار تابع بھیم سنگھ ساکن موضع سونا بر کے تھے اور یہ سب کے سب تھانہ مبارکپور کو لوٹنے آئے تھے[1]

مولانا کے والد شیخ خدا بخش بھی بڑے زمیندار اور رئیس تھے اور اطراف کے زمینداروں میں شہرت رکھتے تھے۔اتوار ۲۹ رمئی ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) میں چکٹ سکٹھی میں اتر جانب پوکھرے کے باغ والی مسجد میں سور کا سر دیکھا گیا۔مسلمان برہم ہو گئے اور قصبہ مبارکپور کے اندر باہر سخت فساد ہوا، جسے مقامی اصطلاح میں گئو پچھنی کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے جوش میں آکر بہت کچھ کرڈالا، بعد میں ان کو سزا بھگتنی پڑی۔عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ہنگامہ بابو رام بلی سنگھ زمیندار گوجر پار اور شیخ خدا بخش ولد فتح قلندر زمیندار مصطفیٰ آباد کی باہمی زمیندارانہ رقابت کا نتیجہ تھا[2]

مولانا کی ولادت بارہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کی خدمت میں رہ کر شرح جامی تک پڑھا، اس کے بعد گھر والوں کی اطلاع کے بغیر مدرسہ حنفیہ جونپور چلے گئے۔ جہاں مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب مرجع بنے ہوئے تھے۔وہاں مولانا ہدایت اللہ اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد مولانا محی الدین صاحب (دریبہ پان الہ آباد)

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور۔ص:۶۶۔

[2] یادداشت قلمی۔شیخ عبدالمجید، پورہ صوفی۔

کی خدمت میں تحصیل علم کی اور وہاں سے ٹونک جا کر مولانا برکات احمد بہاری ٹونکی سے جملہ معقولات ومنقولات اور طب وحکمت کی تکمیل کی۔ مولانا برکات احمد اپنے تلامذہ کو طب کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے کہ اس فن کے ذریعہ اہل علم خدا کی مخلوق کی خدمت کر کے اپنی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ٹونک میں مختلف دیار کے طلباء کا ہجوم رہا کرتا تھا، جس میں نامی گرامی طلبا ہوا کرتے تھے اور مولانا کے ان سے تعلقات تھے۔ ان ہی میں مناظر احسن گیلانی بھی تھے، جن سے مولانا کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور آخر میں دارالعلوم معینیہ اجمیر میں مولانا گیلانی کی دوستی کام آئی۔ مولانا فراغت کے بعد شمس الہدیٰ کالج پٹنہ میں صدر مدرّس مقرر کیے گئے۔ اسی زمانے میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ بدرالدین سے بیعت ہوئے۔ شمس الہدیٰ کے بعد مدرسہ مصباح العلوم الٰہ آباد میں تدریسی خدمت انجام دی۔ یہاں مولانا جم کر تقریباً بیس سال تک پڑھاتے رہے۔ اسی دوران میں تحریک خلافت میں شامل ہوکر مدرسہ کو ملنے والی سرکاری رقم بند کر دی۔ اس وقت مولانا محی الدین نواسہ مولانا فخر الدین الٰہ آبادی مدرسہ کے ناظم ومہتمم تھے۔ مدرسہ سخت مالی دشواری میں مبتلا ہوا، مگر مولانا اپنے موقف پر اڑے رہے اور تعلیم کے ساتھ مدرسہ کا نظم بھی سنبھالتے رہے اور اس طرح محنت وکوشش کی کہ جب مدرسہ کو دوبارہ مولانا محی الدین کے حوالے کیا تو اخراجات سے زیادہ رقم موجود تھی۔ اسی زمانے میں سر شاہ سلیمان (جج فیڈرل گورنمنٹ آف انڈیا) سے مولانا کی رسم وراہ ہوئی۔ سر شاہ سلیمان نے اس زمانے میں ایک عالم سے ملا محمود جونپوری کے ایک رسالے کا ترجمہ کرایا اور الٰہ آباد کے علماء کی خدمت میں نقد ونظر کے لیے بھیجا۔ سب نے ترجمہ کو صحیح بتایا، مگر مولانا نے اپنے صاحبزادے اعجاز احمد اور بھتیجے سمیع اللہ کے نام سے ایک رسالہ اس کے اغلاط میں تحریر فرمایا (یہ دونوں صاحبان اس زمانے میں مدرسہ مصباح العلوم میں زیر تعلیم تھے) اور اسے سر شاہ سلیمان کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس واقعہ سے سر شاہ سلیمان مولانا کے علم وفضل کے معترف ہو گئے اور ہمیشہ لحاظ کرتے رہے۔ چناں چہ جس زمانے میں وہ

مسلم یونیورسٹی کے ذمہ دار تھے اور مولانا مدرسہ مصباح العلوم سے مستعفی ہو چکے تھے، انھوں نے مولانا کو لکھا کہ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر کی ضرورت ہے۔ آپ درخواست روانہ کر دیں میں منظور کرادوں گا۔ چناں چہ مولانا نے ان کے کہنے پر درخواست روانہ کر دی، مگر اسی دوران سر شاہ سلیمان یورپ کے سفر پر روانہ ہو گئے اور اس جگہ پر دوسرے عالم کا تقرر ہو گیا۔ مولانا کی تدریسی خدمت کا زیادہ تر حصہ مدرسہ مصباح العلوم میں گزرا، وہاں سے علاحدگی کے بعد مختلف مدارس میں رہے۔ چناں چہ کچھ دنوں مدرسہ مظہر العلوم بنارس اور وطن میں رہے، اس کے بعد دارالعلوم معینیہ اجمیر تشریف لے گئے، جن دنوں اپنے وطن مصطفیٰ آباد میں تھے، خانقاہ مجیبیہ پھلواری کے موجودہ سجادہ نشین مولانا شاہ امان اللہ اور ان کے بھائی مولانا شاہ عون احمد صاحب پٹنہ سے یہاں آکر مولانا سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مولانا شاہ عون احمد صاحب نے راقم سے اس دور کے حالات بیان کیے ہیں اور مولانا کے ایک عربی قصیدے کی نقل عنایت کرنے کا وعدہ کیا، جسے مولانا نے اپنے مرشد مولانا شاہ بدرالدین صاحب کے متعلق کہا ہے۔ وطن میں مولانا کافی دنوں رہے۔ یہ ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا اور سالانہ امتحان لینے کے لیے آتے تھے اور مبارک پور بازار میں ان کے صاحبزادے حکیم اعجاز احمد صاحب نے مطب جاری کیا تھا، جس میں مولانا بھی تشریف لاتے تھے۔ دارالعلوم معینیہ اجمیر کے لیے صدر مدرّس کی ضرورت تھی اور چوں کہ اسے ریاست حیدرآباد سے مالی امداد مل رہی تھی، اس لیے حیدرآباد سے مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا کو وہاں کی صدر مدرّسی پیش کی۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ مولوی حفیظ اللہ رضوی مبارکپوری ان دنوں حیدرآباد میں مستقل طور سے رہتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی سے ان کے تعلقات تھے اور وہ مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا محمد شریف صاحب کے قریبی تلامذہ میں سے تھے۔ اس لیے جب مولانا مناظر احسن گیلانی کے یہاں مولانا کا تذکرہ آیا تو ہم وطنی کی وجہ سے مولانا گیلانی نے مولوی حفیظ اللہ سے ان کا حال اور خط و کتابت کا پتہ معلوم کیا۔

بہر حال مولانا دارالعلوم معینیہ اجمیر میں صدر مدرّس ہوئے، مگر وہاں ان کے خلاف یہ فتنہ اٹھا کہ وہ صدر مدرّسی کی استعداد نہیں رکھتے ہیں۔ طلبا سے درس میں اعتراض کرائے جانے لگے اور کہا جانے لگا کہ مولانا منطق اور فلسفہ کے زبردست عالم ہیں مگر حدیث وفقہ میں ان کو درک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ شکایت حیدرآباد لکھی گئی اور وہاں سے ایک ذمہ دار عالم آئے اور مولانا کے درس میں شریک ہو کر طلبا کے اعتراض اور مولانا کے جوابات کا منظر دیکھنے کے بعد مولانا سے کہا کہ آپ اطمینان سے پڑھائیں، اب آپ کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، یہ عالم حیدرآباد سے مولانا گیلانی کے مشورے سے بھیجے گئے تھے۔ خود مولانا فرماتے تھے کہ میں نے زندگی بھر افلاطون اور جالینوس کی باتیں کیں، مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ علم کیا ہے۔ ایک زمانے میں جب کسی طالب علم کے بارے میں سنتا تھا کہ وہ صدرا، شمس بازغہ پڑھتا ہے تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ بخاری اور ہدایہ کا پڑھنا پڑھانا آسان نہیں ہے۔

مولانا نہایت قوی ہیکل آدمی تھے۔ قد دراز، رنگ سانولا، سر بڑا، پیشانی چوڑی، آنکھیں بڑی داڑھی گھنی دراز، اونچا پائجامہ، نیچی شیروانی، کاندھے پر بڑا رومال ہوتا تھا۔ بڑے رعب وداب کے انسان تھے، ساتھ ہی اخلاق وشرافت کے پیکر تھے۔ نہایت ملنسار، مشفق اور بامروت بزرگ تھے۔ ان کی بات چیت سے ان کی علمی قابلیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر عمر میں اوراد ووظائف سے شغف بہت بڑھ گیا تھا اور خانقاہ مجیبیہ کی نسبت عملی طور سے ظاہر ہو گئی تھی۔ امام شاذلی کی "حزب البحر" کا وظیفہ اکثر اپنی دوکان میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ مولانا سے مولانا شکر اللہ صاحب نے مدرسہ مصباح العلوم الٰہ آباد میں ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس لیے وہ ہمارے استاذ الاستاذ تھے اور نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب سے مولانا کے تعلقات نہایت استوار وخوشگوار اور برادرانہ تھے، اس لیے مجھ پر بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ جس زمانے میں مصطفیٰ آباد میں مقیم تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ عربی قصائد مجھے

عنایت فرمائیں میں ہندوستان کے عربی شعراء کے کلام اور حالات جمع کر رہا ہوں، وعدہ فرمایا، مگر افسوس کہ اس کا موقع نہ مل سکا۔

ایک مرتبہ مولانا شکر اللہ صاحب کے ایک مد مقابل نے ان پر جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا۔ حاکم بھی مولانا کا مخالف تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ کہ سزا سنانے کی باری آ گئی۔ اسی دوران میں معلوم ہوا کہ اس حاکم کی بیوی مولانا محمد شریف کی شاگرد ہے یا اس سے عزیز داری ہے، جب مولانا سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو فوراً اس حاکم کے بنگلے پر پہنچے اور اس سے فرمایا کہ کل سے تم مسلمانوں کی نماز جنازہ اور جمعہ و جماعات کی نماز پڑھانا۔ میں نے سنا ہے کہ تم مولوی شکر اللہ کو جیل میں ڈالنے والے ہو، اس لیے مذہبی فرائض تم کو انجام دینے ہوں گے۔ حاکم رات میں فیصلہ لکھ چکا تھا، مگر مولانا کی باتیں سن کر ان کے سامنے اپنے فیصلہ کو پھاڑ دیا۔

علمائے خیر آباد معقولات کے ساتھ عربی کا بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے اور ان متضاد صفات کی جامعیت میں وہ خاص مقام کے مالک تھے۔ مولانا بھی اس خیر آبادی امتیاز کے مالک تھے اور منطق و فلسفہ میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ عربی ادب کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، جس پر ان کی عربی کی تصنیفات گواہ ہیں۔ ساتھ ہی عربی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ خاص طور سے قصائد میں کمال رکھتے تھے۔

مولانا نے شنبہ ۲؍ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۵؍جولائی ۱۹۵۲ء کو فجر کے وقت جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں وفات پائی، جہاں ان کے داماد ڈاکٹر محمد یوسف مقیم تھے اور خنجر کے تکیہ میں دفن کیے گئے۔ مولانا کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) الافاضة القدسيه فى المباحث الحكمية :۔ عربی زبان میں حکمت و فلسفہ کی اہم کتاب ہے، جسے ۱۳۶۲ھ میں قیام الہ آباد کے زمانے میں اپنے استاذ زادے مولانا حکیم حافظ سید فخر الدین بن مولانا محی الدین الہ آبادی کے حکم و اشارہ پر تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب میں متن اور شرح دونوں مولانا کے قلم سے ہیں۔

متن کے لیے قلت اور شرح کے لیے اقول کی علامت ہے مقدمہ میں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وبعد فیقول العبد المفتقر الی ربه الباری محمد شریف المصطفیٰ آبادی ان هذه تحفة حکمية لارباب العلم وعشاق الحکمة مشملة علیٰ متن وشرح اوردت فیها من علومهم الادبية والطبعية والالٰهية مسمیا للمتن الاضافة القدسية والشرح المباحث الحکمية''۔

ابتدا میں فلسفہ کی تاریخ لکھی ہے، جس میں معقولات کے اپنے دونوں اساتذہ مولانا محمد ہدایت اللہ خان رامپوری اور مولانا حکیم ابوالبرکات احمد ٹونکی کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے یہ کتاب عالم فاضل کے سرکاری نصاب میں مدتوں شامل رہی۔ مولانا عبدالعلیم رسولپوری نے الٰہیات میں ایک کتاب عربی میں ''الفریدة الوضعية فی الحکمة الالٰهية'' لکھی جو افسوس کہ طبع نہ ہوسکی۔

(۲) نسیم الکلام فی تائید شریعة خیر الانام:۔ یہ کتاب علم کلام میں عربی زبان میں ہے اور اپنے موضوع پر جامع ہے۔ مدتوں داخل درس رہ چکی ہے۔ فی الحال اس کا نسخہ پیش نظر نہیں ہے۔

(۳) جواهر الحکم فی شرح السلم:۔ منطق کی مشہور کتاب سُلم کی شرح حاشیہ کے طرز پر فارسی زبان میں ہے، جس میں سُلم کے مباحث کو نہایت آسان پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

(۴) رموز حکمت:۔ یہ کتاب اُردو زبان میں فلسفہ وحکمت میں ہے۔ اس کا بھی کوئی نسخہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

(۵) سوال وجواب نور الانوار:۔ اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار

کے مشکل مقامات کا بہترین حل ہے۔ یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

(۶) سوال وجواب قطبی ومیر قطبی :۔ منطق کی مشہور کتاب قطبی یعنی شرح شمسیہ اور اس کے حاشیہ میر سید شریف جرجانی کے مشکل مقامات کا سوال وجواب کی صورت میں آسان حل عربی میں۔ مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف میں حاشیہ تفسیر بیضاوی کا پتہ چل سکا ہے۔ رموز حکمت کے علاوہ مولانا کی تمام کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اور کئی میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ مولانا کے یہ حالات راقم کی ذاتی معلومات کے علاوہ مولانا کے صاحبزادے مولوی حکیم اعجاز احمد صاحب سے معلوم کر کے لکھے گئے ہیں۔

مولانا کے مرشد حضرت مولانا شاہ بدرالدین قادری متوفی ۱۳۴۳ھ نے ''نصوص الحکم ''اور'' الفتوحات المکیۃ '' سے متعلق اشکالات کے حل پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی، جس پر مولانا نے یہ منظوم تقریظ لکھی ہے:

خلیلیَّ ھل ھذا مقالٌ لقائلِ	انجم یمانٍ ام صباح الثواصلِ
اذا الکوکبُ الدُرّی فی کبد السماء	ام الشمس طلعت فی لجین المناھلِ
اذاك کتاب محکم بالدلائل	ام السیف سیف الحق فی کل باطلِ
اذاك بیان مبطل سحر بابل	مقر دراری غامضات المسائلِ
لعمری ھوالریحان فی الروض فائحاً	بل العروۃ الوثقیٰ نجاۃ القبائلِ
وکیف من اقتغصت یداہ نجومہ	عفیف، صدوق، مالہ من مماثلِ
ھوالبدر فی الاشراق والنور والھدیٰ	فتشبیھہ بالبدر تحصیل حاصلِ
فطین محیا وجھہ اذانظرتہ	لا بصرت نور اللہ بین الھیاکلِ
ھو المصقع الفطن اللبیب المبجل	فقیہٌ، حکیمٌ، حاکمٌ بالفواصلِ
حوی الفضل والاتقان والزھد والنھیٰ	فلو قلت بحراً این شط السواحلِ
وعامل علم الفضل والزھد والتقی	وکاشف سرالحق روح الافاضلِ

فدم سیدی مانبہ الصبح طائراً　وَمَا هَیّجَ الاشواق قطع المراحلِ
ولا زلت قطباً ثابتاً نیرا الهدیٰ　ولازلت بدراً کاملاً غیر اٰفلِ
ویارب فاغفران ذنبی احاطنی　طوالت ذنوبٌ کالغیوث هواطلِ
اروح وروحی قد تروح الی الهویٰ　فیارب لا تنس وخذ کف غافلِ
وصل علیٰ خیرالبریة کُلِّها　وَاٰلِهٖ ما یبقی المدین بحاملِ

حضرت ملاّ ابوالطیب رحمت علی اسماعیلی

حضرت ملاّ ابوالطیب رحمت علی بن شیخ محمد علی اسماعیلی مبارکپوری یہاں کے علمی و تصنیفی دورشباب کے نمایاں عالم وادیب ہیں۔عربی زبان کے زبردست ادیب وشاعراور اپنے مذہب کے جید عالم ہیں۔انھوں نے ایک زمانے تک ممبئی میں رہ کر بوہرہ قوم کے ایک طبقہ کی قیادت کی اورملا سیف الدین طاہر کے خلاف ۱۹۱۷ء کے غلہ کیس میں فریق مخالف کی قیادت کی۔بمبئی میں کالا ملا کے لقب سے مشہور تھے۔مصروشام اورحجاز کے اسفار کیے۔علم وتحقیق میں پوری زندگی بسر کی اور آخری وقت تک مبارکپور میں اپنے مذہب کے پیشوا رہے۔غلہ کیس میں ناکام رہنے کے بعد ملا سیف الدین طاہر کی بیعت توڑ کر مستقل طور سے مبارکپور بازار میں ایک چھوٹی سی دوکان کرلی اور ملا صاحب کے مخالف گروہ کے ساتھ کام کرنے لگے،مگر بعد میں پھر ملا صاحب سے بیعت کرکے ان کی طرف سے مبارکپور کے عامل تسلیم کیے گئے۔

گولہ بازار میں ان کی چھوٹی سی دوکان پر بچوں کے ذوق کی اکثر چیزیں ملتی تھیں اورغلیل کے ربڑ اور مچھلی کے کانٹے وغیرہ کے لیے لڑکے ملا کی دکان پر چلے جاتے تھے۔ چناں چہ بچپن میں میں نے سب سے پہلے آپ کو اسی دکان پر ان ہی تقریبات میں دیکھا۔ پستہ قد،سیاہ رنگ،گداز بدن،چشمہ ناک پر اور لباس بوہرہ ملاؤں کا ہوتا تھا۔وہ اپنا مذہبی

لباس آخر تک استعمال کرتے رہے۔ ان کی اس وضع میں فرق نہیں آیا۔ چوں کہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب و شاعر تھے اور عرب ممالک کی سیر و سیاحت کر چکے تھے، اس لیے ان کی مجلس بڑی معلوماتی ہوتی تھی۔ میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے یہاں زیادہ آتا جاتا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے بے تکلف ہو گئے اور مجھ پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی خاص مذہبی کتابیں جو لکھ کر پڑھی جاتی ہیں، مجھے پڑھنے کو دیں اور میں اسماعیلی مذہب سے براہِ راست ان کی کتابوں سے واقف ہوا۔ مجھ پر ان کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب بیمار ہوتے تو بوہروں کے نکاح پڑھانے کے لیے مجھے بھیج دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ نکاح نام ہے شاہدین عدلین کے سامنے مہر پر ایجاب و قبول کا اس کے لیے مذہبی عالم کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ان کی علمی صحبت سے ادب و عربیت میں بہت فائدہ حاصل ہوا ہے اور مدرسہ احیاء العلوم میں مدرّسی کے زمانے میں ان کے کئی لڑکوں نے مجھ سے عربی کی تعلیم اور اہل سنت کی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ کہتے تھے کہ مذہبی اصطلاحات اور مسائل عام طور سے ایک ہی قسم کے ہیں، اگر کہیں کوئی اختلاف ہے تو اسے اپنی کتاب میں دیکھ لیں گے۔ ان کی دو بیویاں تھیں، ایک مبارکپور کے سنی خاندان سے، دوسری غالباً بھوپال کی بوہرہ خاندان سے، دونوں سے اولاد کا سلسلہ چلا۔

ملا صاحب تیرہویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کا مکان پورہ دیوان میں تھا۔ خوش قسمتی سے ان کی ایک خودنوشت مختصر سی سوانح عمری گجراتی زبان میں ملی ہے، جو بمبئی میں چھپی ہے، ملا صاحب نے یہ کتاب دراصل ملا سیف الدین طاہر کے منصوص علیہ نہ ہونے پر لکھی ہے، مگر اس میں ابتدائی حالات درج کیے ہیں۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں رحمت علی بن محمد علی قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ میرا تعلق بوہرہ قوم سے ہے اور پیشہ منیہاری ہے۔ میں تیرہ سال کی عمر میں اُردو اور گلستاں پڑھ کر شیعوں کی مجلسوں میں بحور الغمہ کی روایات سناتا تھا۔ میرے والد صحیفہ اور قرآن کے علاوہ اور کچھ پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ صحیفہ گجراتی زبان

میں تھا۔ وہ مجھ سے کہتے کہ تم اسے پڑھو اور سمجھو تو معلوم ہو کہ تم نے کچھ لکھا پڑھا۔ عام طور سے ہماری مذہبی کتابیں گجراتی میں چھپتی ہیں۔ ان ہی ایام میں شیخ عبدالحکیم مبارکپوری اپنے لڑکے کی شادی کے لیے مبارکپور آئے تو میں ان سے گجراتی پڑھنے لگا۔ انھوں نے میری ذہانت دیکھ کر والد صاحب سے کہا کہ اس بچہ کو میرے ساتھ روانہ کردو، والد صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کے ہمراہ مجھے بمبئی بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ والد صاحب نے اپنی بہن کی لڑکی سے شیخ صاحب کے لڑکے کی شادی کردی۔ میری والدہ نے کان کی بالی فروخت کرا کے پانچ روپئے کا انتظام کردیا جو میرے کرائے کے لیے کافی تھا۔ اس زمانے میں بمبئی کا پورا کرایہ دس روپے تھا۔

شیخ صاحب نے بمبئی میں مجھے اپنے یہاں کام پر رکھا، پھر میرے کہنے پر سیٹھ نور بھائی چھاٹن کے یہاں کردیا تاکہ میں کھانے پینے پر بچوں کو تعلیم دوں۔ ان ہی ایام میں میں شیخ سلیمان جی سے ''میزان الصرف'' پڑھنے لگا۔ اسی درمیان میں سیٹھ سرآدم جی پیر بھائی نے ملا حسام الدین صاحب کو کراچی سے بمبئی بلایا۔ وہ پہلے جونی مسجد میں مقیم تھے، پھر ان کو چرنی روڈ اسٹیشن کے سامنے سینی ٹوریم میں جگہ دی گئی۔ شیخ سلیمان مجھے ان کے پاس میثاق کے لیے لے گئے اور ان کے حوالے کردیا۔ انھوں نے مجھے محمد برہان الدین کے حوالے کیا۔ محمد برہان الدین نے سیٹھ سرآدم جی پیر بھائی کو بلا کر مجھے ان کے حوالے کیا اور کہا کہ اس لڑکے کو اپنے مدرسہ میں رکھو۔ میں اس مدرسہ میں پانچ سال تک رہا۔ یہاں میرے استاد ملا محمد علی خوشنویس رامپوری تھے، انھوں نے مجھے ہدایۃ النحو پڑھائی۔ اس کے بعد شیخ عبدالقادر تلواری رامپوری سے تذکیرات کی کتابیں پڑھیں۔ بعدہٗ شیخ یوسف علی بن شیخ مومن کپڑونجی سے جو کہ عربی زبان کے ادیب وشاعر تھے دیوان سیدنا عبداللہ اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ پھر ملا فضل حسین کے حلقۂ درس میں گیا جو تاریخ اور ادب پڑھاتے تھے، بعد میں جب وہ سرآدم جی کے مدرسہ سے نکل کر مرغی محلّہ میں شیخ عبدالحسین ریشم والا کے یہاں چلے گئے تو میں وہاں بھی ان سے ملنے کو جایا کرتا تھا۔ اسی

زمانے میں سیدی محمد بھائی ولی اللہ بن سیدی عبدعلی ولی اللہ جادرہ والا سیفی ٹوریم میں درس دینے آئے میں ان کے سبق میں حاضر ہوتا رہا۔ ایک اور عالم شیخ حسین مانڈوی کچھ والے ادیب وعلامہ تھے، میں نے ان سے دیوان ابن ہانی پڑھا اور شیخ ابراہیم بھانپوری جو کہ شیخ محمد علی حمید الدین کے آخری شاگرد تھے، وہ علم العروض اور علم البدیع میں میرے استاد تھے۔ جس زمانے میں ملا صاحب سرآدم جی کے مدرسے میں زیر تعلیم تھے، علامہ شبلی نعمانی مصروشام کے سفر سے واپس آئے اور سیفی ٹوریم میں ان کے لیے استقبال جلسہ ہوا، جس میں ملا رحمت علی صاحب نے خیر مقدمی قصیدہ عربی زبان میں سنایا۔ جب اس مصرع پر پہنچے ”ومن اشبالنا شبلی “تو علامہ شبلی نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا کیا نام ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟ ملا صاحب نے کہا ابوالطیب علی المبارکفوری (ابوالطیب مشہور شاعر متنبّی کی کنیت ہے) یہ سن کر علامہ شبلی بہت مسرور ہوئے۔ یہ واقعہ ملا صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا تھا۔ میں نے سرآدم جی کے مدرسے میں ملا صاحب کے رہنے کی جگہ جا کر دیکھی ہے۔ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے بعد میں بمبئی سے سورت کا علمی سفر کیا اور وہاں شیخ جعفر بھائی، شیخ عبداللہ بھائی، شیخ محمد علی بن شیخ فیض اللہ ہمدانی یمنی، شیخ داؤد بھائی اور چمن بھائی سے تعلیم حاصل کی۔ یہ تمام شیوخ واساتذہ نص نہ ہونے کو بڑے شدومد سے بیان کرتے تھے۔ یعنی موجودہ داعی مطلق (ملا سیف الدین طاہر) پر امام مستور نے اپنی طرف سے نص نہیں کی ہے کہ وہ اسماعیلی دعوت وامامت کو سنبھالیں بلکہ وہ خود ہی داعی بن گئے ہیں۔ ایک دن میں سیدی محمد بھائی ولی اللہ کے سبق سے اٹھ گیا تو انھوں نے مجھے اپنے گھر بلا کر اس کا سبب دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کے دینی علوم ومعارف کا پڑھنا پڑھانا ولی الامر کی اجازت کے بغیر حرام ہے۔ اس پر ان کی آنکھ میں آنسو آگئے اور کہنے لگے میاں پڑھ لو، پڑھ لو، ورنہ اس سے محروم رہو گے۔ تمہارے گناہوں کی وجہ سے صاحب الامر مستور ہیں اور جو لوگ تمہارے سامنے ظاہر ہیں وہ غیر منصوص ہیں۔ اس واقعہ کے بعد

میں ان کے سبق میں برابر شریک ہوتا رہا۔ شیخ محمد علی بن شیخ فیض اللہ ہمدانی یمنی نے مجھے عربی ادب کی تعلیم دی۔ جب وہ مکہ مکرمہ گئے تو میں بھی تحصیل علم کی غرض سے ان کا ہمسفر رہا۔ انھوں نے کئی سال تک مکہ مکرمہ میں نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے راتوں کو طواف کرتے تھے اور غلاف کعبہ پکڑ کر زار و قطار روتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے شہر طوس کا سفر کیا۔ میں نے ایک واقعہ سے بددل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور شیخ صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ طوس گئے۔ وہاں ایک عورت سے علمی و دینی گفتگو کے بعد اس کے امام مستور ہونے کے چکر میں رہے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت نزاریہ ہے اور یہ امام نہیں ہوسکتی۔ شیخ صاحب نے قیام طوس کے زمانے میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کا ایک مصرع یہ ہے: ع

نحن علی دعائم الاسلام

زمانہ طالب علمی میں پانچ سال تک میرے گھر سے خطوط آتے رہے اور میں ان کو بغیر پڑھے بکس میں رکھتا رہا۔ ایک مرتبہ ایک دوست نے مجھے گھر کا خط دیتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھ لو، میں نے پڑھا، اس میں لکھا تھا کہ ہم تم کو پانچ برس سے برابر خط لکھتے ہیں، مگر تم نے آج تک کسی خط کا جواب نہیں دیا، اب ہم نے سمجھ لیا ہے کہ تم دنیا سے گزر چکے ہو۔ یہ بات میرے دل پر نشتر کی طرح لگی اور دو دِن کے بعد ملا برہان الدین کے قدم بوس ہو کر وطن جانے کی اجازت چاہی، انھوں نے مجھے سید عبد علی محی الدین کے پاس بھیج دیا۔ وہ میرا امتحان لے کر ملا صاحب کی خدمت میں لیوا گئے اور میرے بارے میں گفتگو کی۔ ملا صاحب نے ملائیت کی سند اور اس کے لوازم کے ساتھ مبلغ ساٹھ روپے نقد وطن جانے کے لیے عطا کیے اور میں خوشی خوشی وطن آیا اور کچھ دن مبارکپور میں قیام کرنے کے بعد بمبئی آ کر ملا محمد برہان الدین کے قدم بوس ہوا۔ ملا صاحب نے دریافت کیا کہ تم کو اب کاروبار کرنا ہے یا مزید علم حاصل کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کاروبار کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ شہر کے کسی مدرسے میں لگ

جاؤ۔ چناں چہ میں نے اپنے ایک دوست تراب علی کے ساتھ چے پنجک کی چال میں مدرسہ قائم کر کے تعلیم شروع کر دی۔ اس کے بعد آدم جی بھائی رنگون والا نے مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور میں وہاں تعلیم دینے لگا۔ اسی درمیان میں ایک جگہ بڑی عمر کے تاجروں کو عربی کی ابتدائی تعلیم دینے لگا اور دو دو بجے رات تک انبیاء کے واقعات اور فتوحات کی داستانیں بیان کرتا تھا۔ ان مجالس میں اپنے شیوخ واساتذہ کی زبانی سنے ہوئے واقعات کو بیان کرتا، ساتھ ہی موجودہ داعی پر امام مستور کی طرف سے نص نہ ہونے کی تفصیل بتاتا تھا۔

ملا صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں بسر کیا اور چوں کہ داعی وقت کے امام مستور کی طرف سے منصوص علیہ ہونے کے قائل نہیں تھے اس لیے فتنہ باغیہ اور آزاد پارٹی کے رہنما بن کر سیفی محل کی طرف سے مطعون رہے۔ استاذ محمد حسن مبارکپوری اعظمی نے تاویل دعائم الاسلام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ امام مستور سے دعوت کا اتصال تینتالیسویں داعی مطلق ملا عبد علی سیف الدین تک قائم رہا، ان کے بعد ۱۲۵۶ھ میں عبدالقادر نجم الدین بن طیب زین الدین نے داعی مطلق محمد بدرالدین کو زہر دے دیا اور یہ دعوت حقیقت سے صورت میں بدل گئی اور وراثت کے طور پر دو خاندانوں میں چلنے لگی، ایک عبدالقادر نجم الدین، دوسرے ان کے بھائی عبدالحسین حسام الدین۔ یہ سیف الدین طاہر متوفی ۱۳۸۵ھ کے دادا تھے۔ حالاں کہ دعوت کی نص عبدالحسین حسام الدین کے بھائی طیب زین الدین کے حق میں تھی (مقدمہ تاویل دعائم الاسلام ص ۲۵ ج ۱) اور ایک جگہ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ھولا جمیعاً لیسوا من سلالة الائمة (ص ۲۲) یعنی یہ موجودہ دعاۃ سب کے سب ائمہ کے خاندان سے نہیں ہیں۔ ملا رحمت علی بھی اس خیال سے اتفاق کرتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں باغی بوہروں کی طرف سے ملا سیف الدین کے خلاف غلہ کیس چلا، یعنی اوقاف، مذہبی رقوم، زکوۃ وغیرہ قومی ملکیت پر صرف ملا صاحب اور ان کا خاندان کیوں قابض رہے۔ ملا رحمت علی کئی سال بڑی کامیابی سے

اس مقدمے میں رہنمائی کرتے رہے، مگر آخر میں ناکام ہوئے تو ان کے خلاف فضا پیدا ہوگئی اور وہ یہاں سے مبارکپور جا کر منیہاری کی دکان کرنے لگے۔ امام منصوص کی تلاش میں انھوں نے مصر و شام وغیرہ کا متعدد بار سفر کیا۔ عالم اسلام کے مشاہیر سے مل کر ان سے سوالات کیے۔ چناں چہ ایک مرتبہ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچے اور ان سے دریافت کیا کہ آپ امام منصوص تو نہیں ہیں؟ ملا رحمت علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں امام الزماں کی تلاش میں رہتے تھے اور اس بارے میں دونوں کی خط و کتابت رہا کرتی تھی۔ ملا صاحب نے مجھے خواجہ حسن نظامی کے بعض خطوط دکھائے تھے۔ ملا صاحب کے یہاں ان کی مذہبی کتابوں کے علاوہ علمی و ادبی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں دیوان ابونواس، دیوان ابن ہانی، العقد الفرید اور ان کی مذہبی کتاب دعائم الاسلام کا مطالعہ ان ہی کے کتب خانے کی بدولت کیا۔ آخری دنوں میں بیمار رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عصر کے بعد مجھے بلوایا، میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا کہ مجھے اٹھاؤ، چناں چہ ان کو بٹھایا گیا۔ انھوں نے کہا کہ انسان کی روح بڑی وفادار ہوتی ہے، تمام حواس و جوارح جواب دیتے ہیں، مگر روح آخر تک ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بعد میں صبح حاضری کا وعدہ کرکے واپس آیا اور جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ رات کے آخری حصے میں ملا صاحب انتقال فرما گئے۔ تاریخ وفات ۱۷ر جون ۱۹۴۴ء ہے۔ ملا صاحب مدرس و مصنف اور عربی و گجراتی کے کامیاب شاعر تھے۔ خود فرماتے تھے کہ میں ایک زمانے میں ایک گھنٹہ میں پچاس ساٹھ اشعار کے عربی قصائد کہا کرتا تھا۔ اگر ان کے عربی اشعار و قصائد جمع کیے جاتے تو اچھا خاصا دیوان بن جاتا۔ ان کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) سوانح خودنوشت:۔ یہ رسالہ گجراتی زبان میں ہے، جس میں ملا صاحب نے اپنے ابتدائی حالات بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ داؤدی بوہرہ کے موجودہ امام و داعی ملا سیف الدین طاہر غیر منصوص تھے۔ یعنی ان کی امامت و دعوت پر امام مستور کی طرف

سے نص نہیں تھی۔ اس کی ابتداء میں ملا صاحب کا فوٹو بھی ہے۔

(۲) آئینہ حق نما:۔ مشہور اسماعیلی داعی احمد نیشاپوری کی کتاب ''ابو خیزۃ الکافیۃ'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ ۱۳۲۶ھ میں طبع ہوا تھا۔

(۳) ضیاء الحق:۔ ملا صاحب کی مستقل تصنیفات میں سے ہے۔

(۴) وصیت نامہ:۔ گجراتی زبان میں منظوم رسالہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بھی ان کے متعدد رسائل ہیں، جن میں سے بعض کی تبییض راقم نے طالب علمی کے زمانے میں کی تھی اور وہ طبع ہوئے تھے۔

شمس العلماء حضرت مولانا ظفر حسن عینی فاروقی

حضرت مولانا ظفر حسن بن شیخ نجیب اللہ بن شیخ احمد علی بن شیخ محمد مکرم بن شیخ محمد اعظم بن شیخ لطف اللہ بن شیخ مخدوم رشید بن شیخ مخدوم سعید بن شیخ مخدوم مشید بن شیخ بڑے بن شیخ مخدوم محمد فاروقی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ تیرہویں صدی کے نصف آخر میں محلہ رانی پورہ مبارکپور میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد بن شیخ خضر فاروقی جونپوری کی اولاد سے تھے۔ جن کا خاندان سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں ولید پور، بھیرا اور لہرا وغیرہ میں جاگیردار ہوا اور بعد میں بھیرا میں مستقل بود و باش اختیار کی۔ ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ صاحب شمس بازغہ شیخ بڑے کے پوتے تھے۔ مولانا ظفر حسن نے اپنا خاندانی شجرہ مرتب کر کے شائع کیا تھا، جس میں اپنا نسب نامہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچایا تھا، مگر شیخ محمد بن خضر فاروقی جونپوری کے بعد مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے آباواجداد میں شیخ مخدوم رشید نے مبارکپور میں اقامت اختیار فرمائی اور رشید آباد نام رکھا۔ مولانا ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ دونوں حضرات ڈھاکہ میں تعلیمی مشاغل رکھتے تھے۔

تلاش بسیار اور کوشش مسلسل کے باوجود ان کے حالات مجھے نہ مل سکے۔ ان کی تعلیم کہاں ہوئی؟ اور کن کن اساتذہ سے پڑھا؟ کچھ معلوم نہیں۔ البتہ بعض روایات سے پتہ چلا کہ انھوں نے مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور علامہ شبلی نعمانی سے تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند سے استفادہ کیا تھا۔ خاندانی رئیس وزمیندار ہونے کے ساتھ زبردست عالم اور ذہانت وذکاوت میں بے مثل تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔ اچھے شاعر تھے اور عینیؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا قلمی مجموعۂ کلام میرے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جس میں اُردو، عربی اور فارسی کے اشعار ہیں، زیادہ تر نعت اور مناقب سے متعلق ہیں۔

ان کا کتب خانہ نہایت شاندار اور نوادرات پر مشتمل تھا۔ انتقال کے بعد ان کے بھائی مولوی ولی الحسن صاحب مرحوم نے اس کو مدرسہ احیاء العلوم پر وقف کر دیا۔ مولانا مرحوم کی کوئی مستقل تصنیف کا پتہ نہ چل سکا، البتہ ان کا مرتب کردہ خاندانی شجرۂ انساب ان کی علمی یادگار ہے۔ نیز نانا مرحوم کی کتاب سبیل الآخرت طبع اوّل پر ان کی تقریظ موجود ہے اور مجموعۂ اشعار قلمی بیاض کی شکل میں ہے۔ مولانا کی وفات مبارکپور میں ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں ہوئی اور جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کے جانب شمال والے احاطے میں دفن کیے گئے، جو اُن کا آبائی قبرستان ہے۔

نعت

بحر وحدت کے ہیں دندانِ پیمبر موتی — صدفِ نور کے ہیں یا کہ منور موتی
جا بجا عارضِ گلگوں پہ عرق ہیں اُن کے — یا چلے آتے ہیں تھم تھم کے معطر موتی
پیچ سنبل کو ہے اور رشک میں ہے مشکِ ختن — دیکھ کر زلفِ معنبر کے برابر موتی
حبذا فرقِ مبارک پہ شبِ سرا میں — خوب گنجینۂ رحمت کے نچھاور موتی
صاف آئے صدفِ مُطّلبی سے ہوکر — حضرتِ فاطمہؓ وحضرتِ حیدر موتی

آپ ہیں قلزمِ ذخّارِ نبوت ، لیکن　　اہل بیت نبوی ہیں زر و گوہر موتی
چشم شیدائے جمال نبوی میں کیا ہے؟　　شوکت قیصری و گوہر احمر موتی
خسروِ چرخ چہارم ہے شریک محفل　　یا سرِ شمع پہ روشن ہے مدوّر موتی
عرصۂ حشر میں ہم آئے گے پیشِ داور　　جملۂ کلمۂ طیب کا پہن کر موتی

رباعی

جب منزلِ قبر میں بسیرا ہوگا　　وحشت ہوگی بہت اندھیرا ہوگا
نیکی کا وہاں چراغ ہوگا روشن　　عینؔی قرآں رفیق تیرا ہوگا

تو خداوندِ درونیم خدایا خود آ　　بانقشہائے برونیم خدایا خود آ
شُکرِ وحدت نہ دہد یاریِ استاد گیم　　پابہ زنجیر جنونیم خدایا خود آ
جوششِ بحر و شبِ تار و رہِ نا پیدا　　مادریں ورطۂ خونیم خدایا خود آ
بحضوریِ جنابِ تو نشائیم آخر　　بندۂ سخت زبونیم خدایا خود آ
عینؔیم بندۂ ناکارہ کہ از بارِ گنہ　　سرنگوں بخت نگونیم خدایا خود آ

منظوم خط بنام حاجی مظہر علیم انصاری صاحب

صبا حقوقِ عزیزاں اگر نگہداری　　برو بحضرتِ حاجی علیم انصاری
پس از نیاز سلامے کہ رسم اسلام است　　بگوکہ اے گہر کان لطف وغم خواری
بیادِ صحبتِ دیرینہ رت کشم صہبا　　بہ چہ تم کہ بیادم چرانمی آری
دلم ربودی ویادم بہ نامۂ نہ کنی　　ہمیں وفاست ہمیں است طرز دلداری
گزشت آنچہ گزشتہ از و شکایت نیست　　مگر بگوئی کہ کے عزم انجمن داری
درونِ سینۂ ما شعلہا ست دریادت　　دو چشم ما بہ فراق تو در گہر باری

حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق املوی رحمہ اللہ

حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق بن شیخ جہاں گیر غازی املوی رحمہ اللہ مترجم تلبیس ابلیس رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی کے نام ونسبت سے اہل علم میں مشہور ہیں۔ ان کے والد شیخ جہاں گیر حضرت سید احمد کی تحریک جہاد کے سرگرم غازیوں میں سے تھے۔ املو میں ان کی مسجد ان کے نام سے مشہور ہے۔ افسوس کہ ان کے حالاتِ زندگی بھی معلوم نہ ہو سکے۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ مولانا سید میاں نذیر حسین دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور فراغت کے بعد مدرسہ میاں صاحب واقع پھاٹک حبش خاں میں تعلیمی خدمت انجام دی اور وہیں انتقال کیا۔ کسی بات پر گھر سے خفا ہو کر دہلی چلے گئے تو پھر مبارکپور نہیں آئے۔ ایک مرتبہ ان کے بھائی حافظ محمد اسحاق ان کی ملاقات کے لیے دہلی گئے، اس وقت وہ اپنے سیدھے سادے لباس میں تھے تو مولانا نے ان کو تنبیہ کی کہ شہر میں دیہاتی لباس میں نہیں آنا چاہیے۔ مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے اور نہایت ذی علم اور نیک نفس عالم تھے۔ ان کے علمی تبحر اور حدیث وفقہ اور افتاء میں وسعت علمی کا پتہ فتاوائے نذیریہ سے چلتا ہے، جس میں ان کے بہت سے فتاوے درج ہیں اور بہت سے فتاوے پر دستخط ہیں۔ فتاوائے نذیریہ میں عام طور سے تین عبدالحق کے نام سے ملتے ہیں۔ (۱) ابو محمد عبدالحق لودیانی (۲) محمد عبدالحق ملتانی (۳) اور ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی، یہی مولانا عبدالحق مبارکپوری املوی ہیں، جن کے بہت سے مستقل فتاوے اس کتاب میں درج ہیں اور ان کے آخر میں حررہ محمد عبدالحق اعظم گڑھی عفی عنہ لکھا ہے۔ کہیں صرف عبدالحق اور کہیں محمد عبدالحق اور کہیں ابو محمد عبدالحق ہے۔ اس طرح کے فتاوے جلد اوّل کے صفحات ص ۴۴۶، ص ۴۵۵ ،ص ۴۹۶ ،ص ۵۰۵ ، اور جلد ثانی کے ص ۹۹، ص ۱۹۳، ص ۱۹۷، ص ۲۰۱، ص ۲۵۵ ، ص ۲۹۷ ، ص ۲۵۳ ، ص ۳۹۱ وغیرہ پر موجود ہیں۔

جلد اوّل کے ص ۳۱۶ پر فقیر محمد عبد الحق ۱۲۹۵ھ درج ہے۔ اگر ان کے فتاوے یکجا کیے جائیں تو مستقل تصنیف ہو جائے۔ ان کی تصنیفی یادگار میں امام ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ کی شہرۂ آفاق کتاب ''تلبیس ابلیس'' کا ترجمہ اسی نام سے ہے جو دو بار چھپ چکا ہے۔ ہندوستان اور کراچی کے نسخے ہم نے دیکھے ہیں۔ ناشر کتاب نے مولانا کے ترجمے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ علامہ ابو محمد عبد الحق اعظم گڑھی کا ہے۔ ترجمہ ایک حد تک آزاد اور کسی قدر مفید اشارات کے ساتھ کیا گیا ہے، جس سے مترجم کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فاضل مترجم نے اُردو داں طبقہ پر بہت بڑا احسان کیا کہ ان کے سامنے ایک گراں قدر باب کھول کر رکھ دیا اور آخرت کی کامرانی اور فائز المرامی کا راز ان کو سمجھا دیا۔ (ص ۳ و ۴) مولانا عبد الحق نے اس کتاب کی ابتداء میں دس صفحات میں امام جوزی کے حالات نہایت سلیقہ مندی سے جمع کیے ہیں اور اسی کے آخر میں لکھا ہے کہ آپ کے حالاتِ زندگی پندرہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ طبقات ابن رجب میں مذکورہ ہیں، جن میں بڑے بڑے علمی معرکوں کا بھی بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو سوانح نگاری کا بھی خاص ذوق تھا۔ ہم مولانا کے ترجمے کی چند ابتدائی سطریں نقل کرتے ہیں جن سے ان کی مہارت اور ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شیخ امام عالم ربانی جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی معروف بابن الجوزی الحنبلی واعظ بغدادی نے فرمایا حمد وثنا اعلیٰ شایانِ حضرت باری تعالیٰ ہے، جس نے ترازوئے عدل عقلا کے ہاتھوں میں سپرد فرمائی اور انبیائے برگزیدہ بھیج کر مطیعین کو ثواب کی خوش خبری سنائی اور منکرین کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا اور ان پر سچی کتابیں نازل فرما کر ٹیڑھی جہنمی راہوں سے راہِ راست کی تمیز صاف صاف فرمائی اور ہر قسم کی عملی شریعت بغیر نقص وعیب کے کمال کو پہنچائی۔ میں ایسے شخص کی طرح اس کی حمد کرتا ہوں جس کو یقین ہے کہ وہی مسبب الاسباب ہے اور اس کی وحدانیت کی گواہی

ایسے مخلص کی طرح ادا کرتا ہوں، جس کی نیت میں نہ کچھ شک ہے نہ ارتیاب ہے اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ خاتم النبیین احمد مجتبیٰ بکمال عبودیت ازلی مقبول ہیں۔ جن کو رب عزوجل نے ایسے وقت مبعوث فرمایا۔ جب ایمان کے چہرے پر کفر نے اپنا پردہ لٹکایا تو اس سراج المنیر آفتاب رسالت نے نور ہدایت سے تاریکی کو مٹایا اور امر حق کے چہرے سے باطل کا پردہ اٹھایا اور بندوں کے لیے جو پیغام اترا اس کو صاف صاف بیان کیا اور قرآن مجید کی مشکلات کو واضح کر دیا۔ آخر ان کو ایسے صاف ہموار روشن راستے پر چھوڑا ہے، جس میں نہ اونچا کھالی ہے، نہ ڈھوکا ہے۔ صلی اللہ علیه وعلیٰ جمیع الآل وکل الاصحاب وعلی التابعین باحسان الیٰ یوم الحشر والحساب تسلیماً کثیراً کثیرا''۔ (ص:۱)

اس صاف و سلیس زبان وعبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو عربی زبان کے غامض معانی و مطالب کو واضح طور سے بیان کرنے میں اُردو بان پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ یہ کتاب پونے سات سو صفحے میں چھپی ہے۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے مبارکپوری تلامذہ میں غالباً سب سے قدیم الوفاۃ ہیں۔

حضرت مولانا محمد احمد لہراویؒ

حضرت مولانا حکیم محمد احمد صاحب لہراوی کا قدیم نام بخشش احمد ہے، بلکہ عوام میں اسی نام سے مشہور تھے، مگر وہ اپنا نام محمد احمد لکھتے تھے۔ تذکرہ علمائے حال میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ کی فہرست میں ان کا نام بخشش احمد ہی ہے[1]

[1] تذکرۂ علمائے حال۔ ص:۹۳۔

ان کی پیدائش لہرا میں تیرہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اہل حدیث مسلک کے مشہور علماء میں سے تھے۔ زہد وتقویٰ، سادگی، علم وفضل اور نیکی و بزرگی میں سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ اتباع سنت اور پیروی سلف میں بہت آگے تھے۔ ان کی سسرال سکٹھی میں تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں پہلی بار میں نے ان کو وہیں دیکھا اور ان کی مجلس میں بیٹھا۔ اس وقت وہ تبرک ہو چکے تھے۔ اسّی سال کے لگ بھگ عمر رہی ہوگی۔ پستہ قد، ہلکا پھلکا بدن، اونچا تہہ بند، نیچا کرتا، قوتِ سماع سے بڑی حد تک محروم ہو چکے تھے۔ آلہ مکبر الصوت ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتے تھے اور دوسروں کی بات سنتے وقت اسے اپنے کان پر رکھ لیا کرتے تھے۔ آواز نہایت پست تھی۔ بہت تیز چلتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک رات میں نے لہرا میں گزاری اور مغرب کی نماز ان کی امامت میں ادا کی، سب سے پہلے میں نے ان ہی کو مغرب کی اذان کے بعد سنت پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی سفر میں کسی مسافر کا لوٹا بھول کر لیتے آئے یا وہ خود بھول گیا اور لقطہ کے طور پر اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ تقریباً بیس سال سے وہ لوٹا گھر میں رکھا ہوا ہے۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اس کا مالک تلاش کرتے کرتے آجائے تو اسے دے دیا جائے گا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے اور طالب علموں کی دینی تربیت پر خاص نظر رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے۔ علم نحو وصرف میں ان کے دو رسالے ہیں، ایک الطریقۃ المرضیہ عربی زبان میں اور دوسرا جامع النحو اُردو میں۔ تقریباً اسی سال کی عمر میں راجہ پور سکرور میں پنج شنبہ ۱۵ رشوال ۱۳۶۸ھ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔ میرے ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحب نے عربی میں ان کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

سمعنا صوت ناعٍ صاح یوما ۔۔۔ ھلُموا قد مضی من عالمینا
وذا الماضی محمد احمد من ۔۔۔ اجلّاء العباد، وعابدینا
ینا جی ربہ فی کل وقتٍ ۔۔۔ و فی اللیل یخر لہ الجبینا
یقوم اللیل طرّاً فی صلوٰۃٍ ۔۔۔ یصلّیھا لربِّ العالمینا
واخلف واحداً ولدًا مسمیً ۔۔۔ بمقصودٍ، لہ من صاحبینا
بہ یبقی فضائلہ الجمیلۃ ۔۔۔ وباق اسمہ فی ذاکرینا
توفّاہ المؤکّل وقت ظھرٍ ۔۔۔ وقد کان الخمیس لہ قرینا
تنصف شھر شوال بنقص ۔۔۔ خمیس ختمہ کانت یقینا
فصادف وسطہ وختام شھرٍ ۔۔۔ واولہ وعید المسلمینا
ویوم وفاتہ ولقاء ربہ ۔۔۔ ترحّبہ الملائکۃ اجمعینا
وارّختُ السُنیھۃ من غریب ۔۔۔ فقلت: بفضلہ فقد الرھینا

حضرت مولانا حکیم الٰہی بخش

حضرت مولانا حکیم الٰہی بخش بن حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ لعل محمد عرف لالن بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد مبارکپوری نے اپنی قلمی یادداشت میں اپنا شجرۂ نسب یوں بیان کیا ہے۔ ضلع کے مشہور اطباء اور ماہر حکماء میں سے تھے اور بڑی سمجھ بوجھ کے عالم تھے، علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ ان کی ولادت محلّہ پورہ دولھن میں حدود ۱۲۸۰ھ میں ہوئی۔ ان کے والد حکیم عبداللہ مشہور طبیب اور عالم تھے۔ ان سے قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے مولوی ولی محمد عرف مولوی گودا اور اپنے والد کے شاگرد میاں صاحب عبداللہ شفا ساکن کٹرا سے فارسی کی تکمیل کی، جو ایک صوفی منش بزرگ اور فارسی کے اچھے عالم ہونے کے ساتھ اُردو اور ہندی کے اچھے شاعر بھی تھے اور

جب مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری ۱۳۱۳ھ میں فارغ ہوکر مبارکپور آئے تو ان سے فنون کے علاوہ حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد کانپور مدرسہ فیض عام میں مولانا احمد حسن صاحب کانپوری، مولانا حافظ نور محمد صاحب پنجابی اور مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری سے پڑھ کر معقولات ومنقولات کی تکمیل کی۔ مولانا حکیم فیض اللہ صاحب سے علم طب حاصل کیا اور ۱۳۱۷ھ میں فارغ ہوئے۔ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ مولانا احمد حسن کانپوری کا اصل وطن بٹالہ ضلع گورداس پور تھا۔ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے مرید اور صحبت یافتہ بزرگ تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی تلمیذ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوری مصنف ''تواریخ حبیب الله وعلم الصیغه'' سے حدیث کی سند حاصل کی اور مولانا حافظ نور محمد پنجابی نے ملتان میں مولانا عبدالرحمٰن بن مولانا عبیداللہ سجادہ نشین سے پڑھ کر مولانا عبدالقدوس تلمیذ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے ''فاتحة الفراغ'' پڑھی تھی اور مولانا عبدالوہاب بن شیخ احسان علی بہاری کو حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ معقولات میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے۔ ان تمام حضرات کے خرمن علم وفضل سے مولانا الٰہی بخش نے فیض اٹھایا تھا۔ ابتدائی عمر میں پڑھنے کی طرف توجہ نہیں تھی اور جوانی تک لاابالی پن میں رہے۔ اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ میرا پہلا لڑکا محمد شفیع بن الٰہی بخش تھا۔ اس کا تولد ۱۳۰۱ھ یا ۱۳۰۲ھ میں ہوا اور اسی میں ہے کہ ۱۳۱۷ھ میں فراغت کے سال ان کے لڑکے عبدالباری پیدا ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فراغت کے وقت پختہ عمر کو پہنچ گئے تھے۔ اسی سال ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا اجرا ہوا۔ جس کے آپ پہلے ناظم مقرر کیے گئے اور تقریباً بیس سال تک خدمت انجام دی۔ مدرسۂ ہذا کے پہلے مدرس مولانا محمد محمود معروفی تھے، جو نو روپے ماہوار پر تعلیم دیتے رہے۔ مدرسہ مختلف عمارتوں میں منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کی موجودہ عمارت تیار ہوئی۔ ۱۳۳۶ھ میں مولانا شکراللہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے

فارغ ہوکر آئے تو مولانا الٰہی بخش نے نظامت کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی۔ جب مدرسہ میں طلباء کی تعداد زیادہ ہوگئی تو مولانا کی اہلیہ مرحومہ متوفیہ ۱۳۲۱ھ نے اپنا مکان مدرسہ کے لیے پیش کیا۔ ۱۳۲۰ھ اور ۱۳۲۱ھ کے بڑے طاعون میں جب ہزاروں بچے یتیم ہوگئے تو مولانا اور اراکین مدرسہ نے اس سے متعلق یتیم خانہ جاری کیا۔ جہاں ان کی تعلیم وتربیت کے ساتھ قیام کا بھی انتظام تھا۔

مولانا نے اپنا آبائی پیشہ طبابت جاری کرکے خلق اللہ کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ تعلیم وتدریس میں بڑی مفید خدمات انجام دیں۔ چناں چہ مولانا محمد محمود صاحب معروفی کے تلامذہ میں سے چند لوگوں نے آپ سے بھی تعلیم حاصل کی۔ مثلاً مولوی فقیر اللہ بن حاجی حبیب اللہ ساکن پورہ دیوان، مولوی حکیم عبدالحمید بن حاجی رحمت اللہ بن عبدالسبحان ساکن پورہ رانی، مولوی حکیم محمد سعید بن شیخ محمد عالم ساکن پورہ صوفی، مولوی عبداللہ ساکن پورہ دولھن، مولوی عبدالرحمٰن بن شیخ محمد قاسم ساکن پرانی بستی اور مولوی عنایت اللہ ساکن پرانی بستی۔ افسوس کہ ان میں سے کوئی سند فراغت حاصل نہ کرسکا۔ بعض کی عمر نے وفا نہ کی اور اکثر کاروبار میں لگ گئے۔

مولانا حکیم الٰہی بخش آخری دور میں مستقل طور سے شہر اعظم گڑھ میں مطب کرتے تھے اور ضلع کے طبی بورڈ کے صدر رہتے تھے۔ ۱۳۵۶ھ میں مبارکپور میں انتقال کیا اور پورہ دولھن میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا شکر اللہ مبارکپوری

حضرت مولانا حاجی قاری مفتی استاذ العلماء محمد شکر اللہ بن شیخ عبدالواحد ناظم مدرسہ احیاء العلوم یہاں کے ایک علمی ودینی دَور کے خاتم اور دوسرے علمی ودینی دَور کے بانی ہیں۔ آپ کے والد قصبہ کوپا گنج کے باشندے تھے، بعد میں مبارکپور آکر یہیں

مستقل طور سے بس گئے۔ ان کے ترکِ وطن کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں، واللہ اعلم۔ مولانا محلّہ پورہ رانی میں چودھویں صدی کی ابتداء میں پیدا ہوئے۔ ان کے واقعات وحالات زیادہ تر ذاتی معلومات پر مبنی ہیں۔ جن کو اثنائے درس میں بیان فرمایا کرتے تھے اور کچھ پرانے کاغذ سے ماخوذ ہیں۔

قرآن شریف اور اُردو کی تعلیم اپنے گھر اور محلّہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا اجراء ہوا تو اس میں داخل ہو کر مولانا محمد محمود معروفی متوفی ۱۳۷۰ھ سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ فرماتے تھے کہ میں نے بہت سے اساتذہ سے پڑھا، مگر مولانا محمد محمود صاحب جیسا پڑھانے والا کسی کو نہیں پایا۔ مشکل سے مشکل ترباب کو نہایت سہل اور آسان انداز میں طلبہ کو سمجھاتے تھے۔ خود مولانا کا یہی طریقہ تھا، فرماتے تھے کہ یہ طریقہ میں نے مولانا محمود سے سیکھا ہے۔ ان دنوں مولانا کے گھریلو حالات نہایت ابتر تھے اور معاشی فکر زیادہ رہتی تھی، اس لیے صبح دو گھنٹہ گھر میں کام کر کے مدرسہ جاتے تھے اور مدرسہ سے واپس آکر رات کو بھی کام کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شام کو میدان کی طرف آتے جاتے منطق کی مشہور کتاب ''تہذیب'' کو زبانی دہرالیا کرتا تھا۔ اس زمانے تک شاہ محمد پور میں محرم کے ایام میں مجلسیں بھی پڑھتے تھے۔ تعلیمی شوق اور خانگی مشاغل کی کشمکش میں نحو وصرف وغیرہ کی تعلیم مدرسہ میں مولانا محمد محمود سے حاصل کی۔ گھر کے لوگ تعلیم سے ہٹا کر کام پر لگانا چاہتے تھے۔ آخر بغیر خبر کیے الٰہ آباد جا کر مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان ہی ایام میں اتفاق سے مولانا حکیم الٰہی بخش ناظم مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد گئے اور راستہ میں ان سے مولانا کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے مکان چلنے پر اصرار کیا۔ آخر اس شرط راضی ہو گئے کہ گھر پر مجھے تعلیم سے نہیں روکا جائے گا۔ اب بھائیوں کی طرف سے پوری آزادی مل گئی اور مولانا لاہر پور سیتاپور کے ایک مدرسہ میں چلے گئے، جہاں خیرآبادی معقولات کا دریا بہہ رہا تھا۔ آپ نے وہاں معقولات ومنقولات کی تعلیم کے

ساتھ فن تجوید اور قرأت کی بھی تعلیم حاصل کی۔ یہاں مولانا حیدر حسن شاہ اور فیض اللہ صاحب سے شرح مطالع، توضیح تلویح، الافق المبین وغیرہ پڑھیں۔ نیز یہاں کے اساتذہ میں سے مولانا عبداللہ دانیال سے تعلیم پائی۔ یہاں ان کے ایک دوست مولوی احمد علی تھے (مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوری) مولانا نے ان کو دارالعلوم دیو بند جانے کا مشورہ دیا اور خود وہاں سے ریاست مینڈھو علی گڑھ چلے گئے۔ جہاں مولانا ماجد علی جونپوری معقولات و منقولات کا درس دے رہے تھے۔ معقولات میں خیر آبادی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور حدیث کا درس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حاصل کیا تھا۔ مولانا نے ان سے کسب علم کیا۔ چوں کہ ان کے یہ تمام اساتذہ معقولات میں خیر آبادی سلسلے سے وابستہ تھے، اس لیے علمائے خیر آباد کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اثنائے درس میں بات نکلی تو فرمایا کہ جب میں اپنے اساتذہ کے لیے ختم قرآن اور ایصال ثواب کرتا ہوں تو میں علمائے خیر آباد کو بھی خاص طور سے شامل کرتا ہوں۔ وہ حضرات دوسروں کی طرح بدعات وخرافات کے بارے میں تشدد نہیں کرتے تھے۔ ان کا انداز فکر معقولاتی تھا۔ میں نے مولانا سے مرقاۃ، تہذیب، شرح تہذیب، شرح جامی، ملا حسن، ہدیہ سعیدیہ، الجواہر الغالیہ، میبذی، حمد اللہ اور قاضی مبارک پڑھی ہیں اور معقولات میں آپ کے واسطے سے میرا سلسلہ بھی علمائے خیر آباد سے ملتا ہے۔ اس کے بعد مولانا ماجد علی جونپوری کی درسگاہ سے نکل کر دارالعلوم دیو بند میں داخلہ کا امتحان دیے بغیر داخل ہو گئے۔ ہم طالب علموں سے جب اس واقعہ کو بیان فرماتے تو ہم لوگ اس کی ترکیب پوچھتے مگر آخر تک اسے نہیں بتایا۔ اس زمانے میں دارالعلوم دیو بند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب[1] مولانا حافظ احمد صاحب، مولانا شاہ محمد انور صاحب کشمیری اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا فیض جاری تھا۔ آپ نے ان ہی اساتذہ وشیوخ سے تعلیم حاصل کی۔ اپنی ٹھوس استعداد اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے تمام اساتذہ کی نظر میں وقیع تھے۔ عام طور سے سالانہ امتحانات میں

---

[1] یہ تسامح ہے، شیخ الہند اُس زمانے (۱۹۱۷ء) میں مالٹا میں اسیر تھے۔

اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوئے اور اسی امتیازی کامیابی پر ان کو دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک گھڑی انعام کے طور پر عطا ہوئی، جو مولانا تک نہیں پہنچ سکی۔ ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی۔ وطن آئے تو مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب نے مدرسہ احیاء العلوم کی نظامت سپرد کر دی اور ۱۳۳۶ھ سے لے کر ۱۳۶۱ھ تک یعنی ربع صدی کی مدت تک مبارکپور اور اطراف میں وہ علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی کارنامے انجام دیے جو صدیوں کے کام پر بھی بھاری ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا اصلاحی، دینی اور سیاسی رنگ آپ پر کچھ اس طرح چڑھ گیا تھا کہ اسی مکتب فکر وخیال کے سرگرم ترجمان بن کر زندہ رہے۔ اسی درمیان میں اللہ تعالیٰ نے ظاہری خوشحالی اور دولت مندی سے بھی نوازا اور پہلے کا دورِ پریشانی ختم ہوا۔ جس سے اس جواں سال اور جواں حوصلہ عالم کو کام کرنے کی کھلی فضا ملی۔ ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں آپ مبارکپور آئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) ختم ہو چکی تھی، مگر ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں بے چینی عام تھی۔ اسی دَوران میں رولٹ بل آیا اور ستیہ گرہ کی بنیاد پڑی۔ پھر ۱۹۱۹ء میں ولایتی مال اور کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک چلی۔ اس وقت خلافت کمیٹی اور کانگریس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ تحریک خلافت میں مولانا نے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ سمرنا فنڈ، انگورہ فنڈ کے لیے مسلمانوں سے چندے وصول کر کے خلافت کمیٹی کو دیا۔ جلسوں جلوسوں کا اہتمام کیا۔ با قاعدہ عدالت قائم کر کے خود حاکم کی حیثیت سے فیصلے سنانے لگے۔ اس عدالت میں بہت سے پرانے مقدمات طے کیے گئے۔ بالآخر ۱۹؍جون ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ) کو بدیسی مال کے خلاف ستیہ گرہ کرنے پر مولانا اور دوسرے پانچ اشخاص گرفتار کیے گئے اور ان کو چھ چھ ماہ کی قید ہوئی۔ اسی دوران میں شدھی سنگھٹن کی تحریک چلی اور مسلمانوں میں ارتداد کی وبا پھیلانے کی کوشش کی گئی تو مولانا نے اطراف وجوانب میں وعظ وتبلیغ کا سلسلہ جاری کیا اور دیہات دیہات مکاتیب قائم کیے۔ جب فلسطین کو وطن یہود بنانے کا اعلان ہوا تو عربوں کی حمایت میں پیش پیش رہ کر احتجاجی جلسے جلوس

کیے، دعائیں کیں، کرائیں۔ آخری دَور میں جب لکھنؤ میں مدحِ صحابہ کی تحریک چلی تو اس میں بڑے والہانہ انداز میں پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ انگریز دشمنی ان کے خمیر میں تھی اور سامراجی اقتدار کے خلاف ہمیشہ سرگرم رہے۔ سیاست میں کانگریس اور جمعیۃ العلمائے ہند سے وابستہ رہے۔ مولانا کی نظامت کے وقت مدرسہ دینا بابا کی مسجد میں تھا۔ سب سے پہلے مدرسہ کی مستقل عمارت کا کام کیا۔ اینٹ کے لیے قصبے کے باہر بھٹہ کا انتظام کیا، درخت کٹوائے اور مزدوروں کو جمع کیا اور سخت گرمی اور لو کے زمانے میں رات دن کر کے اینٹ تیار کرائی۔ اس کام میں ان کے رفیق مولانا نعمت اللہ صاحب ساتھ ساتھ رہتے تھے اور دوسرے اراکین بھی پوری دلچسپی لیتے تھے۔ ۱۳۴۷ھ میں دیوبندی جماعت کا جمعہ علیحدہ ہوا اور دینا بابا کی مسجد میں جمعہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی نگرانی میں مستقل جامع مسجد تعمیر کرائی اور ۱۳۵۹ھ (یکم جون ۱۹۴۰ء) کو ایک عظیم الشان جلسہ میں اس کی بنیاد پڑی۔ یہ مسجد فن تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ نیز قصبہ کے باہر دکھن جانب عظیم الشان عیدگاہ تعمیر کرائی، جو ۱۳۷۵ھ میں مکمل ہوئی۔ ان دونوں مسجدوں کے لیے قصبہ سے لاکھوں روپے کا چندہ ہوا۔ مدرسہ، جامع مسجد اور عیدگاہ مولانا کی تعمیری یادگار ہیں۔ مولانا نے مدرسہ احیاء العلوم کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تعلیمی واصلاحی خدمات انجام دیں اور بدعات وخرافات کے خلاف نہایت بے باکی سے جنگ کی۔ معاشرتی اور سماجی اصلاح کے لیے سینہ سپر ہوئے۔ اس وقت قصبہ پر بعض خاندانوں کا کافی اثر ورسوخ تھا، جن کی وجہ سے اصلاحی کاموں کے مقابلے میں نہایت سخت حالات سامنے آئے۔ مقدمہ بازی، دوبدو جنگ اور سازش، غرض ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہوئی۔ بریلوی جماعت اور شیعہ جماعت سے سخت مقابلہ رہا، مناظرہ بازی کی نوبت آئی، کئی کئی مہینے جانبین سے تقریری مقابلے ہوتے رہے اور مولانا اپنی جماعت کو لے کر مقابلے میں ڈٹے رہے۔ نہایت کامیاب واعظ تھے، ان کے وعظ میں بڑا اثر تھا۔ ایک موضوع پر بلا تکلف تین تین

چار چار گھنٹے تقریر کرتے تھے۔ موت، حیات، شادی بیاہ، ذات برادری کی غلط رسموں میں بھی ان کا اصلاحی کارنامہ ہے۔ علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی۔ ہر علم وفن کی کتابیں بلاتکلف پڑھاتے اور خوب پڑھاتے تھے۔ افہام وتفہیم میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ آخری دَور میں جب دوسری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں، منطق، فلسفہ اور دیگر علوم وفنون کی منتہی کتابیں بلا مطالعہ اس طرح پڑھاتے کہ مشہور مدرسین بھی نہیں پڑھا سکتے تھے۔ ابتدا میں دورۂ حدیث کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ چناں چہ ان کی درس گاہ سے سندِ فراغت پانے والے کئی علما پیدا ہوئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ غبی سے غبی طالب علم کو ایسا پڑھا سکتا ہوں کہ وہ ہر فن کو بخوبی سمجھ جائے۔ مولانا کتاب پڑھا دینے کے قائل نہیں بلکہ کتاب کے ذریعے فن پڑھاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ آج کل مدرسوں میں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے الفاظ وعبارات اور ضمائر ومراجع پر زور دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ان میں جو فن ہے، اس کی تعلیم دینی چاہیے۔ شرح جامی کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ اس قسم کی کتابوں سے فن نہیں آتا، بلکہ الفاظ وعبارات اور طرز ادا میں ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے درسِ نظامیہ میں مشکل پسندی کے دَور کی کتابیں داخل ہیں۔ ان سے باریک بینی ضرور پیدا ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے نفس فن کا پورے طور سے سمجھنا ضروری ہے۔ اسی لیے قدماء ہر فن کی کوئی مختصر سی کتاب زبانی یاد کرلیا کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے عبارت پڑھواتے تھے، پھر پوری عبارت کا مطلب نہایت آسان اور مختصر طریقے سے سمجھا دیتے تھے اور آخر میں ترجمہ کرا دیتے تھے۔ کسی مشکل مقام آنے سے دو ایک دن پہلے بتادیا کرتے تھے کہ فلاں مقام آرہا ہے، جو ہماری درسگاہوں میں بہت مشکل سمجھا جاتا ہے اور اس پر کئی کئی دن تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر میں اسے اس طرح پڑھاؤں گا کہ پوری کتاب میں سب سے آسان سبق یہی معلوم ہوگا۔ چناں چہ واقعی ایسا ہی ہوتا تھا اور ہم لوگ جب اسے پڑھ کر اٹھتے تھے تو آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ کون سا مشکل مقام ہے۔ ہدیہ سعیدیہ، ملاحسن، حمد اللہ، قاضی مبارک مزہ لے لے کر پڑھاتے تھے اور

فنی اشکالات پر خوب تقریر فرماتے تھے۔ ان کی پڑھائی ہوئی کتابیں جب بھی مجھے پڑھانی پڑی ہیں، بے تکان پڑھایا ہے اور آج بھی ان کو اسی طرح پڑھا سکتا ہوں۔ ہدیہ سعیدیہ اور ملا حسن میں نے بارہا مولانا کے طرز پر پڑھایا ہے۔ کافیہ کا شش منتہا، شرح جامی کا حاصل محصول، تہذیب کا ضابطہ، ملا حسن کا جعل اور پنجہ، حمد اللہ کا امور عامہ، میبذی کی شکل عروسی و شکل حماری وغیرہ، مشکل مباحث کو پانی کر دیا کرتے تھے اور ان کو اس طور سے سمجھا دیا کرتے تھے کہ کتاب میں سب سے آسان بحث وہی معلوم ہوتی تھی۔ اسباق کے درمیان کبھی کبھی غیر متعلق مگر دلچسپ باتیں بھی چھیڑ دیا کرتے تھے اور پورا وقت اسی میں ختم ہو جاتا تھا تو فرماتے تھے کہ یہ بھی تعلیم میں داخل ہے، اس سے ذہن و مزاج بنتا ہے۔ ان کے رعب داب کا یہ حال تھا کہ اچھے اچھے لوگ ان سے آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے، مگر بعض اوقات اسباق میں کھلتے تو انتہائی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ مہینے میں دو ایک بار تمام طلبہ کو دار الاہتمام میں جمع کرتے اور ایک ایک کے بارے میں جو کمزوریاں معلوم ہوتیں غیظ و غضب کے لہجے میں ان کی طرف اشارہ کر کے سخت سے سخت سزا دینے کی دھمکی دیتے اور معلوم ہوتا تھا کہ آج کسی کی خیر نہیں ہے۔ پھر خود ہی اپنے غصے کو ٹھنڈا کرتے اور بات کا موضوع بدل کر طلبہ و مدرسین کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے۔ ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کرتے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچتی کہ وہ اپنے ہر طالب علم کو نہایت معزز و محترم اور زندگی میں کامیاب دیکھنے کی تمنا کرتے اور یہ کہ ان کی ہمت افزائی اور علمی و ذہنی پرورش میں سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اور ان کو اپنے عزیز طلبہ سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ وہ برملا کہتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے طلبہ مضمون نگاری، شعر و شاعری وعظ و خطابت کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی معلومات بھی رکھیں، مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تعلیم کو اس کے حقوق و آداب کے ساتھ حاصل کریں۔ مولانا اپنے طلبہ سے بے انتہا شفقت و محبت کرتے تھے اور ان کی عزت نفس اور خودداری کا لحاظ کرتے تھے۔ قصبہ میں کہیں سے طالب علموں کے بارے میں شکایت آتی تو سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع

کردیتے، مگر طلبہ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر میرے طلبہ پر کسی نے آنکھ اٹھائی تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ میں ان کو غلطیوں پر سزا دوں گا، مگر کسی باہر والے کو ایک لفظ کہنے کا حق نہ دوں گا۔

مولانا نے اپنے عزیز طلبہ کی علمی و ذہنی تربیت کے لیے جمعیۃ الطلبہ قائم کرائی۔ جس میں تاریخ و ادب اور دیگر علمی موضوعات کی ہزاروں کتاب موجود تھی۔ ادبی، مذہبی اور سیاسی جرائد و مجلّات آتے تھے اور طلبہ ان کو پڑھتے تھے۔ ''الاحیاء'' کے نام سے طلبہ کا قلمی رسالہ نکلتا تھا۔ ہفتہ واری تقریریں ہوتی تھیں۔ جہاں مولانا کا وعظ ہوتا تھا، طلباء ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ان سے پہلے تقریر کیا کرتے تھے۔ جب کسی رسالے میں اپنے شاگرد کا کوئی مضمون یا اشعار دیکھتے تو بے انتہا خوش ہوتے تھے، اُسے بُلا کے شاباشی دیتے تھے۔ راقم اُن کا سب سے آخری شاگرد ہے، جسے مرقات سے لے کر حمد اللہ اور قاضی مبارک تک پڑھایا ہے، اس کے بعد پھر کسی کو نہیں پڑھایا۔ بسا اوقات مصروفیات کی وجہ سے فرصت نہیں ملتی تھی تو عصر کے بعد مدرسہ کے صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر مغرب تک پڑھایا کرتے تھے۔ وہ بہترین معلم و مدرّس اور مربی و مصلح تھے۔ طلبہ کے ساتھ نرمی اور گرمی حسب مواقع کرتے تھے۔ مفتی بھی تھے اور ہر قسم کے فتاوے کے جوابات نہایت تحقیق سے تحریر فرماتے تھے۔ ان کے فتاوے ضخیم جلدوں میں جمع ہو سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ مخلصوں کی ایک جماعت تھی، جو ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرتی تھی۔ وقت، روپیہ، پیسہ، محنت سب کچھ خرچ کرنے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ وہ ہر کام اپنی صوابدید سے کرتے تھے، مگر پہلے جماعت کے اعیان سے مشورہ کرلیا کرتے تھے، کوئی کام بغیر جماعتی مشورہ کے نہیں کرتے تھے۔ ان کو عام و خواص سے کام لینے کا سلیقہ خوب معلوم تھا۔ وہ ہر ایک طبقہ اور فرد سے یوں ملتے تھے، جیسے اس سے زیادہ ان کا تعلق کسی دوسرے سے نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً خود لوگوں کے مکان پر چلے جاتے تھے۔ مولانا نے اپنے اخلاص، عزم و حوصلہ اور سلیقہ مندانہ قیادت سے کئی لاکھ روپے اپنی

چھوٹی سی جماعت سے وصول کر کے مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور جماعتی کاموں اور دینی کاموں میں خرچ کیے۔ زندگی بھر مدرسہ یا جماعت سے ایک پیسہ نہیں لیا، بلکہ اپنی ہی دولت خرچ کی۔ اس معاملے میں ان کے بڑے بھائی جناب حاجی محمد زاہد مرحوم بہت حوصلہ مندانہ دل ودماغ رکھتے تھے اور خوب خرچ کرتے کراتے تھے۔ کتنے دینی رسالوں، اداروں اور افراد کی ذاتی طور سے بڑی بڑی رقم سے امداد کیا کرتے تھے۔ ان کی سخاوت سے بہت سے افراد اور ادارے آگے بڑھے ہیں۔ دینی اور اصلاحی کاموں میں انتہائی جری اور نڈر تھے۔ بڑے بڑے حکام تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کے مخالفین پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں بیان کرتے، مگر جب وہ سامنے آجاتے تو کسی کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ قد میانہ، رنگ گندمی، بدن گداز، آنکھیں بڑی اور سرخ، عام طور سے گاڑھے کا کرتا پائجامہ پہنتے تھے، کندھے پر بڑا سا رومال ضرور ہوتا تھا۔ راستہ چلتے تو نگاہ نیچی رہتی اور جس راہ سے گزرتے لوگ دائیں بائیں ہو جاتے یا پھر سلام ومصافحہ کرتے۔ مخالف سے مخالف تر آدمی کی مجال نہیں کہ ان کو تنہا پا کر کوئی نازیبا جملہ سنا سکے۔ یہ ان کے علم وعمل کا رعب داب تھا۔

حج وزیارت کی دولت سے بھی بہرہ ور اور مشرف تھے۔ جاتے وقت جہاز میں برطانوی حکومت کے خلاف تقریر کی، جس کی تحقیقات بعد میں ہوتی رہی۔ فرماتے تھے کہ حرم شریف میں ایک مصری خاتون جو فن تجوید وقراءت میں امامت کا درجہ رکھتی تھی بڑی خوش الحانی اور فنی مہارت کے ساتھ نقاب کے اندر قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتی تھی اور حجاج اس کی قراءت سننے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ مجھے اس کا لہجہ اس قدر پسند آیا کہ میں نے بعد میں وہی لہجہ اختیار کر لیا۔ مولانا مستند اور جید قاری تھے اور ان کا وہی مخصوص لہجہ تھا، جو حرم شریف سے لائے تھے۔ بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی سے قرآن حکیم پڑھا کرتے تھے، مگر سننے والوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ پڑھتے رہیں اور یہ سنتے

رہیں۔ مولانا اپنے عزم و حوصلہ اور کام کی دھن میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے پچیس سال کے قلیل عرصے میں بے شمار دینی، علمی، اصلاحی خدمات انجام دیں۔ وہ علمائے دیوبند کے انتہائی درجہ معتقد تھے، ان کے سوا دوسروں کو بہت کم خاطر میں لاتے تھے۔۔ افسوس کہ ان کو بعض مقامی جھگڑوں میں بھی حصہ لینا پڑا اور ان میں جوش وخروش کے ساتھ سامنے آئے، جس کی وجہ سے ان کی اصلاحی کوششوں کو طرح طرح سے بدنام کیا گیا اور اس میں رکاوٹ آئی۔

۱۳۵۹ھ میں جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ مولانا دن بھر مزدوروں کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اس کے جملہ امور ومعاملات پر نظر رکھتے تھے۔ ان کو جامع مسجد کی تعمیر کا شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ مدرسہ کے مشاغل، جماعتی معاملات اور دوسرے کام میں رہا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحت گرنے لگی اور دِق کا موذی مرض لاحق ہوگیا۔ ابتداء میں اپنے استاد مولانا محمود صاحب معروفی کا علاج کیا، پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، مگر مسجد کے خیال سے بہت جلد واپس آگئے۔ اب اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ چل پھر سکیں۔ شدتِ مرض وضعف کے ایام میں کبھی مدرسہ میں لے جانے کا تقاضا کرتے یا کبھی مسجد میں لے جانے کو کہتے اور ان کی خواہش پوری کی جاتی تھی۔ آخری دنوں میں گھر ہی پر رہے اور دوشنبہ ۵/ربیع الاول ۱۳۶۱ھ میں چاشت کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔ وصال سے چند منٹ پہلے تک کلمۂ شہادت زبان پر جاری تھا اور انگلیاں بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اسی دن قبل مغرب سمودی کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا کے وصال کا دن مبارکپور میں یومِ غم اور جنازہ مشہودہ تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپوری کے بعد یہ دوسرا جنازہ تھا، جس میں اس قدر مسلمان جمع ہوئے تھے۔ ان کے مزار کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے:

"ھذا قبر محی السنۃ الشیخ الحاج مولانا

شکر اللہ المبارکفوری رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ المتوفی یوم الاثنین فی ۱ رخ ۵/ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ"۔

وفات کی خبر پورے ملک میں پھیل گئی اور اخبارات ورسائل نے تعزیتی مضامین لکھے اور ان کے محاسن وفضائل کا کھلے الفاظ میں تذکرہ کیا۔ بہت سے مدارس بند کیے گئے اور ایصالِ ثواب کے لیے ختم قرآن ہوا اور اطراف ملک کے علماء وفضلاء اور مشائخ نے دعائے مغفرت کی۔ ایک صاحب نے تاریخ وفات یہ نکالی ہے: ''سلام الرحمٰن علیکم ادخلوا الجنۃ'' ۱۳۶۱ھ۔ مولانا مرحوم کی وفات کے بعد ایک رات میں نے یہ مبارک ومسعود خواب دیکھا کہ ایک میدان مین جنوباً وشمالاً ایک دریا بہہ رہا ہے۔ اس کے مشرقی کنارے پر ایک پرفضا باغ ہے اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ قبلہ رخ یوں گزر رہا ہے کہ اس کا مغربی شمالی پایہ امام بخاری کے کاندھے پر ہے، مغربی جنوبی پایہ حضرت امام مسلم اپنے کاندھے پر لیے ہوئے ہیں اور مشرقی جنوبی پایہ چند دیگر محدثین وائمہ دین کے ہاتھوں میں ہے اور شمالی مشرقی پایہ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب اپنے سینہ پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں اور سینہ اوپر کی جانب ابھرا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑا وزن ہے اور اسے پوری طاقت سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ تمام فقہاء ومحدثین وائمہ دین سفید ریش، سفید پوش اور طویل القامت ہیں اور مولانا خوب تندرست وتوانا ہیں۔ صرف خانہ دار تہہ بند پہنے ہوئے ہیں، باقی تمام جسم عریاں ہے، حتیٰ کہ سر پر ٹوپی بھی نہیں ہے۔ سینے کے بال صاف نظر آرہے ہیں۔ مولانا مرحوم کے پیچھے تھوڑے ہی فاصلے پر میں اور مولانا شمس الدین صاحب حسینی دونوں چل رہے ہیں۔ میں نے مولوی شمس الدین سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازۂ مبارکہ جارہا ہے، چلو ہم لوگ بھی مولانا سے کہہ کر اس سعادت میں شریک ہوجائیں۔ پھر ہم دونوں جلدی جلدی آگے بڑھے اور مولانا سے اپنی خواہش ظاہر کی، مولانا نے پیچھے مڑکر ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ جب تم لوگ یہاں مستقل طور سے آؤ گے تو اس میں شریک ہونا، ابھی میرے پیچھے چلے آؤ۔

میں تدوین سیر و مغازی کی ترتیب میں بڑی الجھن میں تھا، پہلے باب کے بعد کام آگے نہیں بڑھتا تھا، مضامین کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی تھی، حالاں کہ معلومات یکجا تھیں۔ اسی حال میں پندرہ صفر ۱۴۰۹ھ کی رات میں جو شب پنجشنبہ تھی، خواب دیکھا کہ میں مولوی محمد عثمان صاحب اور مولوی شمس الدین صاحب ایک مکان میں کھڑے ہیں، صحن چھوٹا سا ہے، اوپر چاروں طرف مکانات بنے ہیں، جس کی وجہ سے صحن میں روشنی بہت کم ہے، اس صحن کے جنوبی حصہ میں برآمدہ ہے، جس کے مغربی گوشے میں اوپر کو زینہ جاتا ہے۔ ہم لوگ برآمدہ میں گئے تو دیکھا کہ اوپر سے مولانا شکر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اتر رہے ہیں۔ رنگ پہلے سے صاف، بدن چھریرا ہے اور سفید کرتا پاجامہ بدن پر ہے۔ نیچے اترے اور میرا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر پہلو میں دبائے ہوئے اوپر چلنے لگے۔ میں نے بھرائی آواز میں کہا کہ بیس بائیس سال کے بعد ملاقات ہو رہی ہے، مولانا کچھ نہیں بولے اور اس طرح مجھے لے کر اوپر گئے، جہاں لمبا چوڑا ہال ہے اور جنوبی حصہ میں برآمدہ نما مکان ہے، شمال مغربی دیوار سے متصل تخت اور میز ہے، جس پر کچھ پرانے تکیے پڑے ہوئے ہیں۔ مولانا مغربی شمالی گوشہ میں تخت پر بیٹھ گئے، میں ان کے پاس دائیں جانب بیٹھا، کہا کہ یہیں کچھ دائیں جانب لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کے بعد میں نے بہت تکلیف اٹھائی ہے، اس پر بھی کچھ نہ بولے، مولوی شمس الدین صاحب جو کچھ دُور بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے وہیں سے مجھ کو مخاطب کر کے کہا کہ کتاب کے بارے میں کیا پوچھنا ہے؟ ان کا یہ جملہ سن کر مولانا نے فرمایا کہ وہ ہوگیا۔ اس کے بعد ان سے ہم میں سے کسی کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

اللہ کے فضل و کرم سے اس خواب کے بعد تدوین سیر و مغازی کا مرحلہ آسان ہوگیا ہے کہ پندرہ دن کے اندر یکم ربیع الاول ۱۴۰۹ھ تک پانچوں ابواب کی ترتیب مکمل ہوگئی اور نظر ثانی کے بعد کور کسر درست کرنا رہ گیا۔

۲۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۴؍ دسمبر ۱۹۹۰ء جمعہ کا دن گزر کر شنبہ کی رات

میں خواب دیکھا کہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں، رخ شمال کی طرف ہے، سامنے شمالی مشرقی کونے میں باریش دوتین آدمی بیٹھے ہیں، میں ان سے بات کرر ہا ہوں۔ اتنے میں دیکھا کہ مولانا شکر اللہ صاحب شمالی مغربی حصہ میں سامنے چٹائی پر آکر بیٹھ گئے۔ نہایت آزردہ خاطر، معمولی لباس اور سر نیچا کیے ہیں، جیسے بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ کچھ بولتے نہیں، بس خاموش سرنیچا کیے پڑے ہیں۔ اتنے میں مجھے خیال آیا اور ان کی حالت پر افسوس ہوا، فوراً اٹھا اور ان کو مشرقی جانب اپنے سامنے تکیہ وغیرہ دے کر بیٹھایا، اس کے بعد کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

ادھر تقریباً ہفتہ بھر سے مدرسہ احیاء العلوم میں فتنہ وفساد برپا ہے۔ طلبہ و باورچی میں مار پیٹ، کئی طلبہ کا اخراج ادر نیاپورہ اور پورہ دولھن کے لوگوں کا مدرسہ میں آکر مار پیٹ کرنا اور تھانہ پولیس کی باری، نیز جماعتی زندگی میں انتشار۔ یہ سب باتیں میرے خیال میں مولانا مرحوم کو عالمِ ارواح میں تکلیف دے رہی ہیں۔ چند جاہل قسم کے غیر ذمہ دار مالدار، جماعت اور مدرسہ پر قابض ہیں اور کچھ نوجوان مولوی اس میں اپنی عزت وترقی سمجھ کر ان کے ہمنوا ہیں۔

افسوس کہ وفات کے وقت مولانا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

حضرت مولانا محمد نعمت اللہ ؒ

استاذی حضرت مولانا محمد نعمت اللہ بن حافظ عبدالسبحان بن شیخ پکھن، ساکن محلّہ پورہ رانی مدرسہ کے معاملات میں مولانا شکر اللہ کے دست راست اور عمر میں ان سے بڑے تھے۔ ان کا خاندان کسی زمانے میں مئو سے ترک وطن کر کے مبارکپور میں آباد ہوا، جہاں اسے بڑی خوشحالی اور فارغ البالی نصیب ہوئی ادر خوب پھلا پھولا۔ آپ کے والد حافظ عبدالسبحان صاحب نیک کاموں میں آگے تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں جامع مسجد راجہ صاحب

کی مرمت وتوسیع کے لیے جمعہ کی نماز کے بعد ابتدائی مشورہ ہوا اور طے پایا کہ لوگ حسب استطاعت مدد کریں۔ تو اسی وقت مسجد میں حافظ عبدالسبحان صاحب اور علیم اللہ گرہست نے پچاس روپے دینے کا وعدہ کیا[1] اس زمانے کا پچاس روپیہ آج کل کے ہزاروں روپے سے زیادہ قیمت واہمیت رکھتا تھا۔

مولانا نے چودہویں صدی کی ابتداء میں آنکھیں کھولیں اور عیش وتنعّم میں پروان چڑھے۔ قرآن مجید اور اُردو وغیرہ کی تعلیم گھر اور محلّہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوگئے۔ جو ۱۳۱۷ھ میں ان کے مکان کے قریب کندھی کے کنویں کے پاس جاری ہوا تھا اور مولانا محمد محمود معروفی اس کے پہلے مدرّس تھے۔ آپ نے مولانا محمود سے عربی کتابیں پڑھیں، ان دنوں گھر کے بعض لوگ بسلسلۂ تجارت کانپور میں رہتے تھے۔ مولانا کانپور چلے گئے۔ وہاں جامع العلوم اور فیض عام دو مدرسے چل رہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک میں پڑھنے لگے۔ پھر وہاں سے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ ساتھ ہی اور دو مبارکپوری طالب علم تھے، ایک مولوی عنایت اللہ اور دوسرے مولوی شکر اللہ۔ اس زمانے میں دارالعلوم میں مولانا محمود حسن صاحب جامع ترمذی، مولانا حافظ احمد صاحب صحیح مسلم، مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری سنن ابن داؤد، مولانا حسین احمد صاحب مدنی تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے۔ مولانا نے ان اساتذہ وشیوخ کی خدمت میں یہی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ جس سے دارالعلوم میں بڑی ابتری پھیل گئی اور طلبہ اِدھر اُدھر چلے جانے لگے۔ مولانا بھی وطن چلے آئے اور کچھ دنوں کے بعد پورہ معروف کے ایک مدرسہ میں تعلیم دینے لگے اور وہاں کئی سال تک رہ کر عربی کی کتابیں پڑھائیں۔ پھر جب مولانا شکر اللہ صاحب مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم ہوئے تو آپ بھی اسی مدرسے سے منسلک ہوگئے اور مدرسہ کی تعمیر میں دونوں بزرگوں نے یکساں حصہ لیا۔ اس زمانے کے واقعات اکثر بیان کیا کرتے

---

[1] واقعات وحادثات مبارکپور۔ ص: ۸۷۔

تھے۔ جب کہ مدرسے کی مستقل عمارت کے لیے قصبہ کے باہر اینٹ کا بھٹہ جاری کیا گیا۔ اس میں جلانے کے لیے درخت کٹوائے گئے۔ رات دن ایک کر کے کئی لاکھ اینٹ تیار کی گئی۔ گرمی کا زمانہ، لُو کی شدت اور دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اپنے کاندھوں پر لکڑیاں لاد لاد کر بھٹہ کے پاس لاتے تھے۔ دھوپ میں گھنٹوں گھنٹوں کھڑے ہوکر مزدوروں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ غرض کہ مدرسے کی عمارت میں مولانا شکراللہ کی طرح مولانا نعمت اللہ نے خون پسینہ ایک کر کے خدمت واخلاص کا قلعہ تیار کیا۔ اس کے بعد مدرسہ میں فارسی کے مدرّس کی حیثیت سے رہے اور انتقال کے چند سال پہلے تک علمی ودینی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۳۴۷ھ میں جب جمعہ علیحدہ ہوا تو جامع مسجد کے دیوبندی طبقے کے خطیب وامام بنائے گئے اور آخر تک یہ خدمت بوجہ احسن انجام دیتے رہے۔ بہترین قاری تھے۔ اپنے محلّہ کی مسجد (کپورہ دیوان کے باغ کی مسجد) کے پنج وقتہ امام تھے۔ بہترین خطاط وخوش نویس تھے اور خط نسخ ونستعلیق اور خط عربی جلی وخفی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ مبارکپور میں خوش خطی ان پر ختم ہوگئی۔ مدرسہ کے طلبہ اُردو وعربی خوش خطی آپ ہی کے یہاں لکھتے تھے، ساتھ ہی ہندی اور انگریزی بہترین لکھتے تھے۔ میں نے فارسی کی پوری تعلیم مدرسہ میں آپ ہی سے حاصل کی ہے اور عربی خوش خطی کی مشق بھی آپ سے کی ہے۔ مولانا شکراللہ صاحب جب مبارکپور کے باہر کہیں جاتے تو مدرسے کی نگرانی آپ کے ذمے ہوتی تھی۔ بڑے ذہین وطباع اور بذلہ سنج بزرگ تھے۔ بچوں سے محبت اور ان پر شفقت کرنے میں مشہور تھے۔ سادگی، شرافت، صبر وشکر کے پیکر تھے۔ گردشِ زمانہ سے آخر میں گھریلو معاملات بگڑ گئے تھے اور کنبہ بڑا تھا۔ مدرسہ سے صرف بیس روپے تنخواہ ملتی تھی، جو اس وقت کے تمام مدرسین سے زیادہ تھی، اسی پر گزر بسر فرماتے تھے اور آخر میں کچھ ایسے معاملات سامنے آئے کہ مدرسہ کی مدرّسی سے سبکدوش کر دیے گئے اور بڑھاپے میں کئی سال تک مختلف فرموں میں بھی کھاتہ لکھ کر بسر کرتے رہے۔ افسوس کہ پوری زندگی مدرسہ کی خدمت کرنے کا انجام بہت تکلیف دہ رہا۔ مگر اس زمانے

میں بھی صبر وشکر اور توکل وقناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اگر مولانا کے پاس بھی دولت رہی ہوتی تو وہ بھی اپنے دوست مولانا شکر اللہ کی طرح کامیاب عالم اور مصلح ہوئے ہوتے اور بڑھاپے کی وجہ سے فارسی نہ پڑھا سکنے کے الزام میں مدرّسی سے علیحدہ نہ کیے جاتے۔ آپ کا کتب خانہ اگر چہ مختصر تھا، مگر اس میں بہت ہی نادر ونایاب کتابیں تھیں۔ لغت میں کتاب التعریفات جرجانی اور مختار الصحاح رازی کو سب سے پہلے میں نے آپ ہی کے کتب خانے کی بدولت دیکھا۔ مختار الصحاح اتنی پسند آئی کہ رمضان ۱۳۵۳ھ میں بمبئی سے منگوایا۔ اس زمانے میں اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ اس کے بعد کئی طلبہ نے منگایا۔ حالاں کہ اس وقت تک اس کے سمجھنے کی استعداد نہ تھی۔ میرے کتب خانے کی سب سے پہلی کتاب یہی ہے۔

کسی زمانے میں رنگون اور برما تشریف لے گئے۔ وہاں کے واقعات کبھی کبھی بیان کرتے تھے۔ اپنے طلباء کی ذہنی تربیت کے لیے پہیلیاں بجھایا کرتے تھے۔ چوں کہ بہت اچھے خوش نویس تھے، اس لیے اکثر طلبہ ان سے آیۃ الکرسی وغیرہ لکھا کر اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ قد میانہ، بدن گداز، رنگ گورا، آنکھیں بڑی، وجیہ وشکیل آدمی تھے۔ کھادی کا کرتا، پائجامہ پہنتے تھے۔ معاملہ فہمی اور اصابت رائے کے مالک تھے۔ ان کی درسگاہ کے سینکڑوں طلبہ عالم وفاضل بنے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ یوم سہ شنبہ ۱۸؍ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ کو انتقال کیا اور حیدرآباد کی پچھّم والی مسجد کے دکھن جانب اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ مولانا شکر اللہ صاحب کی وفات کے تقریباً ۱۴؍ماہ بعد آپ کا بھی انتقال ہوگیا اور مدرسہ کے دونوں معمار دنیا سے رخصت ہوگئے۔

مولوی ولی محمد صاحب

مولوی ولی محمد صاحب اور حاجی ولی اللہ صاحب دو بھائی تھے۔ ان کا آبائی مکان پورہ رانی میں کپورہ دیوان کے باغ کے پورب دکھن والی گلی میں تھا۔ مولوی ولی محمد صاحب کی تعلیم کہاں ہوئی؟ کچھ معلوم نہیں۔ البتہ اپنے زمانے میں وہ مبارکپور کے علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ مولانا حکیم الٰہی بخش اور مولوی عنایت اللہ نے ان سے دیوانِ غنی تک فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نیز ان کے فارسی کے تلامذہ میں موضع داؤد پور کے ایک زمیندار اور رئیس بسنت بابو تھے، جنھوں نے جاگیر دارانہ ورئیسانہ رعب داب کے باوجود اپنے بڑھاپے تک اپنے استاد کے کوچے کا یوں احترام باقی رکھا کہ قصبہ میں آتے جاتے ہم طالب علموں اور بچوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا کرتے تھے، کہ یہ میرے استاد کے محلے کے ہیں۔ ان کے بھائی حاجی ولی اللہ صاحب نہایت بزرگ، متقی اور نیک انسان تھے۔ آخری دور میں ان کا ذریعۂ معاش کتابوں کی تجارت تھا۔ ہفتہ میں دو دن اتوار اور جمعرات کو بازار میں قدم رسول کے چبوترے پر دوکان لگاتے تھے۔ باقی دنوں میں کاندھے پر کتابوں کی گٹھری لے کر دیہات گھومتے تھے۔ ترکی حکومت کے زمانے میں میاں بیوی حج کو گئے تو دس بارہ سال تک مکہ مکرمہ میں مجاور حرم محترم رہے اور کفاف کے لیے کچھ کسب معیشت کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ شریف مکہ حسین ہاشمی کا زمانہ تھا۔ واپس آکر پوری زندگی تقویٰ طہارت اور کسب حلال میں بسر کی۔ بڑے تن وتوش کے آدمی تھے۔ شکل وصورت سے سرحدی پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ آواز بہت گرجدار تھی، بہت کم سخن تھے۔ گاڑھے کا مغلئی پائجامہ اور نیچا کرتا اور سفید عمامہ ان کا عام لباس تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ میں بچپن میں اکثر بازار کے دن ان کی کتابوں کی دوکان پر جاکر بیٹھا کرتا تھا اور خاموشی سے کتابیں الٹتا رہتا تھا۔ میرا ذوق وشوق دیکھ کر انھوں نے مجھے

تفسیر چشتی منظوم کا ایک قلمی اور نادر نسخہ دیا تھا۔ جو آج بھی میرے کتب خانے کی زینت ہے، یہ کتاب اب تک غیر مطبوع ہے، اس کا سنہ تالیف ۱۱۹۲ھ ہے۔ حاجی ولی اللہ صاحب ۱۳۵۱ھ کے بعد فوت ہوئے۔

مولوی حکیم محمد شفیع

مولوی حکیم محمد شفیع بن مولانا حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر مبارکپوری مولانا عبدالرحمٰن محدث کے بھائی ہیں۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد حافظ عبدالرحیم سے پڑھ کر اپنے بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور ان ہی سے طب وحکمت کی پوری تعلیم حاصل کر کے مطب جاری کیا اور قصبہ کے کامیاب ومشہور اطباء میں شمار ہوئے۔

مولوی حکیم غلام رسول فاروقی

مولوی حکیم غلام رسول صاحب فاروقی محلہ پورہ رانی کے رہنے والے تھے۔ ابتداء میں دہلی میں رہ کر طبابت کی اور تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پھر کلکتہ جاکر اپنا مطب جاری کیا۔ بڑے بیدار مغز اور فعال آدمی تھے۔ ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا قیام ہوا تو انھوں نے اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی، جس میں یہاں کے شیعہ سنی، بریلوی دیوبندی وغیرہ سب ہی شریک تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدرسہ میں ہر طبقہ اور فرقہ کے بچے بلا تکلف تعلیم حاصل کریں۔ ایک مرتبہ مدرسہ کے سالانہ امتحان کے لیے انھوں نے غازیپور سے مولانا عبدالعلیم رسولپوری کو بلایا تھا۔ دارجلنگ میں بھی کافی عرصے تک رہے۔ وہاں کی ''انجمن اسلامیہ'' ان ہی کی قائم کردہ ہے۔

مولوی محمد یعقوب

مولوی محمد یعقوب بن شیخ عبداللہ بن شیخ قیام الدین بن شیخ لعل محمد، محلّہ پرانی بستی کے رہنے والے تھے۔ مولانا احمد حسین رسولپوری کے ہم سبق تھے۔ ان کے والد مالدار آدمی تھے۔ گھر پر تعلیم کا انتظام کیا اور استاذ کو ایک روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ اس کے بعد مولوی محمد یعقوب نے باہر جاکر تعلیم مکمل کی۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کہاں پڑھا۔ اس زمانے میں مبارکپور کے اہل علم عام طور سے چشمہ رحمت غازیپور کا رخ کیا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے وہیں تکمیل کی ہو۔ ان کے والد بسلسلۂ تجارت حیدرآباد دکن میں رہتے تھے۔ اس لیے فراغت کے بعد وہ بھی حیدرآباد چلے گئے اور وہیں کسی مدرسے میں مدرّس ہوئے۔ مگر افسوس کہ تقرری کے پندرہ دن کے بعد عین جوانی میں وہیں انتقال کرگئے۔ ان کا انتقال ۱۳۱۸ھ کے حدود میں ہوا تھا۔

مولوی قمرالدین ندوی املوی

مولوی قمرالدین بن شیخ علیم اللہ بن شیخ حسن علی ندوی املوی کے والد شیخ علیم اللہ انسپکٹر پولیس اور حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔ شریف الطبع اور نیک آدمی تھے۔ مولوی قمرالدین ندوی، مولوی محمد طفیل املوی کے ہم درس تھے۔ بعد میں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوکر سند فراغت حاصل کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے معاصر تھے۔ بڑے ذہین وطباع عالم تھے۔ افسوس کہ جوانی ہی میں انتقال کرگئے۔

مولوی حکیم شاہ فیاض عالم املویؒ

مولوی حکیم شاہ فیاض عالم بن شاہ مقصود عالم بن شاہ ظہور عالم بن شاہ مخدوم عالم بن شاہ امید علی بن شاہ ابراہیم شاہ پیرزادہ محمد ماد املوی کے خاندان سے تھے، جو اس دیار میں قدیم روحانی خانوادہ تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ مولوی محمد طفیل املوی کے ہم سبق تھے۔ ان کے ساتھ مولانا عبدالعلیم رسولپوری سے نحو وصرف کی تعلیم حاصل کی، پھر باہر جا کر علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ طب وحکمت میں اچھی نظر رکھتے تھے۔ ابتداء میں خاندانی روایت کے مطابق بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری کیا۔ مگر چوں کہ یہ چیز ان کی افتادِ طبع سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اس لیے جلد ہی اس کو چھوڑ کر سسوا بازار میں مطب جاری کیا۔ جہاں ان کے اور ان کے والد کے مریدین ومتوسلین تھے اور وہیں مستقل طور سے اقامت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ وہیں غالباً ۱۳۵۶ھ میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم الطاف حسین سکٹھوی

مولوی حکیم الطاف حسین خاں بن حاجی الٰہی بخش خاں سکٹھی مبارکپور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی کتابیں اپنے محلّہ اور مبارکپور میں پڑھ کر مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور گئے اور مولانا عبدالعلیم رسولپوری اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں طب وحکمت کی تعلیم بھی حاصل کر کے کچھ دنوں باہر مطب کرتے رہے۔ مگر جلد ہی سکٹھی چلے آئے اور یہیں مطب کرنے لگے۔ مدرسہ چشمۂ رحمت سے فراغت کے بعد جب کچھ دنوں کے لیے باہر گئے تھے تو ان کو بعض نہایت مجرب عطائی نسخے مل گئے تھے۔ جن میں وہ خاص شہرت رکھتے تھے۔ میں ایامِ طالب علمی میں شدید قسم کے آشوب چشم میں

مبتلا ہو گیا تھا تو حکیم صاحب نے بڑی توجہ سے میرا علاج کیا۔ میں کئی ماہ تک صبح ان کے یہاں آنکھ میں دوا لگوانے جایا کرتا تھا۔ ۱۶؍دسمبر ۱۹۲۹ء (۱۳۴۸ھ) کو سکٹھی میں فوت ہوئے اور روضہ کے قبرستان میں عیدگاہ کے سامنے دفن کیے گئے۔

مولانا شاہ محمد سریانویؒ

مولانا شاہ محمد بن حاجی محمد اسماعیل بن شیخ کتوارو۔ سریانویؒ کے دادا شیخ کتوارو مئو سے ترک وطن کر کے سریاں میں آباد ہوئے۔ ان کی دستخط میں نے سریاں کے ایک مکان کے بیع نامہ پر دیکھی ہے۔ مولانا شاہ محمد چودہویں صدی کی ابتداء میں سریاں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حافظ شاہ نظام الدین بن شیخ عبدالوہاب سریانوی کے مدرسہ میں ان ہی سے حاصل کی۔ ان دنوں حافظ صاحب کی ذات اطراف و جوانب کے طلبہ کا مرجع تھی۔ حافظ صاحب کی دینی و روحانی تعلیم و تربیت کا کچھ ایسا رنگ چڑھا کہ مولانا کو اونچی تعلیم کا داعیہ پیدا ہوا۔ اس وقت مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری ۱۳۱۳ھ میں فارغ ہو کر وطن میں تعلیمی خدمت انجام دے رہے تھے اور ان کے یہاں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔ چناں چہ مولانا شاہ محمد نے بھی ان سے ابتدائی کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر یہاں سے مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور گئے اور مولانا عبدالعلیم رسولپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور دوسرے اساتذہ سے پڑھا۔ اس کے بعد دہلی جا کر مولانا سید نذیر حسین صاحب کے مدرسہ میں داخل ہو گئے اور ان سے حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ نیز اُن ہی ایام میں ڈپٹی حافظ نذیر احمد دہلوی متوفی ۱۳۲۱ھ سے دیوان حماسہ پڑھا اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت میاں صاحب دہلوی کے مبارکپوری تلامذہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا محمد احمد صاحب لہراوی، مولانا عبدالحق املوی

اہل حدیث مسلک کے تھے۔ مگر مولانا شاہ محمد صاحب پر مولانا عبدالعلیم اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے تلمذ سے حنفیت کا رنگ باقی رہا۔ فراغت کے بعد پوری زندگی زہدوقناعت، صبروتوکل، تعلیم وتدریس اور دوسرے علمی ودینی مشاغل میں بسر کی۔ علم وعمل کے امتزاج کا نمونہ تھے۔ قوت لایموت پر پوری زندگی بسر کی۔ بڑے متوکل اور متواضع اورنہایت نیک نفس عالم تھے۔ شرافت وسادگی ان کے چہرے بشرے اور لباس سے نمایاں ہوتی تھی۔ عام طور سے گاڑھے کے کرتے پائجامے میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی کالی شیروانی اور سفید عمامہ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ وہ نیک نفسی میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔

کچھ مدت کے بعد منبع العلوم خیرآباد میں تعلیمی خدمت انجام دی، پھر گھر ہی پر رہے۔ اس سے پہلے آپ نے شیخ الدلائل مولانا عبدالحق مہاجر مکی کی تفسیر ''الاکلیل علی المدارک'' کی طباعت واشاعت اور اس کے مسودات کی ترتیب وتکمیل میں نہایت سلیقہ مندی سے خدمت انجام دی۔ آخری ایام میں اپنے استاذ مولانا عبدالرحمن محدث مبارکپوری کے یہاں زیادہ آتے جاتے تھے۔ اور ''تحفۃ الاحوذی'' کی تبییض کے سلسلے میں جو خدمت کر سکتے تھے کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں میں علمی تعلقات بہت خوش گوار تھے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد ہارون مبارکپوری مشہور عالم تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ تھا، جس میں فقہ، حدیث اور دوسرے علوم وفنون کی اہم کتابیں تھیں۔ اکثر اوقات مطالعہ اور کتب بینی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ عسرت کے باوجود انھوں نے اپنے لڑکوں کو دینی تعلیم دلائی۔ ان کے چھوٹے بھائی حاجی محمد صابر صاحب (متوفی جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ) بھی حافظ نظام الدین صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور بڑے بھائی کی طرح بڑے نیک اور متقی بزرگ تھے۔ مولانا شاہ محمد صاحب نے ۱۳۶۰ھ میں انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سریاں میں دفن ہوئے۔

مولوی نور محمد امام جامع مسجد

مولانا نور محمد بن شیخ جمن امام وخطیب جامع مسجد راجہ شاہ، چودھویں صدی کی ابتداء میں پورہ خواجہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب میں اوپر جا کر ہمارے خاندان سے مل جاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور محلے میں حاصل کر کے عربی اور فارسی کی تعلیم علمائے رسولپور سے حاصل کی۔ اس کے بعد چشمۂ رحمت غازیپور میں مولانا عبدالعلیم رسولپوری صدر مدرس اور دوسرے علماء واساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے سند فراغت لی۔ مولوی حکیم الطاف حسین سکٹھوی اور مولوی نور محمد دونوں صاحبان چشمۂ رحمت میں ہم سبق تھے۔

۲۵رجنوری ۱۹۱۵ء (۱۳۳۴ھ) کو امام جامع مسجد راجہ صاحب حافظ عبداللطیف کا انتقال ہوا تو مولوی نور محمد صاحب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد جامع مسجد ہذا کے مستقل امام وخطیب مقرر کیے گئے اور آخر تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی مدرسہ مصباح العلوم میں فارسی کے مدرّس کی حیثیت سے تعلیمی خدمت بھی کرتے رہے۔ فن تاریخ گوئی کے ماہر تھے، اُردو اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ''سبیل الآخرت'' اور ''مجربات احمدی'' وغیرہ کے آخر میں ان کی منظوم تاریخ درج ہے۔

پرانی وضع قطع کے عالم تھے، بڑے خوش الحان تھے۔ میلاد کی محفلوں میں مثنوی مولانا روم اور قصیدہ بردہ کے اشعار نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ایک زمانے تک وہ ایک جماعت کے سربراہ عالم کی حیثیت سے رہے، مگر کبھی کسی بحث ومباحثہ میں نہیں پڑے اور نہ ہی جھگڑے لڑائی سے دلچسپی لی۔ وہ علمائے رسولپور کے یہاں میاں صاحب نور محمد کے نام سے مشہور تھے۔ چوں کہ ہمارے خاندان سے ان کا تعلق تھا، اس لیے کہ وہ

رشتہ دار کی طرح ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ نانا مرحوم وغیرہ سے تلمذ کی وجہ سے اور بھی آمدورفت رکھتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ آخر وقت میں بڑھاپے کی وجہ سے مدرسہ سے معزول کیے گئے تو ہمارے گھر آئے۔ اتفاق سے نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری تشریف فرما تھے۔ صلاح ٹھہری کہ مولوی نور محمد صاحب مدرسہ احیاء العلوم میں فارسی کے معین مدرّس بنادیے جائیں۔ مولوی صاحب اس پر بالکل آمادہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ نانا مرحوم شکر اللہ صاحب سے گفتگو کی اور مولانا فوراً اس کے لیے تیار ہو گئے کہ وہ ہمارے مدرسہ میں آئیں اور تعلیم دیں۔ ابھی یہ بات چل رہی تھی کہ مدرسہ مصباح العلوم کے ذمہ داروں کو اس بات کا پتہ چل گیا اور انھوں نے مولوی نور محمد صاحب کو مدرسہ میں برائے نام رکھ کر ان کی تنخواہ جاری رکھی۔ یہ باتیں میرے سامنے ہوئی تھیں۔

آخری دَور میں وعظ وتبلیغ کے سلسلے میں جبل پور گئے تھے۔ اسی سفر میں کہیں چڑھتے اترتے گر گئے اور کمر وغیرہ میں کافی چوٹ آئی۔ گھر آنے کے بعد کچھ دنوں بیمار رہے، آخر اسی بیماری میں فوت ہوئے۔ غالبًا ان کی وفات ۱۳۶۰ھ کے حدود میں ہوئی اور بندرہی باغ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولوی رفیع الدین

مولوی رفیع الدین صاحب کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ ۱۳۱۷ھ میں جب مدرسہ احیاء العلوم کا اجرا ہوا تو وہ اس کے محصل مقرر کیے گئے اور مدرسہ کی طرف سے کلکتہ وغیرہ چندہ وصول کرنے جایا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

مولوی رفیع الدین صاحب کا تذکرہ شیخ عبدالمجید بن حافظ عبدالرحمٰن بن عبدالوہاب ساکن محلہ پورہ صوفی نے اپنی ذاتی یادداشت میں ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) کے بلوہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ ہم ان کا پورا بیان درج کرتے ہیں، جو معلومات سے خالی نہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

''۲۹ مئی ۱۹۰۴ء بروز اتوار یہ جو مبارکپور میں بلوہ ہوا عجیب تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کا اشارہ تھا اور چھوٹے لوگوں نے یہ سمجھا کہ سرکاری انتظام کی وجہ سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر لوگ یہ جانتے کہ ہم لوگ جلد بازی میں ظلم کر کے سزا پائیں گے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرتے۔ چک سکٹھی کی زمینداری میں پوکھرے کے پاس باغ کی مسجد میں ایک سرسور کا دیکھا گیا، مسلمان برہم ہو گئے، مگر یہ نہ سوچا کہ یہ فعل کس کا ہے۔ یہ سور کا سر جناب خدابخش ولد فتح قلندر میاں مصطفیٰ آباد کا فعل تھا۔ اس نے ایسی بدعنوانی اس غرض سے کی تھی کہ بابو رام بلی سنگھ گوجر پاروالے سے رنجش تھی۔ اس نے سوچا کہ سور کا سر رکھ کر مبارکپور کے مسلمانوں کو جھادیں گے کہ یہ فعل رام بلی کا ہے۔ اس کے بعد ہم الگ ہو جائیں گے اور رام بلی سے بدلہ بھی مل جائے گا۔ مگر ایسا الٹا ہوا کہ مسلمانانِ مبارکپور اُسی روز ۵ ربجے دن سے گرفتار ہونے لگے، جو گرفتار ہوتا فوراً اعظم گڑھ اس کی چالان ہو جاتی، یہاں تک کہ گولہ بازار میں سوائے عورت کے مسلمان مرد نظر نہیں آتے تھے۔ بڑے بڑے صاحب بہادر ٹھاکر دوارہ میں مقیم تھے، ہر جگہ پولیس تعینات تھی۔ جو لوگ نہیں ملتے تھے، ان کے مکان کی تلاشی ہوتی تھی۔ پورہ دیوان میں مولوی رفیع الدین صاحب کے مکان میں انسپکٹر حلقہ موہن سنگھ، داروغہ دوست محمد خان[1] پولیس کے دس بارہ جوان اور چوکیدار[2] وغیرہ سب زیادہ لوگ داخل ہوئے اور تلاشی لی اور ہمارا قرآن مجید اندر سے آنگن میں پھینک دیا اور موہن سنگھ نے پیر سے مسلا،

۱؎ غالباً بندول کے تھے۔ کلکٹر کے ساتھ گوجر پار ندی کے کنارے گائے کی ہڈیاں وغیرہ دفن کرائیں۔ پھر تنہا نکلوا کر دوسری جگہ چھپا دیا، تا کہ نہ مل سکیں۔

۲؎ راگھو نام تھا۔

ہم لوگ وہاں موجود تھے، یہ دیکھ کر نہایت دل دکھا۔ اس وقت یہاں تھانہ نہیں تھا، چوکی تھی۔ تفصیل قیدیوں کی یہ ہے: (۱) میاں خدا بخش ولد فتح قلندر مصطفیٰ آباد، ڈھائی برس قید سخت اور دو سو روپیہ جرمانہ، انہی کا یہ سب فعل تھا۔ (۲) حاجی عبدالحق ولد والی محمد پورہ رانی، دو برس قید سخت، چار سو روپیہ جرمانہ۔ (۳) عبداللہ ولد میاں جی لال محمد محلّہ پورہ صوفی، دو برس قید سخت، پچاس روپیہ جرمانہ۔ (۴) طبیب ولد حبیب اللہ خونی محلّہ پرانی بستی، دو برس قید سخت، چار سو روپیہ جرمانہ۔ (۵) عبدالحق ولد جان محمد محلّہ شاہ محمد پور، دو برس قید سخت۔ (۶) فرحت حسین موضع املو، تین برس قید سخت، چھ سو روپیہ جرمانہ، قید خانہ میں انتقال کیا۔ کل ۱۹ر آدمی قید ہوئے اور ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۴ء بروز سوموار سزا ہوئی۔ ان ۱۹ر قیدیوں میں سے یہ چند مشہور لوگوں کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ حسین آباد کے چار آدمی عبدالغنی ولد قائم ولد فتح، محمد علی ولد مومن ولد فقیر محمد، عبدالرحمٰن ولد بہادر، امیر علی خان ولد شبراتی ولد بدھو بھی قیدیوں میں تھے"۔

مولانا حافظ عبدالعزیز

ابوالحسن مولانا حافظ عبدالعزیز بن مولانا عبدالسلام بن خان محمد صاحب۔ مولانا عبدالسلام مبارکپوری کی چار اولاد ذکور میں سب سے بڑے اور قدیم الوفاۃ ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور مولانا عبداللہ غازیپوری وغیرہ سے پڑھا تھا۔ اخبار اہلحدیث امرتسر میں مضامین لکھتے تھے اور اپنا نام ابوالحسن عبدالعزیز خلف اکبر مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری لکھتے تھے۔ حافظ قرآن، ذہین وفطین، شیریں بیان،

---

[۱] راقم کے سب سے بڑے والد ۱۵ر رجب ۱۳۵۷ھ میں فوت ہوئے۔ (قاضی اطہر مبارکپوری)

خوش الحان اور پاکیزہ خصلت عالم تھے۔ مشرقی بنگال کے ضلع بوگرا کے مقام کدوان میں مستقل قیام کرتے تھے، کبھی کبھی وطن بھی آتے تھے۔ انھوں نے اخبار اہل حدیث امرتسر میں ''بھیانک آتشزدگی'' کے عنوان سے ایک خبر شائع کی کہ میرے گھر کا سارا اثاثہ اور سامان اور کتب خانہ جل گیا۔ ان میں احقر کے پاس لندن کے مطبع عکسی کی مطبوعہ معریٰ حمائل شریف بھی تھی، جس میں احقر نے حفظ کیا تھا، بہت ضروری گزارش ہے کہ مطبوعہ مطبع عکسی حمائل جہاں سے بھی ہو اور جس طرح بھی دستیاب ہونا ممکن ہو، احقر کو مطلع فرمائیں تو علاوہ واجبی ہدیہ کے مستحق انعام بھی ہوں گے۔ احقر اس کے لیے سخت بیتاب و بیقرار ہے۔ اس پر مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں، میرے پاس ایک حمائل لندن کی ہے، وہ آپ کو تا حصول دیگر مستعار بھیجتا ہوں، خدا آپ کو صبر دے اور آپ کی مدد کرے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بنگال کی بستیوں میں آگ کا لگ جانا ایک معمولی بات ہے، اس لیے کتب خانہ کسی خاص جگہ رکھنا چاہیے۔ اب بجز انا للہ کہنے کے کیا چارہ۔''

ایک مرتبہ اخبار اہلحدیث میں ''یادگار سیدنا نذیر حسین'' کے عنوان سے لکھا کہ مولانا شبلی کا انتقال ہوا اور ان کی یادگار میں دار المصنّفین قائم ہوا ہے۔ مولانا حالی کا انتقال ہوا اور پانی پت میں ایک بڑے پیمانے پر انجمن کا قیام ہوا ہے۔ افسوس کہ مولانا سید نذیر حسین کی یادگار ہم اب تک کوئی قائم نہ کر سکے۔

مولانا مرحوم نے اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ غالبًا اولاد نرینہ نہیں ہے۔ البتہ دختری اولاد میں کچھ افراد بنگال میں موجود ہیں[1]

---

[1] ترجمان دہلی یکم و پندرہ فروری ۱۹۷۳ء۔

مولوی عنایت اللہ

مولوی عنایت اللہ بن حاجی نور محمد بن باب اللہ بن محمد عمر کا خاندان گھبڑا سے آکر مبارکپور میں آباد ہوا۔ غالبًا محمد عمر پہلے آئے تھے، پرانی بستی (کھجواپر) کے رہنے والے تھے، خاندانی دولت مند تھے، زندگی بھر تجارت سے متعلق رہے۔ منشی مہدی علی خاں سے اُردو اور حساب پڑھ کر ابتدائی کتابیں مولوی سلامت اللہ سے گولہ بازار کی مسجد کے مدرسہ میں پڑھیں اور دیوان غنی مولوی ولی محمد عرف مولوی گودا سے پڑھا۔ اور مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں فارسی کی تکمیل کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں مولانا محمد محمود سے میزان سے لے کر شرح جامی ہدایہ، میر قطبی، حمد اللہ، مشکوٰۃ وغیرہ پڑھی۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے جامع ترمذی، مولانا حافظ احمد صاحب سے صحیح مسلم، مولانا شاہ محمد انور صاحب سے سنن ابوداؤد اور مولانا حسین احمد صاحب سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔ اسی دوران میں وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، اس لیے ایک ہفتہ مدرسہ امینیہ میں مولانا کفایت اللہ سے پڑھا اور وطن چلے آئے۔ اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور تجارتی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ مدرسہ احیاء العلوم کے رکن اور جماعتی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ اصابت رائے اور صاف گوئی میں مشہور تھے۔ حفظ و ذہانت کا یہ حال تھا کہ بڑھاپے میں درس اور کتاب کی باتیں کیا کرتے تھے۔ جمعہ ۶/ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ (۲۴/ دسمبر ۱۹۷۱ء) کو فوت ہوئے۔

مولوی حافظ محمد سجاد بمہوریؒ

مولوی حافظ محمد سجاد بن شیخ نجف علی بمہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں حاصل کر کے مدرسہ صدیقیہ جامع الشرق جونپور گئے اور وہاں حافظ محمد صدیق صاحب سے قرآن شریف کا حفظ کیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں بنگلہ والی مسجد نظام الدین دہلی میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ آخر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور گئے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب وغیرہ سے تکمیل کی۔ فراغت کے بعد پوری زندگی گھر پر بسر کی۔ ۱۳۷۵ھ میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ راقم بھی اسی سال اس نعمت سے فیضیاب ہوا تھا۔ اکثر ساتھ رہتا تھا۔ میں نے ان کو بچپن میں پہلی بار اپنے بڑے والد حاجی میاں جی محمد حسین صاحب کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ نماز جمعہ پڑھانے کے لیے بمہور گئے اور ہم چند بچے ان کے ساتھ تھے۔ بمہور کے پورب والے باغ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ بڑے والد نے پوچھا حافظ صاحب کون سی کتاب ہے۔ انھوں نے جواب دیا ''قوت القلوب'' بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مولوی محمد سجاد صاحب تھے۔ حج سے واپس آکر محلے کی مسجد میں بچوں کو دینی تعلیم کا درس دیا کرتے تھے۔ تقریباً پچاسی سال کی عمر میں سہ شنبہ ۹ رجولائی ۱۹۶۸ء (۱۳۸۷ھ) کو بمہور میں فوت ہوئے۔

مولوی رجب علی سکٹھوی

مولوی رجب علی خاں سکٹھی کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ میں رہتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔

مولانا حکیم علی سجاد

مولانا حکیم علی سجاد بن میاں صاحب یار علی، محلّہ شاہ محمد پور کے رہنے والے تھے۔ یہاں کے علمائے شیعہ میں خصوصی مقام کے مالک تھے۔ ان کے والد میاں صاحب یار علی فارسی کے اچھے عالموں میں تھے۔ مولانا علی سجاد کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور کس مدرسہ سے سند فراغ پائی۔ صاحب فہم وفراست اور بڑی سمجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ ان میں اور مولانا شکر اللہ صاحب میں بڑا یارانہ تھا۔ وہ مدرسہ احیاء العلوم میں اکثر آیا کرتے تھے اور قصبہ کے امور ومعاملات میں دونوں حضرات رائے مشورے کیا کرتے تھے۔ اس لیے بعض لوگ مولانا علی سجاد صاحب کو دیوبندی شیعہ کہتے تھے۔ قد ابھرتا ہوا، رنگ سانولا بڑے پائچے کا پائجامہ، کرتا اور دوپلی ٹوپی، ان کا عام لباس تھا۔ شیروانی بھی پہنا کرتے تھے۔ حدود ۱۳۹۰ھ میں انتقال کیا ان کے اور علمائے شیعہ کے اکثر نام اور حالات مولانا فیاض حسین مبارکپوری کے بیان کردہ ہیں۔

مولوی عبدالرحمٰن

مولوی عبدالرحمٰن بن حاجی محمد قاسم، محلّہ پرانی بستی کے رہنے والے تھے۔ مولانا شکر اللہ صاحب اور مولانا نعمت اللہ صاحب کے ساتھ مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود صاحب معروفی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہ ۱۳۱۷ھ کے حدود کی بات ہے۔ نیز اسی زمانے میں مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ نہایت ذکی وذہین طالب علم تھے۔ ان کی ذاتی کتابوں پر ان کے حواشی ہیں، جن سے ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ افسوس کہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ بعد میں ان کی کتابیں مدرسہ احیاء العلوم کے کتب خانے میں داخل کر دی گئیں۔

مولانا غلام رسول

مولانا غلام رسول، ساکن محلہ شاہ محمد پور نے ابتدائی تعلیم مبارکپور اور دوسرے مدارس میں حاصل کی۔ اس کے بعد ناظمیہ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہاں کے اساتذہ سے علوم وفنون کی تکمیل کر کے سند فراغت پائی۔ بعد میں صوبہ بہار کے کسی مقام میں واعظ اور امام جماعت شیعہ مقررہ ہوئے اور وطن میں انتقال کیا۔ علمائے شیعہ میں مشہور عالم تھے اور ان کے خاندان میں علمی سلسلہ جاری ہوا۔

مولانا محمد تقی

مولانا محمد تقی بن مولانا غلام رسول نے علمی گہوارے میں آنکھ کھولی اور اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل کر مبارکپور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد تکمیل کے لیے مدرسہ ناظمیہ کالج لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہیں سے فراغت کی سند پائی۔

مولانا محمد داؤد

مولانا محمد داؤد بن مولانا محمد تقی بن مولانا غلام رسول اپنے علمی خانوادے کی تیسری علمی و دینی کڑی تھے۔ آپ نے بھی ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کر کے جامعہ سلطانیہ لکھنؤ سے صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔

مولانا عبدالرحمٰن زاہد

مولانا حاجی عبدالرحمٰن صاحب زاہدؔ تخلص رکھتے تھے۔ یہاں کے علمائے شیعہ میں نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔

مولوی احمد اللہ املویؒ

مولوی احمداللہ بن محمد اسماعیل بن عبداللہ بن حسام الدین املوی، مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں مدرّس تھے۔ اکثر کتابیں مولانا شاہ محمد سریانوی سے مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں پڑھی تھیں۔ بڑے نیک، متواضع اور سیدھے سادے بزرگ تھے۔ تکمیل نہ کرسکے نہایت خوش خط تھے۔ کئی درسی کتابیں نقل کرکے پڑھتے پڑھاتے تھے۔ شعروشاعری کا بھی نہایت ستھرا ذوق تھا، اُردو اشعار کہتے تھے۔ فارسی کے نہایت اچھے عالم تھے۔ تقریباً سوسال کی عمر میں ۱۹ر فروری ۱۹۶۸ء (۱۳۸۸ھ) میں املو میں انتقال کیا۔

میاں صاحب عبداللہ شفاؔ

شیخ عبداللہ بن شیخ محمد ہاشم محلّہ کٹرا مبارکپور کے باشندے تھے۔ شفاؔ تخلص تھا، میاں صاحب اور میاں صاحب عبداللہ کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اس کے بعد فارسی کی تکمیل مولوی حکیم عبداللہ ساکن پورہ دولہن سے کی۔ فارسی زبان کے مشہور عالم وفاضل اور اُردو ہندی کے نہایت اچھے شاعر تھے۔ صوفی منش بزرگ تھے۔ ہمارے گھر سے ان کے عزیزانہ مراسم تھے۔ وہ اپنے طور طریقہ اور طرز میں مبارکپور میں نرالی شان کے مالک تھے اور ان چند لوگوں میں تھے جو یہاں کے ہونے کے باوجود کسی دوسرے ملک کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ درازی قدوقامت کا یہ حال تھا کہ ان کے پیر کا جوتا عام طور سے نہیں ملتا تھا اور وہ اپنے جوتے بنوایا کرتے تھے۔ رنگ سانولا، بدن پر ڈھیلا ڈھالا گیروا رنگ کا کرتا۔ سر پر کلاہ تتری ہوا کرتی تھی۔ تصوف کا رنگ غالب رہا۔ علم جفر ورمل وغیرہ سے بھی واقف

تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ پوری زندگی کفاف پر بسر کی اور فقیری میں بادشاہی کا لطف پایا۔ انھوں نے زیادہ تر صوفی جان محمد ولید پوری کی متابعت میں ہندی زبان میں اشعار کہے ہیں۔ برہا، بھجن، ٹھمری، دادرا، چیتا، ہولی، بارہ ماسہ وغیرہ اصناف میں ان کے بہت سے اشعار ہیں۔

ابتدائی زمانے میں قصبہ کے ایک مدرسہ میں فارسی کی تعلیم دی، پھر چند سال عظمت گڑھ میں پڑھایا، پھر راجہ صاحب کی مسجد کے پاس اور محلّہ علی نگر مسجد، پھر بوہری مسجد پورہ دیوان میں تعلیم دی۔ مولانا حکیم الٰہی بخش نے ان سے فارسی کی تعلیم پائی۔ طب اور روحانی علاج سے بھی واقف تھے۔ جفر، نجوم، رمل اور تکسیر میں بھی درک رکھتے تھے۔

(۱) ان کی کتابوں میں ''نعت محبوب'' مطبوعہ ہے، جو نعتوں، غزلوں اور ہندی دادروں پر مختصر سا مجموعہ ہے۔ اسے نانا مرحوم مولانا احمد حسین رسولپوری نے ترتیب دے کر اور خود کتابت کر کے اکلیل پریس بہرائچ سے شائع کیا تھا۔

(۲) مجموعہ ہندی میں ٹھمری، کجری، بھجن، دادرا، چیتا، کھمٹا، بارہ ماسہ وغیرہ ہیں۔ یہ بیاض تقریباً دو سو صفحات میں تھی۔

(۳) خلاصۃ الرمل دو جزو میں اسّی صفحات میں ہے۔

(۴) علم الجفر ۲۰ رصفحات کا رسالہ ہے۔

(۵) شفاء اللغات، تصوف کی اصطلاحات میں ہے اسے لغات کی مختلف کتابوں کے حواشی میں لکھا ہے۔ ان کے علاوہ قصائد عرفی، قصائد ظہوری، سکندر نامہ، پنج رقعہ قصائد بدر چاچ، چہار مقالہ وغیرہ پر ان کے حواشی ہیں اور یہ سب غیر مطبوعہ ہیں، جو ضائع ہو چکے یا ہو رہے ہیں۔ ۱۳۶۴ھ میں کٹڑے میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

کوئے جاناں میں گئے چاک گریباں کتنے جان پر کھیل گئے عاشق بے جاں کتنے
لٹ چکے قافلۂ عمرِ گریزاں کتنے پھرتے ہیں خاک بسر بے سروساماں کتنے

لے چلا جب وہ اندھیرے میں پئے قتل مجھے چمک اٹھے ہیں ستارے سرمژگاں کتنے
میں وہ مجنوں ہوں کہ پہنچا جو بیاباں میں کبھی چومے تلووں کو مرے خار مغیلاں کتنے
کفر کے جلوۂ صد رنگ کے احوال نہ پوچھ نقش حیرت بنے بیٹھے ہیں مسلماں کتنے
حسرت وخواہش و امید ویقین وتگ و دو زندگانی کے لئے ہیں مری عنواں کتنے
فیض اشرف سے شفاؔء نے کہے اشعار ایسے
دیکھ کر رہ گئے انگشت بدنداں کتنے[1]

منشی قمرالزماں زماںؔ

منشی قمرالزماں صاحب زماںؔ مبارکپوری محلّہ پورہ رانی کے رہنے والے تھے۔ مبارکپور کے شعراء میں دورِ قدیم کے اساتذہ میں تھے۔منشی حبیب اللہ صاحب حبیبؔ ساکن کٹرا مبارکپور سے شرف تلمذرکھتے تھےاوران کی نظر نے زماںؔ کوزماں بنادیا۔جس کا اعتراف خودان کوہےاورفخریہ انداز میں اپنے اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے:

کچھ اگر ہے تو فقط ہے اثر فیض حبیب ورنہ اشعار زماں کے کوئی اشعار نہیں
اٹھ گیاجب سے مرےسر سے زماں ظل حبیب شعر گوئی کا مزہ کچھ نہیں ملتا مجھ کو

ایک جگہ بغیر نام لیے اپنے استاذ کواہل ہنر بتا کران سے سبق لینے کی تلقین کی ہے:

زماںؔ منظور ہے گر شعر گوئی
سبق حاصل کرو اہل ہنر سے

ہماری طالب علمی کے زمانے میں شعر وسخن کے تین معمر اساتذہ تھے۔ میاں صاحب عبداللہ شفاؔ، میاں صاحب عبدالکریم عاشق اورمنشی محمد زماں صاحب زماںؔ، شفاؔ صوفی منش آدمی تھے۔اُردو ہندی کے اچھے شاعر تھے۔عاشق نعت گوئی اورغزل میں

[1] نمودِ سحر۔ص:۱۴۔۱۵۔۱۶۔۱۷۔۱۸۔۱۹۔۲۰ و ص:۲۳۔

خاص درجہ رکھتے تھے اور زمانؔ گویا غزل کے بادشاہ تھے۔ ان تینوں کے دم قدم سے شعر وادب کا چرچا تھا اور ہر ایک کا اپنا حلقۂ تلامذہ تھا۔ مشاعروں میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

چوں کہ منشی حبیب اللہ سرکاری ملازم تھے اور اکثر باہر رہتے تھے۔ اس لیے زمانؔ نے نوحؔ ناروی کو کلام دکھانا چاہا اور دو غزلیں ان کو روانہ کیں۔ مگر نوحؔ ناروی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا اور حسب سابق منشی حبیب اللہ صاحب ہی سے مشورۂ سخن لیتے رہے۔

منشی محمد زمانؔ ان سب میں چھوٹے تھے۔ سیدھے سادے، دبلے پتلے آدمی تھے۔ ان کو دیکھ کر ان کی شاعری کا اعتبار نہیں ہوتا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ قدیم رنگ تغزل کے نمائندے تھے۔ ان کی سادگی میں بڑی رنگینی تھی۔ زبان اور محاورے کا برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان پر داغؔ کا رنگ غالب تھا۔ ''انتخاب دیوان زماں'' کے نام سے ان کا ایک مختصر سا مجموعۂ کلام سلیمانی پریس بنارس سے چھپ کر شائع ہوا تھا، جس میں دو نعت اور ۳۴ / یا ۳۵ / غزلیں ہیں۔ گویا زمانؔ مبارکپور کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا اور قصبہ اور باہر کے شعراء ان سے اصلاح ومشورہ لیتے تھے۔

معمولی زندگی بسر کرتے تھے، غالبًا انھوں نے زندگی بھر خوشحالی نہیں دیکھی۔ ۱۳۷۲ھ میں جب کہ بڑھاپا چھا چکا تھا، تلاشِ معاش میں بمبئی آئے تھے۔ اسی زمانے میں راقم کو اپنی تازہ غزل دی، جو شاید ان کی آخری غزل تھی۔ اسے میں نے اخبار ''انقلاب'' میں شائع کیا تھا۔ پوری غزل ان کی قنوطیت کی ترجمانی تھی۔ ''بسائی گئی دنیا'' ''لبھائی گئی دنیا'' قافیہ وردیف تھے۔ وہ ملازمت کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے، اس لیے کچھ دنوں کے بعد وطن واپس ہو گئے اور وہیں ۱۳۷۲ھ یا ۱۳۷۳ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے زائد رہی ہوگی۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

رنج اچھا ہے ہمیں اور نہ راحت اچھی — آپ جس حال میں مل جائیں وہ حالت اچھی
دل گیا، چین گیا، صبر گیا، ہوش گیا — آپ نے مجھ پہ یہ کی چشم عنایت اچھی
تاک میں ہے فلکِ پیر خدا خیر کرے — نظر آتی نہیں کم بخت کی نیت اچھی
لن ترانی نے سرِ طور یہ عقدہ کھولا — بڑی مشکل سے نظر آتی ہے صورت اچھی
تم جو آجاؤ یقیں ہے کہ سنبھل جائے گا — ورنہ بیمار الم کی نہیں حالت اچھی
شیخ کے سامنے قرآں ہے ہمارے نزدیک — مصحفِ روئے صنم کی ہے تلاوت اچھی

کرلیا سحر بیانی سے مسخر سب کو
اے زماںؔ تونے دکھائی یہ کرامت اچھی[1]

میاں صاحب عبدالکریم عاشق

میاں صاحب عبدالکریم عاشق، ساکن محلّہ پورہ خواجہ مبارکپور کے باشندے تھے۔ یہاں کے قدیم شعراء میں خاص مقام رکھتے تھے۔ میاں صاحب عبداللہ شفا کے معاصر تھے۔ ہم نے اپنی جوانی میں ان کو دیکھا ہے۔ نہایت نیک طینت، شریف الطبع اور سیدھے سادے بزرگ تھے۔ یہاں کے مشاعروں میں ہمیشہ شریک ہوتے تھے۔ ان کی بزرگی اور فن کے سب لوگ معترف تھے۔ غزل ان کا خاص موضوع تھا، مگر کلام میں نعت رسول کا رنگ نمایاں ہوتا تھا اور نعت گوئی میں قصبہ کے شعراء میں مشہور تھے۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ایک بار یہ بسلسلۂ تجارت مرآباد گئے اور ہم لوگوں نے ان کے اعزاز میں ایک مختصر سی مجلس مشاعرہ منعقد کی، جس میں کئی نعتیں سنائیں اور خوب خوب داد پائی۔ ان کو دیکھ کر ان کے شاعر ہونے کا یقین نہ ہوتا تھا، مگر جب کلام سناتے تو مشاعرے پر چھا جاتے تھے نمونۂ کلام یہ ہے:

---

[1] نمودِ سحر۔ ص:۲۳ تا ۲۸ و ص:۳۷ تا ۴۰۔

مست ہوں بادۂ توحید کے پیمانے کا ۔۔۔ فیض ہے ساقی کونین کے میخانے کا
کھول دے گا درِ فردوس یہ کہہ کر رضواں ۔۔۔ مست آیا مئے توحید کے پیمانے کا
آج للہ تو اے بادِ صبا وعدہ کر ۔۔۔ خوشبوئے گیسوئے محبوب اڑالانے کا
اے جنوں وادیِ طیبہ میں خدارا لے چل ۔۔۔ دل بہلتا ہے وہیں آپ کے دیوانے کا
باغ عالم تو ہے شاداب مگر اے عاشق!
آج جو گل ہے کھلا کل نہیں رہ جانے کا

مولانا محمد اسماعیل اصلاحی

مولانا محمد اسماعیل بن شیخ محمد حسین اصلاحی، محلّہ کٹرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا آبائی مکان محلّہ علی نگر میں تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر گئے۔ مولانا حمید الدین فراہی اور دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر سند فراغت پائی۔ اس کے بعد رنگون تشریف لے گئے، جہاں ایک مدت تک دینی و علمی خدمت انجام دیتے رہے۔ چند سال تک قصبہ لار ضلع دیوریا کے ایک مدرسہ میں پڑھایا اور آخر میں سوراشٹر کے مشہور ضلع دھوراجی کے مقام بگیسرا بھائیاں کے ایک اسکول میں اُردو اور دینیات کے مدرّس ہوئے اور ایک زمانے تک یہاں رہ کر اصلاحی، تعلیمی اور تبلیغی خدمات انجام دیں اور وہاں کے خواص وعوام میں بڑا اثر ورسوخ پیدا کیا۔ آخر میں علاقہ سوراشٹر میں ایک عظیم الشان دینی درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے فضا بھی ہموار کر لی، مگر اس سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

آخری دَور میں ہم لوگوں سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ قد میانہ، جسم فربہ، رنگ سیاہ اور آواز بھاری بھر کم تھی۔ نہایت خوش اخلاق اور کریم النفس عالم تھے۔ ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں کٹرے میں انتقال کیا ان کی اولاد کراچی میں موجود ہے۔

مولوی حکیم محمد یٰسین نوادوی

مولوی حکیم محمد یٰسین بن حاجی محمد صدیق بن حاجی محمد اکبر، ساکن نوادہ نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے میں حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں مولانا نعمت اللہ اور مولانا شکراللہ وغیرہ سے پڑھا۔ اس کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں تعلیم حاصل کی۔ آخر میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب وحکمت کی مکمل تعلیم حاصل کی اور فراغت کے بعد نوادہ میں مطب جاری کیا اور تاحیات اسی مشغلے سے متعلق رہے۔ نہایت خوش اخلاق، ملنسار اور بامروت حکیم تھے۔ ۱۳۶۴ھ کے حدود میں نوادہ میں فوت ہوئے۔

استاذ الشعراء مولوی علیم اللہ خیالؔی مبارکپوری برہانپوریؒ

مولوی منشی علیم اللہ صاحب خیالؔی مبارکپوری برہانپوری کا آبائی مکان ارجنٹی کے پورب لال چوک کے پاس تھا۔ ان کے والد نے ۱۲۸۵ھ میں یہاں سے ترکِ وطن کر کے الہ آباد میں اقامت اختیار کی۔ پھر وہاں سے برہانپور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خیالؔی کا تذکرہ دو کتابوں میں ہے، ''خم خانۂ جاوید'' مصنفہ لالہ سری رام دہلوی میں، جو بہت مختصر ہے اور ''سلک گہر'' مصنفہ جاوید انصاری برہانپوری میں جو مفصل ہے۔

''خم خانۂ جاوید'' میں ہے کہ منشی علیم اللہ صاحب خیالؔی مبارکپوری شاگرد ہنر غازیپوری ۱۹۰۲ء کے ''نسیم دکن'' سے کلام منتخب ہوا۔ معمولی کہنے والوں میں سے ہیں، چند اشعار ان کے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں، اس کے بعد سات اشعار درج ہیں، جن میں تین اشعار ایک غزل کے ہیں دو اشعار دوسری غزل کے ہیں اور ایک شعر کسی

اور غزل کا ہے[1] یہ تذکرہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے، جب خیاؔلی کے کلام میں پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور نہ ان کی شاعری کی شہرت عام ہوئی تھی۔ البتہ سلک گہر میں ان کا تذکرہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے اور ان کے وطن میں ان کے حلقہ شعروادب کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

محمد علیم اللہ صاحب خیاؔلی مرحوم برہانپور کے مایۂ ناز شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا آبائی وطن مبارکپور ضلع اعظم گڑھ ہے، مگر موصوف کی ولادت الہ آباد میں ہوئی، آپ کی پیدائش کا سال ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) ہے۔ الہ آباد میں والدین کے زیر سایہ آٹھ سال تک پرورش پائی۔ نو سال کی عمر میں ان کے ہمراہ برہانپور تشریف لائے اور اس شہر کو مستقل وطن بنالیا۔ کتب صرف ونحو، فارسی وعربی کی تعلیم مولوی حافظ محمد فیض اللہ صاحب برہانپوری سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ اخلاق وآداب، نظم ونثر اور انشاء کی کتابیں بھی مولانائے موصوف سے پڑھیں۔ علم منطق اور فلسفہ بھی حاصل کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں شعروسخن کی طرف رجوع ہوئے۔ اپنے فاضل استاذ مولانا فیض اللہ صاحب کے مشورے سے اپنا کلام ابوالکلام سید ذاکرحسین صاحب ہنرؔ غازیپوری کو اصلاح کے لیے بھیجا۔ ہنرؔ صاحب آفتاب الدولہ نواب ارشد علی خاں بہادر قلقؔ لکھنوی کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ ہنرؔ صاحب کے فیضِ تربیت اور اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بنا پر بہت کم عرصے میں فن شعروادب پر کامل عبور حاصل کرلیا۔ ۱۹۱۳ء (۱۳۳۲ھ) میں جب حضرت ہنرؔ غازیپوری برہانپور تشریف لائے تو ایک عظیم الشان مشاعرے میں حضرت خیاؔلی کو شرف جانشینی سے سرفراز فرمایا۔ ۱۹۱۶ء (۱۳۳۵ھ) تک قدیم رنگِ تغزل کی تقلید کرتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں طبیعت کا رجحان بدلا، مجموعۂ غزلیات تلف کردیا۔ جو حصہ موصوف کی غزلیات کا محفوظ رہ سکا، اس کے مطالعہ سے موصوف کے رنگِ تغزل کا اندازہ ہوتا ہے۔ نہایت سلیس اور سادہ بیان میں نازک تشبیہات اور لطیف استعارات کے ساتھ

---

[1] خم خانۂ جاوید۔ ج:۳۔ ص:۹۹۔

مؤثر پیرائے میں خیالات کو نظم کرتے تھے۔ اپنی شاعری کے دوسرے دور میں واقعہ نگاری، اصلاحی، اخلاقی، قومی اور فلسفیانہ مضامین دلکش اور مؤثر انداز میں با محاورہ زبان میں نظم کرتے تھے۔

خیالؔی مرحوم نے ۱۹۳۷ء (۱۳۵۶ھ) میں خواجہ احمد حسین شاہ صاحب امروہوی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں شرفِ بیعت حاصل کیا، جس کی وجہ سے آپ کے کلام پر رنگ تصوف غالب ہوگیا۔ ۱۹۳۹ء (۱۳۵۸ھ) میں خواجہ احمد حسین شاہ صاحب نے حضرت خیالؔی کے اتقاء اور زہد سے متاثر ہوکر اپنے سلسلے کے حق خلافت سے مشرف فرمایا۔ آپ صوفی مسلک اور ہر دلعزیز تھے۔

موصوف کی اُردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ صوبۂ متوسط کے قابل فخر اساتذہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ وسط ہند اور دکن کے بڑے بڑے مشاعروں، ادبی اور سیاسی جلسوں میں مدعو کیے گئے، جہاں مشاہیر اہل فن سے تبادلۂ خیالات کے مواقع ملتے رہے۔ تحت اللفظ نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں پڑھتے تھے۔ برہانپور، خاندیس، بمبئی، برار اور دکن میں موصوف کے صدہا تلامذہ ہیں۔

خیالؔی مرحوم ایک کامیاب مقرر بھی تھے۔ اکثر سیاسی جلسوں میں آپ کی مدلل اور جامع تقریروں سے سکوت طاری ہوجاتا تھا۔ تحریک خلافت کے دَور میں موصوف کی سیاسی خدمات یادگار ہیں۔ آپ کی سیاسی نظموں کا مختصر مجموعہ ''دَورِ جدید'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ موصوف کو نام و نمود اور شہرت پسندی سے گریز تھا۔ اسی وجہ سے کلام تشنۂ اشاعت رہا اور ہندوستان کا ادبی طبقہ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا صلہ نہ دے سکا۔ خیالؔی صاحب نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ موصوف کے مقامی شاگردوں میں ہلالؔی، رضؔی، فہمؔی، شرؔر، حیرتؔ، فاضؔل، فلسفؔی، ذکؔی، ناظؔر، مضطؔر اور شوکتؔ وغیرہ اصحاب خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے برادر خورد اور جانشین حشمت اللہ صاحب ریاضؔی بھی برہانپور میں ممتاز ہیں۔

۳۰؍ دسمبر ۱۹۴۴ء مطابق ۱۳؍ محرم ۱۳۶۴ھ کو ۴؍ بجے بزم شعرائے قدیم کی آخری شمع صرصرِ اجل سے خاموش ہوگئی۔ مرحوم کے دو فرزند کلیم اللہ اور حکیم اللہ تھے۔ خیالی صاحب کا کلیاتِ نظم شائع نہ ہوسکا، ورنہ موصوف کا مجموعۂ کلام اُردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوتا[1] اس کے بعد خیالی مرحوم کا نمونۂ کلام جو ہر صنف سخن میں شامل ہے، ص ۱۹۰؍ سے ۲۰۳؍ تک درج ہے۔

مولوی منشی غلام حسین عاشق مبارکپوری

مولوی منشی غلام حسین بن مولوی غلام عباس مبارکپوری اپنے والد کے ساتھ سمبھی ضلع اعظم گڑھ میں رہتے تھے۔ شاعری میں انھیں کے شاگرد تھے۔ ''خم خانۂ جاوید'' لالہ سری رام دہلوی میں ان کا تذکرہ یوں درج ہے۔ عاشق منشی غلام حسین صاحب خلف اکبر و شاگرد مولوی غلام عباس صاحب متوطن سمبھی ضلع اعظم گڑھ۔ انھوں نے اپنے والد سے فارسی کی تحصیل کی۔ فن سخن میں بھی ان ہی سے استفادہ کیا ہے۔ شاعری کا اوائل عمر سے شوق ہے۔ متعدد رسالوں اور گلدستوں میں کلام شائع ہو چکا ہے۔ ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ شعر کو سمجھ کے کہتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔ اب کچھ معلوم نہیں۔ کلام یہ ہے:

نہیں گردوں پہ یہ مہِ تاباں ۔۔۔ عکس ہے اس کے روئے انور کا
چشم بینا کے واسطے عاشق ۔۔۔ ایک رتبہ ہے سنگ وگوہر کا

کل تو آنکھیں نہ لگیں شام سے تا صبح مری ۔۔۔ آج کیا حال کرے گی شب ہجراں میرا

عجب انداز سے اس سنگدل نے اسکو توڑا تھا ۔۔۔ کہ نکلی شیشۂ دل سے صدائے آفریں برسوں
تہِ دامِ بلا دونوں رہے گیسو کی الفت میں ۔۔۔ مری جانِ حزیں برسوں دلِ اندوہ گیں برسوں

---

[1] سلک گہر۔ ج:۱۔ص:۱۸۷تا ص:۱۹۰۔

رحمت حق سے تو محروم رہے گا واعظ   بخشے جاتے ہیں وہی جو کہ خطا کرتے ہیں

ابھی سے حشر کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں میں
ہماری شامِ غم صبح قیامت ہونے والی ہے[1]

حضرت مولانا محمد شعیب رسولپوریؒ

حضرت مولانا حکیم مفتی محمد شعیب بن عبدالعلیم بن شیخ باب اللہ رسولپوریؒ ۱۳۰۹ھ میں رسولپور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ علم وفضل کے گہوارے میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور گئے، جہاں آپ کے والد ماجد مولانا عبدالعلیم رسولپوری، مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ رامپور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی سے معقولات، فلسفہ، منطق، ریاضی، فقہ اور اصول فقہ، مولانا محمد طیب عرب مکی سے تفسیر عربی، ادب ومعانی وبیان، مولانا منور علی محدث رامپوری سے فقہ واصول فقہ، بقیہ کتب احادیث اور مولانا حافظ وزیر احمد رامپوری سے بقیہ کتب ادب ومعانی وبیان اور مولانا محمد امین کابلی سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا نے ان ہی دونوں درسگاہوں میں پوری تعلیم پا کر مدرسہ عالیہ سے سند فراغت پائی۔

اس وقت ان کے والد مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کے مدرّسِ اعلیٰ اور شہر مفتی اعظم تھے۔ مولانا بھی اسی درسگاہ سے منسلک ہو کر تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۳۴۰ھ میں ان کے والد غازیپور اور بنارس کے درمیان ریل کے حادثے میں شہید ہو گئے تو بیٹے نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ اس کے بعد ۱۳۵۸ھ تک مدرسہ

[1] خم خانۂ جاوید۔ ج: ۵۔ ص: ۵۲۵و۵۲۶۔

کے پرنسپل اور صدر مدرّس اور شہر مفتی اعظم رہے۔ مشرقی دیار کی جس مشہور درسگاہ میں مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبداللہ مئوی غازیپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور مولانا عبدالعلیم رسولپوری جیسے اساطین علم وفن اور سرآمدگان روزگار نے اپنے اپنے وقت میں علمی ودینی غلغلہ پیدا کیا تھا، اسی میں مولانا محمد شعیب صاحب نے بھی پینتالیس سال تک مدرّسی، صدر مدرّسی اور مفتی شہر کے مناصب پررہ کرزیادہ سے زیادہ خدمت کی۔

اس مدت میں ہزاروں طلبہ نے ان سے فیض پایا اور سینکڑوں علماء ان کی محفل درس سے پیدا ہوئے۔ جن میں مولانا مفتی عبدالقادر فرنگی محلی، مولانا عبیداللہ بلیاوی (تبلیغی جماعت) مولانا محمد حسن صدیقی رحمتی غازیپوری، مولانا ابوالوفا فصیحی غازیپوری، مولانا جمیل احمد رحمتی، مولانا حافظ شمس الہدیٰ رحمتی، مولانا شیخ محمد رحمتی غازیپوری، کلیم غازیپوری، خاموش غازیپوری، مولانا ہارون رشید رہبر صدیقی دربھنگوی جیسے مشاہیر علم وفن شامل ہیں۔ ان کے علاوہ یوپی، بہار اور بنگال وغیرہ کے صدہا طلبہ نے آپ سے کسب فیض کیا ہے۔ فقہ حنفی اور افتاء میں تبحر اپنے والد سے وراثت میں پایا تھا۔ فقہی جزئیات پر نظر بڑی وسیع تھی۔ ہر علم وفن کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ مدرسہ کے علاوہ اپنی قیام گاہ پر صبح وشام طلبہ کو حدیث اور تفسیر کا درس دیتے تھے۔ رات کو عموماً ایک بجے تک مطالعہ اور فتویٰ نویسی میں مصروف رہتے تھے۔ دنیاوی معاملات سے یکسو تھے۔ سیاسیات سے دور کا واسطہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ ہمہ تن علم وعمل اور زہد وتقویٰ تھے۔

ہر مکتب اور ہر خیال کے علماء اور عوام ان سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے اور وہ سب کے ساتھ اخلاق کریمانہ سے پیش آتے تھے۔ مہمان نوازی اور دروازے پر آنے والوں کی خاطر ومدارات خاندانی روایات کے مطابق غازیپور میں بھی کرتے تھے۔ اکثر ان کے یہاں کوئی نہ کوئی مہمان رہتا تھا۔ پچاس سال تک غازیپور میں مخدوم کی حیثیت سے رہے، مگر اپنے کو خادم بنا کر رکھا۔ مولانا کو اپنے علم پر بڑا اعتماد تھا، مگر کسی

کے سامنے اپنی بڑائی نہیں ظاہر کرتے تھے۔ مجھ جیسے اپنے چھوٹے عزیز کو خط لکھتے تو آپ سے خطاب کرتے اور پورے خط سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی بڑے اور محترم کو خط لکھ رہے ہیں۔

ان کا وعظ بہت ہی دل نشین اور سلف صالحین کے انداز کا ہوتا تھا۔ ادبیت ولفاظی کے تکلفات سے دور رہ کر سیدھا سادا وعظ فرماتے تھے۔ میں نے بچپن میں ان کا وعظ جامع مسجد راجہ صاحب میں سنا ہے، جس میں سورۂ ''الھٰکم التکاثر'' کی تفسیر بیان کی تھی اور دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی تیاری پر تقریباً دو گھنٹے تک وعظ بیان کیا تھا۔ طب وحکمت ان کے گھر کا فن تھا۔ طبابت بھی کرتے تھے۔ عموماً صبح کو مریضوں کو دیکھا کرتے تھے۔ وضعداری، سادگی اور تواضع وانکساری میں اپنے خاندان میں سب سے جدا تھے۔ اس وقت ان کو دیکھ کر کوئی شخص ان کو عالم نہیں سمجھ سکتا تھا۔

ان کی کسی مستقل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ فتاوے کئی ہزار کی تعداد میں لکھے ہیں۔ اگر ان کو مرتب کر کے شائع کیا جائے تو کئی جلدوں میں دینی اور فقہی معلومات کا بیش بہا اور مستند ذخیرہ بن سکتا ہے۔ آخر زمانہ میں غازیپور میں زیادہ رہنے لگے تھے۔ گھر پر تشریف لاتے تو مدرسہ کی ضروریات کی وجہ سے جلد ہی واپس چلے جاتے تھے۔ ضعف وکمزوری کا دَور تھا، مگر مدرسہ کی فکر میں گھر پر چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ آخری بار شروع شعبان ۱۳۸۵ھ میں گھر آئے تھے اور چند دن بال بچوں میں رہ کر واپس ہونے کا ارادہ کرر ہے تھے، جس دن صبح کو غازیپور جانے والے تھے، دو چار دست آئے اور دس بجے دن میں انتقال فرما گئے۔ چند گھنٹہ بیمار رہے اور یک شنبہ ۱۸؍شعبان ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۲؍دسمبر ۱۹۶۵ء کو فوت ہو گئے اور اسی دن آبائی قبرستان میں اپنے چچا مولانا احمد حسین صاحب کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا عبدالباقی رسولپوریؒ

حضرت مولانا عبدالباقی بن مولانا عبدالعلیم بن شیخ باب اللہ رسولپوری مبارکپوری، ۱۳۰۰ھ کے حدود میں رسولپور میں پیدا ہوئے۔ غالبًا اپنے والد کی آخری اولاد تھے۔ گھر کا ماحول دینی وعلمی تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر اور محلّہ میں حاصل کر کے مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں داخل ہوئے، جہاں آپ کے والد ماجد مدرّس ومفتی تھے۔ اپنے والد کے علاوہ مدرسہ کے دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ مشکوٰۃ شریف کے چند اسباق مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے بھی پڑھے، جو اُن دنوں مدرسہ چشمۂ رحمت کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ اس کے بعد عربی کی تعلیم بند کر کے انگریزی تعلیم حاصل کی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے عربی میں ایم.اے. کر کے وہیں عربی کے پروفیسر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد ایل.ایل.بی. کی ڈگری حاصل کی اور اعظم گڑھ ججی میں وکالت شروع کی، جو آخری دم تک جاری رہی۔ عربی ادب میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ فقہ وفتویٰ اور تفسیر میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ وکالت کے پیشہ کے ساتھ مولویت اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ باقی رکھی۔ تفسیر وفقہ کا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھتے تھے۔ فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے۔ سادگی حد سے زیادہ ہی تھی۔ خورد ونوش، لباس اور رہنے سہنے میں انتہائی بے تکلفی اور سادگی تھی۔ اسی کے ساتھ رفاہی اور دینی کاموں میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ان کا احترام سرکاری حکام اور وکلاء تک کرتے تھے۔ کچہری کی مسجد کے امام تھے۔ شہر اعظم گڑھ میں متعدد مساجد کی مرمت وتوسیع کرائی۔ مسلم مسافر خانہ کی تعمیر میں مزید بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مبارکپور انٹر کالج ان ہی کی توجہ سے جاری ہوا اور آخر تک اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ مدرسۃ الرشاد اعظم گڑھ کے طلبہ کو اپنے گھر بلا کر ہدایہ کی تعلیم دیتے تھے۔ اعظم گڑھ ہوں یا رسولپور ہر وقت کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے۔

ان کی مجلس خالص علمی اور دینی ہوتی تھی۔

تذکرۂ علمائے مبارکپور کے لیے بیش بہا معلومات فراہم کیں۔ راقم الحروف کے ماموں ہوتے تھے اور بہت زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ وکالت کے پیشہ کے بعد زندگی بھر فقیرانہ زندگی بسر کی اور جو کچھ ملا خود روکھی پھیکی زندگی بسر کر کے خاندان کے طلبہ پر خرچ کیا۔ علمی و دینی معاملات میں ہمیشہ تحقیق و تدقیق میں لگے رہتے تھے۔

''ریّا الرضب شرح لامیۃ العرب'' کے نام سے عربی زبان میں مشہور جاہلی شاعر شنفریٰ کے قصیدہ لامیہ کی شرح لکھی۔ جو اُن کے ادبِ عربی کے اعلیٰ ذوق کا نمونہ ہے۔ یہ شرح ۱۳۲۸ھ میں لکھی اور ۱۳۳۱ء میں اکلیل پریس رسڑا میں ۲۶ ر صفحات پر چھپی ہے۔ تقریباً ۷۰ ر اشعار کی شرح ہے۔ پہلے حل لغات ہے پھر عربی میں ترجمہ ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہے:

''الحمد الله المنعم الناهر، الهادی الفاخر، القادر القاهر، العام نعمائه كل بَرّوفاجر، الشامل رحمته كل شاكر وكافر، والصلوٰة على الصفی الطاهر، المسك الذاخر، نبيه المنذر الخابر عن خطيرة القدس والهنابر، محمد كابر عن كابر، وعلىٰ اٰله اصحابه ، المقيمی راس الحائر البائر، النجوم للناظر، اما بعد فيقول العائذ بالله تعالىٰ عبدالباقی الاعظمی المباركفوری ابن العلامة الجموم الذی لاتكدر العلاء، والخضم الذی لايشينه جزر الماء والحبر البارع والزكی القارع مولانا ابی الامجد محمد عبدالعليم ابقاه الله واجزل عليه نعمائه هذا شرح موجز علىٰ لامية شمس بن مالك الملقب

بالشنفری، حثنی علیه متواردها فلم آل فی تسهیلها
وضربت صفحاً عمالا یجدی وسمیته ریا الرضب
شرح لامیة العرب''۔

آخر میں یہ عبارت ہے:

''قال مؤلفه فرغت من هذا الشرح فی سنة
الف وثلث مأته وثمانی وعشرین من الهجرة''۔

اس قصیدہ کی ابتدا اس شعر سے ہے:

اقیموا بنی امی صدور مطیکم
فانی الی قوم سواکم لامیل

۴؍رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۱؍اگست ۱۹۷۶ء کو ساڑھے آٹھ بجے دن میں اعظم گڑھ اپنے مکان میں انتقال کیا اور ۴؍بجے دن میں اپنے وطن رسولپور کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اس دن راقم اعظم گڑھ گیا تھا۔ پہنچنے پر انتقال کی خبر ملی اور مکان پر گیا، پھر رسولپور میں جنازہ اور تدفین میں شریک رہا۔

حضرت مولانا عبدالصمد حسین آبادی

حضرت مولانا عبدالصمد بن شیخ محمد اکبر بن شیخ محمد علی بن شیخ مومن بن شیخ فقیر اللہ، رمضان ۱۳۲۲ھ میں حسین آباد میں پیدا ہوئے۔ جو مبارکپور کے شمال میں ایک میل پر مسلمانوں کی مشہور بستی ہے۔ ایامِ طفولیت میں قرآن مجید اپنے دادا شیخ محمد علی سے پڑھنا شروع کیا۔ دو تین پارے پڑھے ہوں گے کہ شیخ محمد علی کو کسی معاملہ میں جیل بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد مولوی احمد علی برادر خرد مولانا عبدالسلام مبارکپوری سے پڑھ کر قرآن ختم کیا۔ نیز اُردو اور فارسی کی تعلیم ان سے حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم میں داخل ہوئے اور

مولانا حکیم محمد اصغر صاحب سے فارسی کی تکمیل کی اور ان ہی سے فصولِ اکبری، شرح تہذیب اور شرح جامی وغیرہ پڑھیں اور مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری سے شرح وقایہ جلد اوّل، بلوغ المرام، مشکوٰۃ، جلالین، پارہ اوّل، سراجی اور قطبی کی تعلیم حاصل کر کے مدرسہ عالیہ مئو میں مولانا عبدالسلام مبارکپوری سے جلالین، شرح وقایہ جلد ثانی، نفحۃ الیمن، شرح نخبۃ الفکر، میر قطبی پڑھی اور ۱۳۳۸ھ میں مدرسہ حضرت میاں صاحب پھاٹک حبش خاں دہلی میں مولانا شرف الدین دہلوی سے مختصر المعانی، دیوان متنبّی، میر زاہد، ملا جلال، ملاحسن، ترمذی شریف، نسائی شریف وغیرہ پڑھی۔ اس درمیان میں سیالکوٹ میں مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور دیگر اساتذہ سے ملاحسن، مختصر المعانی، میبذی اور مقامات حریری وغیرہ پڑھا، مگر سیالکوٹ میں صرف دو تین ماہ قیام رہا اور وہاں سے دہلی آ کر مولانا شرف الدین صاحب سے ان کتابوں کی تکمیل کی۔

تحصیل و تکمیل کے بعد تعلیم و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور مدرسہ اسلامیہ برڈا (بہار) مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور، مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ اور مدرسہ محمدیہ دیوریا میں مدتوں تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری نزول الماء کی بیماری کی وجہ سے ''تحفۃ الاحوذی'' کی آخری دونوں جلدوں کی تبییض نہیں فرما سکے تھے۔ اس لیے اہل علم کی ایک جماعت کو اس کام میں شریک کیا۔ جس میں مولانا عبدالصمد صاحب اپنے ذوق و شوق اور علم و استعداد کے اعتبار سے نمایاں تھے۔ چناں چہ مسلسل تین سال تک مولانا موصوف کی خدمت میں رہ کر ان کی نگرانی میں یہ خدمت انجام دی۔ جس کی وجہ سے ان کو احادیث و رجال میں اچھی خاصی نظر پیدا ہوگئی اور علمی اور تحقیقی میدان میں کام کا سلیقہ آ گیا۔

مولانا نہایت ذی استعداد عالم و مدرّس تھے۔ نیکی و شرافت کا نمونہ اور حلم و صبر کا مجسمہ تھے۔ ان کی زندگی سلف صالحین کا پرتو معلوم ہوتی تھی۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے بینائی کمزور ہوگئی تھی، مگر مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں لگے رہتے تھے۔ وہ کامیاب

مصنف ومؤلف، نہایت اچھے مضمون نگار اور انشاء پرداز تھے۔ مختلف جرائد ومجلّات میں ان کے علمی وتحقیقی مضامین ومقالات شائع ہوتے تھے، جن کو جمع کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب بن سکتی ہے۔ مولانا مبارکپور کے علمائے مصنفین میں سے تھے اور تصنیف وتالیف کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے ذوقِ تصنیف اور حدیث ورجال میں وقت نظر کی شہادت کے لیے یہی کافی ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کے وصال کے بعد مقدمہ تحفۃ الاحوذی کی منتشر یادداشتوں اور نامکمل مباحث کے ابواب وفصول کو مولانا نے مکمل کیا اور اس اہم کتاب کو نہایت سلیقہ مندی اور علمی تحقیق وکاوش سے یوں مرتب ومدون کیا کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہوگئی۔

مولانا نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے اکثر افسوس کہ شائع نہ ہوسکیں۔

ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ''تائید حدیث بجواب تنقید حدیث'':۔ یہ کتاب مولوی اسلم جیراجپوری منکر حدیث کی تلبیسات وفتن کے رد میں ہے۔

(۲) ''شرف حدیث'':۔ اس کتاب میں بھی مولوی اسلم جیراجپوری منکر حدیث کے ان مضامین کا رد ہے جو ''طلوعِ اسلام'' نامی پرچے میں چھپے تھے۔

(۳) ''شان حدیث'':۔ مولانا کی تصانیف میں منکرین حدیث کے رد میں سب سے اہم کتاب ہے۔ ان تینوں کتابوں کے مضامین اخبار ''اہلحدیث، امرتسر میں پچاس پچپن قسطوں میں شائع ہوئے۔ باقی قسطیں شائع نہ ہوسکیں۔

(۴) ''الفتوحات الربانیہ'':۔ تاریخ وہابیہ کے رد میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اور چھپ چکی ہے۔

(۵) ''تذکرۃ الاخوان بمنع شرب الدخان'':۔ اس میں حقہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔

(۶) ''ذم غنا ودر رقص وسرود'':۔ ناچ اور گانے بجانے کی حرمت میں۔

(۷) ''خطبات السنۃ''۔

(۸) ''احوال الصحابہ''۔

(۹) ''شرح سنن ابن ماجہ'': اس میں سنن ابن ماجہ کے ابتدائی اجزاء کی شرح تحفۃ الاحوذی کے انداز میں ہے۔

(۱۰) ''رسالہ مختصر بابت رفع یدین''۔

(۱۱) ''التبیان لما یجب معرفۃ علی اہل الایمان'': یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

(۱۲) ''حق پرستی بجواب شخصیت پرستی'': یہ بھی منکرین حدیث کے رد میں ہے۔

(۱۳) ''ترجمہ رسالہ عبودیت امام ابن تیمیہ''۔

(۱۴) ''ترجمہ رسالہ ابن تیمیہ'': اس کا کوئی نام نہیں ہے۔

(۱۵) ''چہل حدیث'' مع ترجمہ۔

(۱۶) ''ترجمہ حصن حصین'' (ناقص)۔

(۱۷) ''رسالہ مختصر بابت تحقیق مسنہ''۔

(۱۸) ''فقہ حنفی پر ایک نظر''۔

افسوس کہ مولانا کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ وہ ہندوستان کے مشاہیر علماء کی صف میں ہوتے اور ان کے علمی و دینی کارناموں سے بڑا فائدہ پہنچتا۔ ان کی وفات ۱۴ر ربیع الاوّل ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۶ر جنوری ۱۹۴۸ء یوم دوشنبہ دس بجے رات میں ہوئی اور دوسرے دن حسین آباد کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا نے وصال سے پہلے اپنے ہاتھ سے چند باتیں تحریر فرمائی تھیں۔ جن سے ان کے تقویٰ طہارت، شرافت نفس اور تعلق باللہ کا پتہ چلتا ہے۔

''شکریہ'' کے عنوان سے یہ مضمون لکھا:

''میں جناب محبی مولوی حکیم محمد بشیر صاحب اور جناب حکیم عبدالسمیع صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے علاج میں کافی توجہ کی اور مفید نسخے تجویز کیے۔ کسی نسخہ سے کوئی ضرر نہیں ہوا لیکن دوا تو مرض

کے لیے ہے۔ موت کی دوا کسی کے پاس نہیں اور کل نفس ذائقۃ الموت کا کلام صادق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو دنیا و آخرت میں ترقی عطا فرمائے۔

عبدالصمد غفرلہ ۲۴ر صفر ۷۶ھ"۔

اور یہ وصیتیں تحریر کیں:

وصیت اول: ''اگر حالات سازگار ہوں اور تعمیر مسجد کا کام جاری ہو تو ہمارے کتب خانے کی کتاب فتح الباری کامل فروخت کر کے، اس کا کل روپیہ تعمیر مسجد پر صرف کیا جائے۔ اس میں کوئی ردوبدل نہ کیا جائے''۔

وصیت دوم: "بقیہ کتب عربیہ کی اگر پوری حفاظت ہو سکے تو رکھی جائیں اور خدا کرے گھر میں کوئی صالح اور سعید ذی علم پیدا ہو تو اس سے متنفع ہو، اگر اس کی امید نظر نہ آئے تو حسب مشورہ شیخ حدیث عمل درآمد کیا جائے اور کتابوں کی حفاظت کی جو شکل ہو اختیار کی جائے''۔

وصیت سوم: "وفات کے بعد تجہیز و تکفین میں جلدی کی جائے اور نماز جنازہ شیخ حدیث صاحب پڑھائیں اور بعد دفن قبر پر دیر تک دعاء کریں اور حتی الامکان کوئی بے نمازی جنازہ نہ اٹھائے نہ لے چلے''۔

وصیت چہارم: ''میری قبر حتی الوسع جد امجد نور اللہ مرقدہٗ کی قبر کے قریب کھدائی جائے۔ قبر کی جگہ لوگوں کو غالبًا یاد ہوگی۔ اس کی بابت جہاں تک ممکن ہو تحقیق و تفتیش میں سعی کی جائے''۔

المرقوم ۱۳ر صفر

ان وصایا کے حرف حرف سے خدا ترسی و خوف آخرت کا ظہور ہوتا ہے اور یہ کہ مولانا مرحوم واقعی باخدا بزرگ تھے۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ رسولپوریؒ

حضرت مولانا حکیم ابوالاوفی محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین بن شیخ باب اللہ، راقم کے ماموں ہیں، ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی، پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخل کیے گئے اور مولانا شکر اللہ صاحب، مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری وغیرہ سے عربی کی کتابیں قدوری تک پڑھیں۔ اس وقت ان کے والد ماجد ڈھاکہ میں مدرّس تھے۔ ان کے ساتھ ڈھاکہ گئے اور متوسطات تک کی تعلیم ان سے اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کی۔ پھر مدرسۃ الشرع سنبھل، اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں داخل ہوئے اور وہیں مولانا انوار الحق صاحب امروہوی اور دیگر اساتذہ سے پڑھ کر سند فراغت پائی۔ امروہہ میں طب وحکمت کی تعلیم مولانا حکیم محمد اسماعیل عباسی سے حاصل کی۔ اس کے بعد دارالمبلّغین لکھنؤ میں مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی سے پڑھا۔ اسی درمیان میں انگریزی معمولی طریقے پر سیکھی۔ نہایت ذہین، طباع اور صاحب استعداد عالم تھے۔ علومِ عقلیہ ونقلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ معقولات میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی، مناظر، مرایا، اکر، اسطرلاب کے جامع تھے۔ علم ہیئت اور فلکیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، اس دیار میں یہ فن ان پر ختم ہوگیا۔ استعداد اور جودت طبع کا یہ حال تھا کہ مشکل سے مشکل عبارت پڑھتے ہی اس کے معانی ومطالب کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ فقہ، تفسیر، حدیث ومعانی، بلاغت اور عربی ادب میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ عربی کے اچھے شاعر تھے۔ وہ حقیقی معنی میں جامع المعقول والمنقول تھے اور جملہ علوم مروجہ میں متخصص معلوم ہوتے تھے۔

مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور، عربی کالج رائیدرگ آندھرا اور مدرسہ احیاء العلوم

مبارکپور میں مدتوں تدریسی خدمات انجام دیں اور ہر مدرسہ میں ہر فن کی اونچی کتابیں پڑھاتے رہے۔ قیامِ غازیپور کے زمانے میں جج محمد علی صاحب کو الاتقان فی علوم القرآن پڑھائی۔ جج صاحب محمد آباد کے رہنے والے تھے اور تاحیات استادی کی نسبت کا احترام کرتے رہے۔ طلبہ پر زور دے کر حتی الامکان ان ہی سے مطالب حل کراتے تھے۔ طالب علموں پر بہت ہی شفیق تھے اور اس بارے میں خاندانی روایات کو پوری طرح باقی رکھا۔ سادگی اور بے تکلفی ان کے لباس اور وضع قطع سے ظاہر ہوتی تھی۔ بچوں میں بچے اور بڑوں میں بڑے تھے۔ بہت جلد خفا ہو جاتے اور اس سے جلد راضی ہو جاتے۔ ہر مجلس میں خود کوئی علمی اور معلوماتی بات نکال دیتے اور ایک ایک موضوع پر گھنٹوں معلومات بہم پہنچاتے۔ طلبہ ان سے راضی اور وہ طلبہ سے راضی تھے اور جن لوگوں سے ان کی دوستی تھی ان سے انتہائی تعلق تھا اور دوستی سے گزر کر عزیزانہ مراسم جاری تھے۔ جو بات سامنے آجاتی اس کی تہ تک پہنچنا ان کے لیے ضروری تھا۔ علمی وقار کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس بارے میں علمائے رسولپور کی پوری نمائندگی کرتے تھے۔ ان کو اپنے علم پر بڑا اعتماد تھا۔ سادگی انتہائی درجہ کو پہنچی تھی اور اس بارے میں وہ خاص شہرت رکھتے تھے۔ جو بات چھڑ جاتی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری تھا۔ ان کے کئی ایسے واقعات ہیں کہ عشاء کے بعد کوئی بات شروع کی تو صبح ہوگئی، مگر بات ادھوری رہی۔ ان کے دوست، احباب کبھی کبھی ان کو خاص طور سے دعوت دے کر اپنے یہاں بلاتے تھے اور ان سے معلومات حاصل کرتے تھے۔ ہر کام اپنے معیار و مزاج کے مطابق کرتے تھے، اس بارے میں دوسرے کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ جلد بازی ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں تھی۔ اپنی ہر چیز اپنے ذوق کے مطابق نہایت سلیقہ سے بناتے اور رکھتے تھے اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ جس مجلس میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کا نام آجاتا، ان کے واقعات موضوع سخن بن جاتے تھے اور لوگ ان سے متعلق اپنے اپنے واقعات و تجربات بیان کرنے لگتے۔ آج بھی جب ان کا نام آجاتا ہے تو ان کے کئی واقعات سنے سنائے جاتے

ہیں۔ وہ واقعی یادگارِ زمانہ تھے۔ انھوں نے تدریس وتعلیم کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ ان کے کئی علمی وتحقیقی مقالات ومضامین جرائد ومجلّات میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی چند تصانیف یہ ہیں:

(۱) ''عمدہ شرح زبدہ'': صرف کے مشہور فارسی متن زبدہ کی اُردو میں شرح ہے، جسے مولانا نے طالب علمی کے زمانے میں ڈھاکہ میں لکھا تھا۔ رفاہِ عام پریس گورکھپور میں چھپی ہے۔

(۲) ''تحقیق رویت ہلال واختلاف مطالع'': اس رسالہ میں رویت ہلال قبل زوال وبعد زوال، متشکلات قمریہ، کسوف، خسوف، اختلاف رویت اور اختلاف مطالع وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کا انداز بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ اعظم گڑھ کو مرکز قرار دے کر مشرق ومغرب کی رویت ہلال اور اختلاف مطالع پر جامع بحث کی ہے اور اس اہم اور ادق بحث کو نہایت سہل انداز میں سمجھایا ہے۔ یہ پورا رسالہ فتاویٰ ثنائیہ جلد اوّل میں چھپا ہوا ہے۔ نیز رسالہ ''البلاغ'' بمبئی اور اخبار ''اہل حدیث'' دہلی میں چھپا ہے۔

(۳) ''شرح سبعہ معلقہ'': عربی نامکمل غیر مطبوعہ۔

(۴) ''دائمی جنتری'': ایک نقشہ ہے، جس سے قمری اور شمسی سالوں اور مہینوں کی تاریخیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۵) ''دائمی نقشہ اوقات نماز'': اسے بڑی کاوش سے کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا ہے اور اس سے علم ہیئت وفلکیات میں ان کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ ان کے کئی علمی اور تاریخی مضامین رسالہ ''البلاغ'' وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز ان کے عربی کے کئی قصائد ہیں، جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں۔ کوکن کی ایک جامع مسجد کے لیے عربی میں کئی اشعار کا نہایت شاندار قصیدہ لکھا ہے، جو چھپ چکا ہے۔ منظوم تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا:

"منظومة تاريخية فى جامع مهسلة"

جزى الله رب الناس خير جزائه — أُناسا سآبنوا فضلاً من الله مسجدا

لهم مثله بيت من الله فى الجنان — قال رسول الله ذالك وارشدا

وذاك بماهم انفقوا خالصاً له — فلله در المخلصين مؤيدا

فطوبىٰ لارباب مهسلة كلهم — فانهم خروا الى الله سُجَّداً

من الاطهر القاضى الفقير افتتاحه — ويرجو اله الخلق غفراً مجددا

وارخ يحيىٰ الاعظمى اختتامه

برحمتك اللهم ابدعت معبداً

۱۳۷۰ھ

دسمبر ۱۹۵۵ء میں جلالۃ الملک سعود الاوّلؒ ہندوستان تشریف لائے تھے اوران کی بمبئی میں تشریف آوری کے موقع پر رسالہ ''البلاغ'' کا خاص ملک سعود نمبر نکالا گیا تھا۔ جس میں ملک کے علماء وفضلاء نے جلالۃ الملک مرحوم کوخراج عقیدت پیش کیا تھا۔ مولانا نے ''البلاغ'' میں یہ قصیدہ لکھا تھا:

الايا ايها القوم الكرام — اتانا الا وحد الملك الهمام

تفضل بالقدوم بلاد هند — فضاء الجو وانصرف الظلام

فليس الابتهاج لنا وحيداً — بل ابتهج الليالى والايام

هوا السلطان ظل الله فى الار — ض من يرضاه يرضيه السلام

هو الملك المعظم ذو جلالٍ — واقدارٍ، يُرَجِّبُهُ الانام

محامده كثير ليس يحصىٰ — مكارمه رفيع الآرام

له جود وافضال ويبقى — تاثره مفاخره العظام

له سيف فلول لليتامىٰ — وللاعدا والحساد حسام

وقد سعد النجوم بسعد خطه — سعود سعده وله الدوام

وکیف ھو المسمی بالسعود　　تسعدنا بہ وھو المرام

فیاضیف بجلیل فاقد الند　　علیلك صلوٰہ ربی والسلام

وندعوہ لکم بدوام ملك

وسلطان وخیرما الغمام

طبابت وحکمت خاندانی فن تھا اور اسے مستقل طور سے حاصل کیا تھا۔ ان کے والد مرحوم کی بیاضیں اور نسخہ جات تھے، ان سے بھی کام لیتے تھے۔ ایک زمانے میں مطب جاری کیا تھا اور مبارکپور بازار میں احمدی دواخانہ کے نام سے دواؤں کی دکان بھی رکھی تھی، ہومیوپیتھک علاج بھی کرتے تھے۔ علم الادویہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ فن تجلید کے بھی ماہر تھے اور نہایت عمدہ، پائیدار اور دیدہ زیب جلدیں بناتے تھے۔ اپنے کتب خانے کی کئی سو کتابوں کی جلد بندی خود ہی اپنے ذوق کے مطابق کی تھی، جس میں تمام فنی خوبیاں اور نزاکتیں پائی جاتی تھیں۔

سل اور دق کے مریض تھے، علاج اور پرہیز دونوں میں شدید پابندی کرتے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم کے مدرّس تھے۔ آخری ایام میں دن میں ہمارے یہاں رہ جاتے اور شام کو گھر چلے جاتے تھے۔ ایک دن شام کو گھر جاتے ہوئے طبیعت کچھ نڈھال معلوم ہوئی تو اپنے معالج خاص مولانا حکیم محمد صابر خاں صاحب ندوی کے مشورہ سے اس دن مدرسہ ہی میں رہ گئے۔ دوسرے دن بھی نہ جا سکے اور تیسرے دن دوشنبہ ۱۱رصفر ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۲رمئی ۱۹۶۷ء کو صبح چار بجے بمرض سل مدرسہ احیاء العلوم میں انتقال فرما گئے اور سورج نکلتے نکلتے طلبہ ومدرسین کے کاندھوں پر رسولپور پہنچائے گئے اور اسی دن اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ آپ کے والد ماجد کا انتقال بھی اسی طرح گھر سے دور عظمت گڑھ میں ہوا اور وہاں سے لاکر رسولپور میں دفن کیے گئے۔ باپ اور بیٹے دونوں کے دنیا سے جانے کی ادا ایک ہی قسم کی ہے۔

رحمۃ اللہ علیہما

مولوی ممتاز علی سریانویؒ

مولوی ممتاز علی بن حافظ نظام الدین بن شیخ عبدالوہاب سریانوی نے نحو وصرف کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھ کر مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں مولانا عبدالعلیم رسولپوری وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور کے کسی مدرسہ میں داخل ہوکر مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی۔ اسی جگہ کسی بنگالی یا بہاری طالب علم سے دوستی ہوگئی اور دونوں نے آپس میں مشورہ کرلیا کہ ہم لوگ فراغت کے بعد ایک ہی ساتھ رہیں گے۔ چناں چہ مولوی ممتاز علی فراغت کے بعد اُدھر ہی سے پورنیہ چلے گئے اور گھر کے لوگوں کو اپنی خبر نہیں دی۔ پھر بنگال میں چائے کے ایک باغ میں ملازمت کرلی۔ اس کے بعد اسی علاقے میں مختلف مدرسوں اور اسکولوں میں مدرّسی کرتے رہے۔ مفقود الخبری کے چند سال بعد خود بخود گھر آئے اور کچھ دن یہاں رہے۔ پھر بیوی کو ساتھ لے گئے اور پورنیہ میں مستقل بود وباش اختیار کرلی اور وہیں پہلی بیوی کے انتقال پر دو شادیاں کرلیں۔ بعد میں جب سریاں آتے جاتے تھے تو دونوں بیویاں ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ بھی اپنے والد ماجد کی طرح سیدھے سادے اور بے تکلف آدمی تھے۔ علم الفرائض پر آخر تک پورا عبور حاصل تھا اور فقہی جزئیات بھی مستحضر تھیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے مسحِ رقبہ کے بارے میں امتحان لیتے ہوئے کہنے لگے کہ سنن ابوداؤد میں اس سلسلہ میں ایک حدیث ہے۔ عمر کے آخری سالوں میں سریاں آتے جاتے تھے۔ میری والدہ مرحومہ کے حقیقی ماموں تھے، اس لیے ہمارے گھر ان کا آنا جانا بہت تھا اور نانی مرحومہ تو ان کی بڑی بہن ہی تھیں۔ بعد میں دیناجپور مغربی بنگال میں زمین وجائداد خرید کر وہیں آباد ہوگئے۔ ان کی اولاد وہاں آج بھی موجود ہے۔

ایک مرتبہ دیناجپور سے دارجلنگ جاتے ہوئے اپنی بڑی بیوی سے کہا کہ

ہمارے خاندان میں مرنے والوں کو اکثر باہر ہی موت آئی ہے، میں بوڑھا ہو چکا ہوں، ممکن ہے میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔ خدا کی شان کہ دارجلنگ جا کر بیمار پڑے اور وہیں جمعرات ۶ رجنوری ۱۹۴۳ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اُن کے والد حافظ نظام الدین صاحب بھی آخری سفر میں سب لوگوں سے مل کر کلکتہ گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

مولوی فقیر اللہ

مولوی حاجی فقیر اللہ بن حاجی حبیب اللہ بن حاجی خدا بخش بن شیخ جمعیت، محلّہ پورہ دیوان کے رئیس اور تاجر تھے۔ ان کا خاندان بہت پہلے سے خوشحال اور مالدار تھا۔ ان کے جداعلیٰ شیخ جمعیت نے ایک مسجد تعمیر کی تھی، جو اُن کے نام سے مشہور ہے۔ بعد میں بوہرہ لوگوں کی خواہش پر ان کو نماز پڑھنے کے لیے دے دی۔ مولوی فقیر اللہ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود معروفی اور مولانا الٰہی بخش صاحب سے حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں مولانا عبدالعلیم رسولپوری وغیرہ سے پڑھا۔ پھر مدرسہ حنفیہ جونپور میں مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رامپوری سے معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ اسی درمیان میں مولانا عبدالوہاب بہاری سے استفادہ کیا، مگر سند فراغت حاصل نہ کر سکے۔ ویسے ''ملا فاضل'' تھے۔ کامیاب تاجر کی حیثیت سے زندگی بسر کی اور مدرسہ احیاء العلوم اور دیگر دینی کاموں میں پیش پیش رہے۔ وہ مولانا شکر اللہ صاحب کے مخصوص دوستوں میں سے تھے اور اپنی اصابت رائے اور دولت دونوں سے جماعتی اور دینی کاموں میں مدد کرتے تھے۔ نہایت شریف النفس، ملنسار، بامروت اور خلیق آدمی تھے۔ باوجودیکہ تجارت کرتے تھے۔ وضع قطع اور عمل میں بالکل عالم باعمل بن کر رہے۔ مدرسہ کے طلبہ پر بے حد شفیق تھے۔ بچپن کے نحوی وصرفی مسائل

بڑھاپے تک مستحضر تھے۔ ذہین وطباع اور بذلہ سنج بھی تھے۔ ۱۳۷۱ھ میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ یوم جمعہ ۱۱؍رجب ۱۳۷۶ھ میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم محمد سعید

مولوی حکیم حاجی محمد سعید بن شیخ عبدالکریم بن شیخ محمد عالم بن شیخ بدّل، محلّہ پورہ صوفی کے رہنے والے تھے۔ یہاں کے مشہور اطبّاء میں سے تھے۔ مطب کے ساتھ بازار میں دواخانہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے آباواجداد موضع اُکروڑا سے ترک وطن کرکے مبارکپور میں آباد ہوئے۔ خاندانی روایات کے مطابق جھنّا اور پنّا دو بھائی سب سے پہلے اُکروڑا سے (جو کہ اعظم گڑھ سے جین پور کی طرف جانے والی قدیم سڑک کے دونوں جانب مشہور گاؤں ہے) مبارکپور آئے۔ سڑک کے مغرب میں جہاں ان کا گھر تھا، پنّا شہر کے نام سے اب تک چند گھرانے ہیں۔ انگریزی حکومت میں جب زمین کا نیا بندوبست ہوا تو ان دونوں بھائیوں کی اولاد کو مبارکپور میں اطلاع دی گئی کہ زمینداروں سے اپنے حصہ لے لیں، مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ اس خاندان کی آمد یہاں غالبًا سلطان عالمگیر کے آخری دور میں ہوئی۔ مولوی حکیم محمد سعید نے اپنے گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرکے مولانا محمد محمود معروفی اور مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری سے کتب درسیہ پڑھیں اور فن طب وحکمت کی تعلیم مولانا حکیم الٰہی بخش سے حاصل کرکے ان ہی کے یہاں مطب کیا۔ پرانی وضع قطع کے آدمی تھے۔ ۱۶؍شعبان ۱۳۷۸ھ (۲۸؍فروری ۱۹۵۹ء) میں بارکپور میں فوت ہوئے۔

مولوی حکیم عبدالمجید رسولپوریؒ

مولوی حکیم عبدالمجید بن مولانا عبدالعلیم بن باب اللہ رسولپوری نے گھر پر اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور فراغت کے بعد اسمتھ ہائی اسکول عظمت گڑھ میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے اور پوری زندگی وہیں گزار دی۔ عظمت گڑھ رسولپور سے چند میل کے فاصلے پر اُتر کی جانب ہے، اس لیے گھر سے برابر تعلق قائم رہا۔ طبابت خاندانی مشغلہ تھا، آخری دور میں اس کی طرف خصوصی توجہ ہوگئی تھی۔ خاندانی روایات کا نمونہ تھے۔ آخری ایام میں تعلق اللہ کا یہ حال تھا کہ رات دن میں سینکڑوں رکعات نفل پڑھا کرتے تھے۔ ۱۳۸۳ھ (۱۳ر ستمبر ۱۹۶۳ء) کو وطن میں فوت ہوئے۔ اُن کی اولاد میں تعلیم کا چرچا ہے۔

مولوی حکیم عبدالحمید

مولوی حکیم عبدالحمید بن حاجی رحمت اللہ بن حافظ عبدالسبحان بن شیخ پکھن مولانا نعمت اللہ صاحب کے خاندان سے تھے۔ نحو وصرف کی تعلیم مولانا محمد محمود معروفی سے حاصل کر کے، طب کی تعلیم مولانا حکیم الٰہی بخش سے حاصل کی۔ مروّجہ علوم وفنون کی تکمیل نہ کر سکے اور مطب جاری کر کے دواخانہ چلایا۔ بعد میں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد جہانا گنج میں صدر مدرّس ہوئے۔ جہاں کئی سال تک نہایت اخلاص اور جاں فشانی کے ساتھ اُردو، فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھائیں۔ ان کے دورِ مدرّسی میں جہانا گنج ارباب علم وفضل کا مرجع بن گیا تھا اور اُن کے متعدد شاگرد فارغ التحصیل عالم ہوئے۔ بڑے متواضع، منکسر المزاج اور سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ جس میں عربی

کی مختلف کتابیں تھیں۔ ان ہی میں ''تقریب التہذیب'' بھی تھی، جواب بھی میرے کتب خانے کی زینت ہے۔ علمی ودینی اور اصلاحی واجتماعی کاموں میں خادم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ حدود ۱۳۵۴ھ میں مبارکپور میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم شاہ محمد

مولوی حکیم شاہ محمد، محلّہ پورہ خضر کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں ایک قلمی یادداشت سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ بہت کامیاب جراح تھے۔ مگر فیس بہت زیادہ لیتے تھے اور وہ مولانا شاہ علی حسین کے مرید تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۳۴ھ (۱۰/اپریل ۱۹۱۵ء) میں ہوا اور اُن کی قبر میں شاہ صاحب کا شجرہ رکھا گیا تھا[1]

مولوی محمد ہارون

مولانا محمد ہارون بن حافظ عبداللطیف بن میاں جی فتح محمد، محلّہ پورہ صوفی کے رہنے والے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ جن کا نام پہلے ہریہر سنگھ تھا، غازیپور کے راجپوت تھے، جو اسلام لائے اور گھر بار چھوڑ کر قصبہ سے متصل مقام املو میں مستقل طور سے سکونت پزیر ہو گئے اور وہیں شادی کر کے متاہل زندگی بسر کی۔ مولانا کے دادا میاں جی فتح محمد نے املو ہی میں انتقال کیا۔ بعد میں ان کے والد نے محلّہ پورہ صوفی میں مکان لیا اور یہیں بودوباش اختیار کی۔ حافظ عبداللطیف صاحب نہایت نیک اور ذی علم بزرگ تھے۔ مولانا محمد ہارون نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا شاہ محمد صاحب سریانوی سے پڑھیں۔ اس زمانہ میں مدرسہ چشمۂ رحمت کے بعد مدرسہ حنفیہ جونپور دیارِ مشرق کی مشہور درسگاہ تھا۔

---

[1] یادداشت قلمی شیخ عبدالمجید۔ پورہ صوفی۔

جہاں مولانا شاہ اصغر حسین صاحب دیو بندی درس دے رہے تھے۔ چناں چہ آپ نے مولانا موصوف سے پوری تعلیم حاصل کی اور وہیں سے سند فراغت پائی۔ اس کے بعد مدتوں بنارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد میں مبارکپور کے بعض مدارس و مکاتب میں مدرّس ہوئے۔ نہایت نیک اور صالح انسان تھے۔ سادگی اور قناعت پسندی شیوۂ زندگی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ پارٹی بازی اور بحث و تکرار سے دُور رہتے تھے۔ اس طرح پوری زندگی سلف صالحین کے طریقے پر بسر کی اور وضع داری میں فرق نہیں آنے دیا۔ اچھی خاصی عمر پائی تھی۔ ۸؍رجب ۱۳۸۷ھ بروز جمعہ مطابق ۱۳؍اکتوبر ۱۹۶۷ء فجر کے وقت انتقال کیا اور قصبہ کے پچھم روضہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ ان کی اولاد میں علم دین کا سلسلہ چلا، بلکہ اب بھی جاری ہے۔ ان سے تقریباً بیس سال پہلے ان کے جوان صاحبزادے مولوی عبدالحیٔ صاحب کا انتقال ہوا۔

مولوی محمد طفیل املوی

مولوی حاجی محمد طفیل املو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی طور سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا عبدالعلیم رسولپوری کی خدمت میں آکر پڑھنے لگے، ان کے ساتھ مولوی شاہ فیاض عالم املوی بھی مولانا سے پڑھتے تھے۔ یہاں سے مدرسہ حنفیہ جونپور جاکر مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رامپوری سے کتب درسیہ کی تعلیم پائی۔ پھر مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں جاکر مولانا عبدالعلیم رسولپوری اور مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی وغیرہ سے پڑھا اور یہاں سے نکل کر مدرسہ عالیہ رامپور میں داخل ہوئے، جہاں مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا منورعلی رامپوری، مولانا محمد طیب عرب مکی، مولانا حافظ وزیر احمد رامپوری اور دیگر اساتذہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد خیرآباد ضلع سیتاپور کے کسی مدرسہ میں مدرّس ہوئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول چھپرا (بہار)

میں ہیڈ مولوی ہوئے، مگر دو سال کے بعد وہاں سے بھی بمبئی چلے آئے اور مدرسہ کمو جعفر میں تعلیم دینے لگے، پھر مدرسہ ہاشمیہ میں مدرّس ہوئے۔ اسی دوران میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ واپسی پر پانچ برس وطن میں رہے، پھر بمبئی آکر مدرسہ رحیمیہ میں پڑھانے لگے۔ یہاں تک کہ بمبئی ہی میں ۴؍اگست ۱۹۵۸ء (۱۳۷۸ھ) میں انتقال کیا اور یہیں دفن کیے گئے۔ ۱۳۱۷ھ میں جب مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور کندھئی کے کنویں کے پاس والی مسجد میں تھا اور طالب علموں کے لیے کمرہ بنانے کی ضرورت ہوئی تو مولوی محمد طفیل نے بہت زیادہ بانس اور سرپت سے امداد کی تھی۔ طبیعت میں لا اُبالی پن تھا۔ مزاج پر معقولات کا غلبہ تھا اور ''خیر آبادیت'' کی حرارت بڑھاپے تک باقی تھی۔ سادگی اور بے تکلفی میں بہت آگے تھے۔ قیامِ بمبئی کے زمانے میں مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے ملتے تھے اور اپنے استاد کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے احترام کرتے تھے، حالاں کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ماضی قریب تک استاذی وشاگردی کی نسبت کیسی محترم سمجھی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

مولوی ولی الحسن فاروقی

مولانا ولی الحسن بن شیخ نجیب اللہ بن شیخ احمد علی بن شیخ مکرم بن شیخ محمد اعظم فاروقی مولانا ظفر حسن صاحب عینی فاروقی کے حقیقی بھائی تھے۔ عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ غالبًا انھوں نے کلکتہ اور ڈھاکہ وغیرہ میں تعلیم حاصل کی، جہاں حکیم غلام رسول فاروقی اور مولانا ظفر حسن عینی رہتے تھے۔ گھر ہی رہتے تھے اور زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج آدمی تھے۔ شرافت ومروت کا مجسمہ تھے۔ ہم لوگ اکثر اُن کے گھر جایا کرتے تھے اور وہ بڑے انشراح سے خاطر تواضع کرتے تھے۔ آخر میں ضیق النفس کا شکار ہوکر اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ مولانا ظفر حسن صاحب کے انتقال کے

بعد پورا کتب خانہ اٹھا کر مدرسہ احیاء العلوم کو دے دیا۔ جس میں مختلف علوم وفنون کی صدہا نادر ونایاب اور قیمتی کتابیں تھی۔ ان کے صاحبزادے مولوی غلام ربانی کلکتہ میں کتابوں کے کامیاب تاجر تھے۔ وہ مشرقی پاکستان گئے تو کچھ دنوں کے بعد مولانا ولی الحسن صاحب کو بھی وہیں بلالیا۔ چناں چہ زندگی کے بقیہ دن گزار کر بھوانی پور ضلع میمن سنگھ میں انتقال کر گئے۔ ان کا انتقال ۱۳۸۰ء کے حدود میں ہوا۔

مولوی منشی عبدالوحید لاہر پوری

مولوی منشی عبدالوحید صاحب لاہر پوری سیتاپور کے رہنے والے تھے، جہاں مولانا شکر اللہ صاحب ایک زمانہ میں بسلسلۂ تعلیم رہ چکے تھے۔ ہمارے بچپن میں مبارکپور آئے اور مولانا مرحوم سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور مدرسہ احیاء العلوم میں ریاضی وغیرہ کی مدرسی کر کے یہیں مستقل طور سے آباد ہو گئے۔ مرحوم ہمارے اُردو اور ریاضی کے استاذ ہیں۔ یہاں ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد ہے، جن میں علماء وفضلاء ہیں۔ بہت نیک اور بڑے رعب وداب کے آدمی تھے۔ بچوں کی تعلیم کا خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ صفر ۱۳۵۰ھ میں مبارکپور میں فوت ہوئے۔ ان کی اولاد یہاں آباد ہے۔

حضرت مولانا نذیر احمد رحمانی املویؒ

مولانا نذیر احمد بن شیخ عبدالشکور بن شیخ جعفر رحمانی املوی ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (فروری ۱۹۰۶ء) میں املو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے محلّہ میں حاصل کر کے مدرسہ دار التعلیم مبارکپور اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میں متوسطات تک تعلیم پائی۔ پھر مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی گئے اور وہاں کے اساتذہ سے منتہی کتابیں پڑھ کر شعبان ۱۳۴۶ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ اس دور میں ہر امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب

ہوتے تھے۔ آخری سال میں پورے مدرسہ میں اوّل آئے اور خصوصی انعام میں صحیح بخاری اور چالیس روپیہ نقد پایا۔ چوں کہ نہایت ذہین اور ذی استعداد عالم تھے، اس لیے فراغت کے بعد دارالحدیث رحمانیہ ہی میں مدرّس ہو گئے اور پہلے ہی سال نورالانوار اور رشیدیہ وغیرہ پڑھائی۔ اسی دوران میں مدرسہ کی طرف سے مشہور معقولی عالم مولانا صاحب کے پاس رامپور گئے، مگر وہاں نہ رہ سکے اور بدایوں جا کر مولانا عبدالسلام صاحب سے منطق وفلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ یہ علوم مدرسہ رحمانیہ کے نصاب میں داخل نہ تھے۔ بعد میں پھر مدرسہ رحمانیہ میں اپنی جگہ واپس آ گئے۔ اس درمیان میں مدرسہ کی طرف سے آپ کی تنخواہ جاری رہی۔[1]

مدرسہ دارالحدیث سے ترکِ ملازمت کے بعد کچھ دنوں وطن میں رہے۔ ان دنوں بازار میں ہمدرد دواخانہ کی ایجنسی لی تھی اور دوکان پر کبھی کبھی بیٹھا کرتے تھے۔ یہیں آپ سے ملاقات ہوئی اور کچھ دنوں ملنا جلنا رہا۔ خوش خلق، ملنسار اور متواضع عالم تھے۔ اس کے بعد بنارس میں مدرس ہو کر گئے، تو یوں جم کر رہے کہ یہیں کی ملازمت کے دوران میں انتقال کیا۔ وہ مبارکپور کے علمائے مصنفین میں تھے۔ تعلیم وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ رکھتے تھے۔ ان کے مضامین ومقالات قیمتی اور معلوماتی ہوتے تھے، جرائد ومجلّات میں اکثر شائع ہوتے تھے۔ ان کی مستقل تصانیف میں ''مصابیح بجواب رکعات تراویح'' چھپ چکی ہے۔ جس سے حدیث میں آپ کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ انتقال کے بعد ان کی دوسری کتاب ''اہل حدیث اور سیاست'' شائع ہوئی، جس سے مولانا کا سیاسی مزاج اور معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ کئی سو صفحات میں آب وتاب کے ساتھ بنارس سے شائع ہوئی ہے۔ آنتوں کے کینسر کے موذی مرض میں مدتوں مبتلا رہے، مگر تعلیمی خدمات میں مصروف رہے۔ آخر میں بنارس سے املو لائے گئے اور یہیں ۳۰ رمئی ۱۹۶۵ء/۱۳۸۴ھ یکشنبہ کو ۳ ربجے دن میں فوت ہوئے اور رات میں ۱۱ ربجے دفن کیے گئے۔

---

[1] تراجم اہل حدیث۔ ج:۱، ص:۴۱۱-۴۱۲۔

مولانا عبید الرحمٰن مظاہری رحمانیؒ

مولانا عبید الرحمٰن بن مولانا عبد السلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین، مولانا عبد السلام صاحب مصنف ''سیرت البخاری'' کے صاحبزادے تھے۔ اُردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور مقامی مدرسہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام مئو میں تین سال تک پڑھا۔ آخر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں جملہ علوم وفنون کی تکمیل کر کے ۱۳۵۶ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں مزید دو سال تعلیم حاصل پائی۔ فنون کی کتابیں مولانا سکندر علی اور مولانا شریف اللہ سے پڑھیں اور حدیث وتفسیر مولانا احمد اللہ صاحب پرتاپ گڑھی سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ رحمانیہ ہی میں مدرس ہو گئے۔ نہایت خوش خلق، شریف النفس اور سلیم الطبع عالم تھے، ساتھ ہی اُردو کے اچھے شاعر اور مضمون نگار تھے۔ دوست احباب کی مجلس کو گلستاں بنائے رکھتے تھے۔ ان سے علمی کاموں کے سلسلے میں بڑی توقعات تھیں۔ مگر افسوس کی عین جوانی میں سل [illegible] ردق میں مبتلا ہو کر بزمانۂ ملازمت میں مدرسہ رحمانیہ اپنے وطن مبارکپور میں ۱۰ رذی الحجہ ۱۳۶۴ھ کو انتقال کر گئے۔ آپ کا تذکرہ ''تراجم علمائے اہل حدیث'' اور ''سیرت البخاری'' طبع ثانی کے مقدمہ میں موجود ہے[1]

مولانا حکیم محمد بشیر رحمانی

مولانا حکیم محمد بشیر بن عبد المجید بن حافظ عبد الرحمٰن بن عبد الوہاب مبارکپوری۔ خود نوشتہ حالات تراجم علمائے اہل حدیث میں یہ ہیں:

---

[1] تراجم اہل حدیث۔ ج:۱۔ ص:۴۰۸-۴۰۹۔

"۱۹؍اکتوبر ۱۹۰۴ء بروز چہار شنبہ مطابق ۹؍شعبان ۱۳۲۲ھ کو مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوا۔ کلام مجید، اُردو، فارسی، حساب وغیرہ مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں پڑھا۔ کتب علوم آلیہ عربیہ اور بعض کتب حضرت مولانا ابوالعلیٰ عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث مبارکپوری سے پڑھیں۔ زاں بعد بایماء حضرت مولانا مرحوم ۱۳۴۱ھ میں بغرض تکمیل درس نظامیہ مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں داخل ہوا اور اکثر حدیث حضرت مولانا الحاج احمد اللہ صاحب شیخ الحدیث رحمانیہ سے اور کتب اصول حدیث، اصول فقہ، فقہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ مبارکپوری سے اور بعض کتب اصول فقہ، تفسیر حضرت مولانا عبدالغفور صاحب بندولی اعظمی سے اور کتب ادب وعروض اور ترجمتین حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نگرنہسوی سے اور کتب منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت وغیرہ حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب مدرس الحال مدرسہ الٰہیات کانپور سے اور بعض کتب بلاغت مناظرہ، اقلیدس حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب آردی سے اور بعض متفرقات دوسرے اساتذہ جیسے مولانا احمد صاحب مئوی، مولانا ابوطاہر صاحب بہاری مرحوم، مولانا عبدالوہاب صاحب آردی وغیرہ سے پڑھیں اور الحمدللہ مدرسہ کے تمام امتحانوں میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔

۷؍شعبان ۱۳۴۵ھ کو مدرسہ سے علاوہ جبہ ودستار اور نقدی انعام کے سند تکمیل عنایت فرمائی گئی اور شیخ الحدیث نے اپنا اجازہ مرحمت فرمایا۔ بانی مدرسہ رحمانیہ جناب شیخ حاجی عطاء الرحمٰن صاحب رئیس اعظم دہلی نے اپنے مدرسہ میں میری ملازمت کے لیے متعدد مرتبہ اپنا خیال ظاہر فرمایا، مگر تحصیل طب کے ارادے نے مجھے انکار کرنے پر مجبور کردیا۔ زاں بعد اس

سال تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب پڑھنے کے لیے داخل ہوا۔ علاوہ طب وسرجری کے سائنس بھی متعد بہ حاصل کیا۔ میرے اساتذہ میں جناب حکیم عبدالحفیظ صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ اور جناب شفاء الملک حکیم وڈاکٹر عبدالحمید خان صاحب اور جناب حکیم عبدالحلیم صاحب خلف الرشید جناب حکیم عبدالعزیز صاحب وجناب تربینی پرشاد صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور ۱۳۴۸ھ میں کالج مذکور سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور اپنے وطن میں کامیاب مطب کرتا رہا۔ اہل مئو کے اصرار سے کچھ دنوں تک مدرسہ عالیہ مئو میں بھی پڑھایا۔ بایماء حضرت مولانا مبارکپوری مرحوم ۱۳۵۳ھ میں حضرت سیدنا ومولانا سید نذیر حسین میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کے مدرسہ واقع پھاٹک حبش خاں دہلی میں پڑھاتا رہا ہوں۔ اس کے بعد شوال ۱۳۵۶ھ سے دارالحدیث رحمانیہ میں آئے“[1]

اس کے بعد مرحوم ۱۳۷۱ھ میں وطن چلے آئے اور یہیں مطب جاری کر کے کئی سال تک خدمت خلق کی۔ آخر میں سیونی (مدھیہ پردیش) میں مدرّس ہوئے اور کئی سال تک تعلیمی ودینی خدمات انجام دیں اور ۳۰ رمئی ۱۹۶۸ء مطابق یکم صفر ۱۳۸۸ھ بروز سہ شنبہ نو بجے شب میں انتقال کیا اور مبارکپور کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا محمد حنیف رہبر شکری

مولانا محمد حنیف بن حافظ عبدالرحیم شکری، مولانا شکراللہ صاحب کے خواہرزادے تھے۔ چوں کہ مولانا کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہ گئی تھی، اس لیے ان کو اپنے یہاں رکھ کر ان کی تعلیم وتربیت کی اور بڑی محنت ومشقت سے پالا پوسا۔ اس لیے مرحوم

[1] تراجم اہل حدیث۔ ج:۱۔ ص:۴۱۰-۴۱۱۔

اپنی نسبت شکری کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب وغیرہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد شوال ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، پھر مدرسہ دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے، مگر بیماری کی وجہ سے وہاں تکمیل نہ کر سکے اور مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں دورۂ حدیث پڑھا اور یہیں سے فارغ ہوئے۔ بڑے ذہین وطباع اور لطیف المزاج تھے۔ اُردو کے نہایت اچھے شاعر تھے۔ غزلیں خوب کہتے تھے۔ ابتدا میں حسرت موہانی سے خط و کتابت کے ذریعے کچھ مشورہ سخن لیا تھا۔ مضمون نگار بھی بہت اچھے تھے۔ ان کے اشعار و مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے تھے۔ اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو وہ مبارکپور کے علمائے مصنفین میں نمایاں مقام کے مالک ہوتے۔ بڑے عزم و حوصلے کے مالک تھے۔ دوست احباب کی مجلس میں چراغ محفل تھے۔ بڑی سمجھ بوجھ کے عالم تھے۔ مولانا شکر اللہ صاحب کو ان سے بڑی توقعات تھیں۔ مگر افسوس کہ عین جوانی میں دق کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی وفات پر کئی شعراء نے مراثی اور تواریخ کہیں۔ مولوی محمد شبلی شیدا خیرآبادی نے کہا ہے:

دل شیدا سن فوتش بگفت : ہائے — زچشم شد نہاں رہبر عزیزم

۱۳۵۷ھ

رہبر اعظمی جواں صالح — در حجاب عدم چوں شد مستور

بس کہ غفران حق بد و پیوست — بدر تاریخ گفت : المغفور

۱۳۵۷ھ

''مقامع الحدید بجواب مصباح الجدید'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ یہ کتاب دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ان کے اشعار کو جمع کیا جائے تو مبارکپور کے ادبی و شعری سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوسکتا ہے۔

مولانا عبدالحئی غفران

مولانا عبدالحئی بن مولانا محمد ہارون بن حافظ عبداللطیف بن میاں جی فتح محمد، ۱۳۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غفران ہے، بعد میں اس کو شاعری کا تخلص قرار دیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے قصبہ کے بعض مدرسوں میں پڑھا۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) گئے۔ اس زمانے میں یہ مدرسہ ارباب علم و فضل کا مرکز تھا اور ہندو بیرون ہند کے طلبہ یہاں سے اکتساب فیض کر رہے تھے۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی جیسے فضلائے روزگار سے مولانا نے تعلیم حاصل کر کے سند فراغت پائی اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چل کر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ کوٹواری ضلع بلیا کے ایک مدرسہ میں کئی سال تک مدرّس رہے اور یہاں کے مسلمانوں کی علمی و دینی خدمت کی۔ اُردو شاعری کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، نظمیں خوب کہتے تھے۔ بڑے صالح اور نیک عالم تھے۔ ان کی صورت سے نیکی اور شرافت ظاہر ہوتی تھی۔ اخلاق و مروت میں بہت آگے تھے۔ افسوس کہ اپنے والد کی حیات ہی میں جوانی کے ایام میں ۲۵؍ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۰؍نومبر ۱۹۴۶ء مغرب اور عشاء کے درمیان مبارکپور میں فوت ہوئے اور روضہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ تاریخ وفات یہ ہے:

پاک طینت، نیک سیرت مولوی عبدالحئی
کرد رحلت آہ در عہد شباب

بہر تاریخ وفاتش اے شفاؔ
دہ عدد کم کردہ گو "غفران مآب"

مولوی احمد علی

مولوی احمد علی بن شیخ محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین، مولانا عبدالسلام مبارکپوری کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ابتدائی دور میں تعلیم وتدریس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں معلومات نہ ہوسکیں، وہ اہل میت کی تسلی اور صبر کی تلقین میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ وہ اس موضوع پر مستقل وعظ شروع کر دیتے تھے اور قرآن وحدیث سے استدلال کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں یوں کتب حدیث اور محدثین کا حوالہ دیتے جیسے حدیث کی کسی کتاب کا درس دے رہے ہیں۔ بھاری بھرکم بدن تھا، اسی کے مطابق کپڑے پہنا کرتے تھے۔ نہایت سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے۔ مولانا عبدالصمد حسین آبادی نے ان سے اُردو، فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ بڑھاپے میں انتقال کیا۔

مولانا محمد شبلی متکلم ندوی بھوری

مولانا محمد شبلی بن شیخ عنایت علی بن شیخ شیر علی بن شیخ ڈمّر ندوی بھوری، تیرہویں صدی کے آخر یا چودھویں صدی کے شروع میں بھور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مدرسہ حنفیہ جونپور میں گئے اور وہاں کے اساتذہ سے اخذ علم وفن کرنے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ علامہ شبلی نعمانی کے خاص تلامذہ اور معتمدوں میں سے تھے۔ ''حیات شبلی'' میں جگہ جگہ ان کے نام اور حالات درج ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ایک مدت تک تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دیں۔ ان کے دَور میں ضلع کے تین شبلی تھے، اس لیے ان کو متکلم کے نام سے یاد کیا گیا۔ بڑے بے تکلف، ملنسار اور بااخلاق انسان تھے۔ سیر وصید کا شوق بڑھاپے تک رہا۔ روشن خیالی اور وسعت ظرفی میں مشہور تھے۔ ۵رذی الحجہ ۱۳۹۳ھ

مطابق ۳۰؍دسمبر ۱۹۷۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔ اس وقت ان کی عمر سو کے قریب تھی۔ فی الحال اس سے زیادہ حالات نہ مل سکے۔ راقم سے بڑی شفقت ومحبت سے ملتے تھے۔

قاری عبدالحیٔ

مولوی قاری عبدالحیٔ بن شیخ رحمت اللہ، محلّہ پورہ دولہن کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم میں مولوی قاری ظہیر الدین صاحب معروفی سے فن تجوید وقرأت کی پوری تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے سند پائی۔ قصبہ کے مشہور قراء میں سے تھے۔ کلکتہ میں تجوید وقرأت کے مدرّس تھے۔ اسی دوران فن تجوید پر ایک کتاب لکھی جو طبع ہو کر مقبول ہوئی۔ بڑے بااخلاق، مخلص اور محنتی آدمی تھے۔ افسوس کہ جوانی کے عالم میں وطن میں ۱۳۸۴ھ کے حدود میں انتقال کیا۔

مولانا شمس الحق گجہڑا

مولانا شمس الحق بن شیخ گدا حسین، ساکن گجہڑا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں متوسطات پڑھیں اور دارالعلوم دیوبند میں کئی سال پڑھ کر وہیں سے سند فراغت پائی۔ وہاں سے آکر مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور میں مدرّس ہوئے اور آخر دم تک اسی میں رہے۔ ۹؍شعبان ۱۳۹۳ھ مطابق ۷؍ستمبر ۱۹۷۳ء بروز جمعہ قلب کی حرکت بند ہوجانے سے وطن میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کے حدود میں تھی۔ اس کتاب میں گجہڑا کی شاہی مسجد اور وہاں کے مشائخ کے حالات مولانا مرحوم نے مجھے عنایت فرمائے ہیں۔

مولوی حکیم حماد علی

مولوی حکیم حماد علی بن مولوی سجاد علی بن شیخ یار علی، ساکن محلّہ شاہ محمد پور کا خاندان شیعانِ مبارکپور میں علمی اور دینی تھا اور اُن کے دادا میاں صاحب یار علی جماعت کے سردار اور مبارکپور ٹاؤن ایریا پنچ کے مجسٹریٹ تھے اور والد زبردست عالم تھے۔ مولوی حماد علی صاحب نے اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد الٰہ آباد بورڈ سے ''فاضل'' کا امتحان دے کر سند لی۔ طبابت خاندانی ورثہ تھا، مبارکپور کے مشہور اطباء میں تھے۔ بڑے خلیق اور ملنسار تھے۔ ۱۳۶۰ھ اور ۱۳۷۰ھ کے درمیان انتقال ہوا۔

مولوی حکیم محمد عمر

مولوی حکیم محمد عمر بن حافظ عبدالغفور، ساکن محلّہ پورہ صوفی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم مبارکپور میں حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بقیہ کتب درسیہ سے فراغت پائی اور بنارس ہی میں طب وحکمت کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ملنسار اور خلیق آدمی تھے۔ طبابت بطور پیشہ کے کرتے تھے، گھر ہی پر دواخانہ بھی رکھتے تھے۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں ۱۳۶۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولوی محمد یوسف انصاری

مولوی محمد یوسف انصاری بن حاجی کریم بخش، ساکن محلّہ حیدرآباد نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب سے حاصل

کی، اس کے بعد مدرسہ مصباح العلوم الٰہ آباد میں جاکر کتب درسیہ کی تکمیل کی، اس کے بعد بمبئی چلے گئے تو زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا۔ مدتوں سب سے الگ تھلگ رہے اور مختلف اخبارات میں مترجم اور کالم نویس رہے۔ ''خاتون'' کے نام سے ایک ہفتہ وار بمبئی سے جاری کیا تھا۔ ''آوارۂ بمبئی'' کے نام سے فکاہی کالم لکھتے تھے۔ گھر، خاندان اور بیوی سے بالکل بے تعلق رہے۔ آخر دَور میں مبارکپور آنے جانے لگے تھے۔ آخر میں مدرسہ صمدیہ بھیمڑی کے نگراں و مدرّس ہوگئے تھے اور شرح وقایہ، نورالانوار وغیرہ کی تعلیم بھی دیتے تھے اور بھیمڑی ہی میں جمعرات ۲۲ ر جمادی الاوّل ۱۳۸۶ھ کو فالج میں فوت ہوئے۔

مولوی محمد حسن

مولوی محمد حسن بن شیخ محمد منیر، ساکن محلہ پورہ صوفی نے متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب، مولانا شکراللہ صاحب اور مولانا وصی اللہ صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گئے، جہاں مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی وغیرہ سے تکمیل کرکے سند حاصل کی۔ وطن واپس آکر کچھ دنوں مدرسہ احیاء العلوم میں اعزازی طور سے دو تین اسباق پڑھاتے رہے۔ طبیعت میں معمولی سی تیزی تھی۔ اس لیے یہ سلسلہ بند کردیا۔ افسوس کہ جوانی ہی میں ۱۳۵۵ھ کے حدود میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم عبدالباری

مولوی حکیم عبدالباری بن حکیم محمد سعید بن عبدالکریم بن محمد عالم بن بدل، ساکن پورہ صوفی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ

مظاہر العلوم سہارنپور گئے، مگر بیماری کی وجہ سے پھر نہ جا سکے اور مدرسہ احیاء العلوم میں مشکوٰۃ تک پڑھ کر تکمیل الطب کالج لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سے فن طب میں تکمیل کی سند پائی اور طبابت کے خاندانی پیشہ کو اختیار کیا۔ اپنے حلقۂ احباب میں باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کی طبی شہرت دُور دُور تک تھی۔ ۱۶ر محرم ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۱ر اپریل ۱۹۶۱ء کو صبح چار بجے انتقال کیا اور اُسی دن روضہ کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولوی محمد اصغر

مولوی حکیم محمد اصغر بن شیخ قاری محمد علی بن حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر، ساکن محلّہ پورہ صوفی، مولانا عبدالرحمٰن محدث کے برادر زادہ اور اُن کے تلمیذ رشید تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود معروفی سے پڑھا، جو مولانا عبدالرحمٰن محدث کے تلمیذ تھے۔ اس کے بعد اپنے چچا مولانا عبدالرحمٰن محدث کے ساتھ ساتھ رہے اور مختلف مقامات و مدارس میں ان سے پڑھتے رہے۔ چناں چہ ان کے ہمراہ آرہ، پٹنہ، کلکتہ، گونڈہ وغیرہ میں رہے۔

فراغت کے بعد مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں اُردو، فارسی اور عربی کے مدرّس ہوئے اور پوری زندگی اس سے وابستہ رہے۔ قد دراز، جسم دبلا پتلا اور نہایت کم سخن، سیدھے سادے بزرگ تھے۔ پوری زندگی معمولی تنخواہ پر صبر و قناعت کے ساتھ بسر کی۔ طب و حکمت سے بھی واقف تھے اور ان کے علاج سے بہت سے مریضوں کو فائدہ ہوا۔ ان کے والد قاری محمد علی نے قرأت و تجوید کی تعلیم اپنے والد حافظ عبدالرحیم اور قاری عبدالرحمٰن سے حاصل کی تھی۔ مولوی محمد اصغر صاحب بہترین جلد ساز تھے۔ یہ فن انھوں نے قیام کلکتہ کے دوران سیکھا تھا۔ ۱۳۴۶ھ میں انتقال کیا اور آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولوی عبدالحفیظ سریانویؒ

مولوی عبدالحفیظ بن مولوی شاہ محمد بن حاجی اسماعیل بن شیخ کتوارو سریانوی اپنے والد ماجد کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گئے اور مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی وغیرہ سے کتب درسیہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ اس کے بعد وطن اور کلکتہ کے اطراف میں چند سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ علمی استعداد ٹھوس تھی، جری اور صاف گو آدمی تھے۔ غالباً ۱۳۷۰ھ اور ۱۳۷۵ھ کے درمیان سریاں میں انتقال ہوا۔

مولوی نظام الدین سریانوی

مولوی نظام الدین صاحب سریانوی نے ابتدائی تعلیم سریاں میں پائی۔ اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں اور ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے جملہ علوم وفنون مروّجہ سے فارغ ہوئے۔ نیک اور صالح نوجوان تھے۔ فقہی جزئیات پر اچھی نظر تھی۔ افسوس کہ نوجوانی ہی میں بعارضۂ دق ۱۶ / ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو انتقال کر گئے۔

مولوی حفیظ اللہ رضوی

مولوی حفیظ اللہ بن شیخ دین محمد، ساکن محلّہ پورہ دیوان نے ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم (پرانے گولہ) میں حاصل کر کے، مدرسہ منظرِ حق ٹانڈہ میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد مدرسہ منظرِ اسلام بریلی میں متوسطات کی تعلیم حاصل کی اور آخر میں دارالعلوم

معینیہ اجمیر میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی سے پڑھ کر تکمیل کی۔ اس کے بعد طب وحکمت اور کچھ تفسیر کی کتابیں مدرسہ نعیمیہ مرادآباد میں پڑھیں اور وطن واپس آکر کچھ دنوں رہے، پھر ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمت کر کے وہیں مستقل طور سے مقیم ہوکر متاہل ہو گئے اور وطن واپس نہیں آئے۔ وہیں ۲۴/نومبر ۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں انتقال کیا۔ خوش گو شاعر تھے اور تاجیؔ تخلص رکھتے تھے۔ افسوس کہ ان کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکے۔ ان کی اولاد حیدرآباد میں ہے۔

مولوی نثار احمد مظاہری

مولوی نثار احمد صاحب، ساکن پوہ دولہن نے ابتدائی تعلیم اپنے محلّہ میں حاصل کی۔ پھر مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکراللہ صاحب سے کتب درسیہ پڑھیں۔ شوال ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوکر بقیہ کتابیں پڑھ کر سند فراغت پائی۔ بڑے خوش مذاق اور باغ و بہار آدمی تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور بعارضۂ دق ۱۳۵۵ھ کے حدود میں انتقال کر گئے۔

مولوی عبدالجبار سکٹھوی

مولوی عبدالجبار بن محمد یعقوب بن محمد شفیع نمبردار خان، ساکن سکٹھی نے اپنے محلّہ کے مکتب میں پڑھ کر مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اُن دنوں میں بھی مدرّس تھا اور انھوں نے مجھ سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد گھر اور محلّہ والوں نے اُن کو مدرسہ اشرفیہ میں داخل کرایا۔ جہاں وہ فارغ ہو گئے۔ مگر اس کے دو چار برس ہی کے بعد بعارضۂ دق غالباً ۱۳۶۵ھ میں عین جوانی میں فوت ہو گئے۔

مولوی محمد سلیمان

مولوی محمد سلیمان بن محمد یٰسین بن حاجی احمد اللہ، ساکن محلّہ پورہ صوفی، متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں پڑھ کر غالباً دارالعلوم دیوبند میں بقیہ کتب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد متاہل زندگی بسر کرتے رہے۔ افسوس کہ جوانی ہی میں ہیضہ کی بہت ہی مختصر علالت میں غالباً ۱۳۸۴ھ میں انتقال کر گئے۔

مولوی عبدالشکور

مولوی عبدالشکور بن شیخ عبدالغفور بن حافظ امین الدین بن محمد عالم بن شیخ بدّل، ساکن محلّہ پورہ صوفی، مولوی حکیم محمد سعید کے برادرزاد تھے۔ بڑی عمر میں پڑھنا شروع کیا اور متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں پڑھا اور جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں مولانا سید فخرالدین احمد اور مولانا عبدالحق مدنی وغیرہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ پڑھنے کے بعد تجارت شروع کی اور بازار میں ایک دوکان کر لی۔ سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے۔ چناں چہ کتابوں میں راقم کے ہم سبق تھے۔ تقریباً ۱۵ سال ہوئے انتقال کر گئے۔

مولوی عبدالمجید سریانوی

مولوی عبدالمجید بن مولوی شاہ محمد بن اسماعیل بن شیخ کتوارو سریانوی، مولوی عبدالحفیظ سریانوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں حاصل کر کے اپنے والد مولوی شاہ محمد صاحب وغیرہ سے مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں عربی کی تعلیم حاصل کی، جہاں اُن کے والد مدرّس تھے، اس کے بعد امروہہ میں تکمیل کی۔ علمی استعداد اچھی

تھی۔بعض مدرسوں میں کچھ دنوں مدرّس رہے۔پھر ذاتی کاروبار میں یوں مشغول ہوئے کہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔راقم سے عمر میں بڑے تھے۔طبیعت کی تیزی اور صاف گوئی میں مشہور تھے۔

غربت اور گھریلو معاملات کی وجہ سے پریشان رہا کرتے تھے۔تقریباً ایک ماہ بیمار رہ کر ۷/شوال ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۱/ستمبر ۱۹۷۸ء بروز دوشنبہ عصر سے پہلے انتقال کیا اور عشاء کے بعد سریان میں دفن کیے گئے۔مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔راقم جنازہ اور تدفین میں شریک تھا۔رحمۃ اللہ علیہ

مولوی عبداللہ املوی

مولوی عبداللہ بن شیخ عبدالشکور، املو مبارکپور میں پیدا ہوئے۔ان کے نانا حاجی احمد صاحب ساکن کٹرا نہایت بزرگ اور باخدا انسان تھے اور اپنے اس نواسے سے بے حد محبت کرتے تھے۔مولوی عبداللہ نے ابتدائی تعلیم املو میں حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں نحو وصرف پڑھا۔پھر مدرسہ فیض عام مئو میں داخل ہوئے اور آخر میں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں جملہ علوم وفنون کی تکمیل کی اور رجب ۱۳۶۱ھ میں سند فراغت لی۔ اس موقع پر ان کے دوست مولوی سعید احمد اعظمی مقیم نواب گنج دہلی نے یہ قطعہ تاریخ کہا:

نیک دل پاکباز عبداللہ　　عالمِ دیں زفضل داور شد
بہر تاریخ سال گفت سعید　　وارثِ نامۂ پیمبر شد

فراغت کے بعد مدرسہ دربھنگہ میں عربی کے مدرّس ہوئے،مگر چھ ماہ گزرتے گزرتے بیمار پڑ گئے اور مجبوراً وطن چلے آئے اور سل کے مرض میں ۱۳۶۲ھ میں انتقال کر گئے۔مرحوم ذہین،سنجیدہ اور جوانِ صالح تھے۔نیک نفسی اور شرافت طبع اپنے نانا سے ورثہ میں پائی تھی۔

مولوی نذیر احمد نوادوی

مولوی نذیر احمد بن حافظ قادر بخش، ساکن نوادہ پیدائشی طور سے معذور اور اپاہج تھے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں راقم فراغت کے بعد مدرسہ میں عربی کا مدرّس تھا۔ انھوں نے مجھ سے مقاماتِ حریری، دیوانِ حماسہ، سبعہ معلقہ، مقدمہ ابن خلدون اور ہدیہ سعیدیہ وغیرہ پڑھا۔ اس کے بعد جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں جا کر تکمیل کی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں نوادہ کے مدرسہ میں مدرّس رہے، پھر اپنا ذاتی کاروبار جاری کیا اور اچھی خاصی کامیابی حاصل کی اور متاہل زندگی بسر کی، بال بچے ہوئے۔ معذوری کی وجہ سے اِدھر اُدھر آجا نہیں سکتے تھے۔ استعداد اچھی تھی۔ نیک اور صالح عالم تھے۔ جمعرات ۲۹ محرم ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۷؍اپریل ۱۹۶۹ء کو نوادہ ہی میں انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر چالیس سال کے حدود میں رہی ہوگی۔

مولوی محمد یوسف رحمانی

مولوی محمد یوسف بن حاجی محمد صدیق، ساکن لوہیا املو نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دار التعلیم مبارکپور میں حاصل کی۔ اس کے بعد مئو کے مدرسوں میں پڑھا اور مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی سے فراغت پائی۔ چند سال پہلے جنوری میں فوت ہوئے[1]

---

[1] یہ عبارت ۱۹۷۴ء کی ہے۔

مولانا حافظ عبد الرؤف بلیاوی

مولانا حافظ عبد الرؤف بن شیخ محمد اسلام، بھوجپور ضلع بلیا کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے یہاں حاصل کر کے، مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں عربی کی پوری تعلیم حاصل کی۔ درمیان میں کچھ دنوں کے لیے ناگپور گئے، مگر تکمیل مبارک پور میں کی اور کٹیہار ضلع پورنیہ کے مدرسہ میں چھ ماہ قیام کر کے ہیئت کی تعلیم حاصل کی اور مدرسہ اشرفیہ میں نائب شیخ الحدیث کے عہدے پر رہے اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۲ء تک مسلسل تیس سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ اسی درمیان میں فتاویٰ رضویہ کی دو جلدوں کو مرتب کر کے سنی دار الاشاعت مبارک پور سے شائع کیا۔ وہ اپنی ذات سے نیک، بے نفس اور صاحب علم و فضل تھے۔ ہم لوگوں سے کھل کر ملتے تھے۔ بیعت و ارادت مولانا امجد علی گھوسوی سے رکھتے تھے۔ ان کا مختصر حال ''تذکرۂ علمائے اہل سنت'' میں صفحہ ۱۸۰/و ۱۸۱/ پر ہے۔ ۱۴/شوال ۱۳۹۱ھ میں شکم کی بیماری میں فوت ہوئے۔ ان کی قبر مبارک پور میں سمودی تالاب کے شمال مشرقی حصے میں ہے۔

استاذ الشعراء محمد یٰسین فغاںؔ مبارکپوری سورتی

فغاںؔ کا نام محمد یٰسین ہے۔ وہ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں بمقام مبارکپور ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے۔ موصوف ایک سال کے بھی نہ تھے کہ والد نے انتقال کیا اور دادا حکیم مولوی امیر علی کے ذمے آ گئے، چھٹے سال والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حکیم امیر علی اپنے بیٹے بہو کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور فغاںؔ کو لے کر ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں سورت آ گئے اور فغاںؔ سورت ہی کے ہو کر رہ گئے۔ سورت آتے ہی حکیم مولوی امیر علی نے دینیات کی تعلیم

دلوائی۔ ابھی تعلیم بھی پوری نہ ہوئی تھی، حکیم مولوی امیر علی کا ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں انتقال ہو گیا اور ۱۲/۱۱ رسالہ نوجوان نے فکر معاش کے لیے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے پارچہ بافی کی صنعت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ جدوجہد نے ان کو کافی نوازا اور ماحول سازگار ہونے لگا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں فغاںؔ کو شعر سننے کا ذوق ہوا۔ آخر یہی ذوق شعر گوئی میں ڈھل گیا۔ اپنا ابتدائی کلام میر زین الدین شیداؔ کو دکھاتے تھے۔ شفیق استاد نے خلوص و محبت سے ان کی تربیت کی۔ دل کی تڑپ اور استاد کی نظر سے فغاںؔ مشاعرہ میں کامیاب ہوتے رہے۔ انھوں نے سورت میں اُردو کی اشاعت اور شعر و سخن کی خدمت کے لیے ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۳ء) میں ''بزم انجمن ترقی ادب'' کی بنیاد رکھی۔ اس کے ماتحت بڑے بڑے کامیاب مشاعرے کر کے عوام کو شعر و سخن کا ذوق دیا۔

شیداؔ کے انتقال پر فغاںؔ نے ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں پنڈت بھولا ناتھ جوشؔ ملیسانی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ جوشؔ ملیسانی کی صحیح رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ فغاںؔ ریاست گجرات کے ایک باعزت استاد مانے جاتے ہیں۔ آپ کے کئی شاگرد ہیں، جو اپنے استاد کے ساتھ اُردو کی ترقی میں سرگرم ہیں۔ فغاںؔ کی غزلیات کا ایک مجموعہ مرتب ہو چکا ہے۔ کلام میں عزم و ہمت، حوصلوں کی بلندی، جذبات کی روانی اور خیالات کی بلندی قوس وقزح کے رنگوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

مرے عزمِ مصمّم نے مجھے ساحل پہ پہنچایا
رہے گرداب میں دامانِ ساحل دیکھنے والے

آندھی چلے، چلا کرے، برق گرے، گرا کرے
اپنا جہاں مقام تھا، اب بھی وہیں مقام ہے [1]

سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔

---

[1] روزنامہ اُردو ٹائمنز، بمبئی۔ ۹ ر ستمبر ۱۹۶۹ء۔

مولوی حکیم عبدالباری

مولوی حکیم عبدالباری بن مولانا حکیم الٰہی بخش بن حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ لعل محمد عرف لالن بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد مبارکپور، مشہور عالم وطبیب مولانا حکیم الٰہی بخش ساکن پورہ دولہن کے لڑکے تھے۔ ۱۳۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام نذیر احمد بھی تھا، مگر عبدالباری کے نام سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود صاحب معروفی اور اپنے والد وغیرہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد کانپور حصولِ تعلیم کے لیے گئے اور باقاعدہ تکمیل نہ کر سکے۔ فن طب ان کا خاندانی ورثہ تھا اور وہ قصبہ کے چند مشہور اطباء میں سے تھے۔ سل، دق، تپ محرقہ اور دیگر مخصوص امراض کے علاج میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ سے بہت سے مریضوں کو شفا ہوئی۔ طبیعت میں نفاست ونزاکت تھی۔ لباس، وضع قطع اور خورد ونوش کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ بڑے نوک پلک کے آدمی تھے۔ ساتھ ہی طبیعت میں لاابالی پن تھا اور طبابت کی طرف کوئی خاص رجحان نہیں تھا، مگر آخر میں اس پر خصوصی توجہ دی اور خوب شہرت پائی۔ ادھر دو تین سال پہلے اختلاجِ قلب کی شکایت ہوگئی تھی، جس کے بعد رجوع الی اللہ کا ذوق بڑھ گیا تھا۔ وضع داری آخر تک باقی رہی اور طبعی ذوق کے مطابق زندگی بسر کی۔

شنبہ ۱۵؍ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۳۰؍ نومبر ۱۹۷۴ء کو حسب عادت دوپہر کو بازار آئے، یہیں قلبی دورہ پڑا اور درد ہوا، ساڑھے چھ بجے شام کو انتقال کر گئے۔

مولوی محمد یونس سریانویؒ

مولوی محمد یونس بن شیخ محمد شکر اللہ سریاں کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کے انتقال کے بعد بچپن ہی میں سریاں کے مشہور بزرگ اور حافظ نظام الدین صاحب کے شاگرد جناب نور محمد صاحب کی زیر تربیت آ گئے۔ ان کی والدہ نے نور محمد صاحب سے نکاح کر لیا تھا۔ انھوں نے مولوی محمد یونس کی تعلیم کی ذمہ داری لی۔ مرحوم نے ابتدائی تعلیم سریاں میں حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا اور فارسی، عربی کی جملہ تعلیم یہیں حاصل کی اور ۱۳۵۹ھ میں مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ کچھ دنوں اپنے وطن میں رہ کر مقامی مکتب میں تعلیم دی۔ پھر نور الدین پور، رسولپور اور نوادہ کے مدرسوں میں تعلیم خدمت کرتے رہے۔ آخر میں بیمار پڑے اور معمولی طور سے فالج کا اثر رہا، وہی جان لیوا ثابت ہوا اور ۲ رجب ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء بروز شنبہ سریاں میں انتقال کیا۔ مرحوم اور راقم دونوں کی طالب علمی کا زمانہ ساتھ گزرا ہے، بے تکلف دوستوں میں تھے، سادگی بہت زیادہ تھی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۰ برس کے قریب رہی ہوگی۔

مولانا خواجہ عبدالعزیز نعمانی مبارکپوریؒ

مولانا خواجہ عبدالعزیز بن شیخ عبدالغنی نعمانی مبارکپوری محلہ پورہ صوفی میں پیدا ہوئے۔ ابتداء سے متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ فارسی کے زمانہ ہی سے میرے شریکِ درس تھے۔ آخر میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد سے فراغت حاصل کی۔ بڑے نفاست پسند، ذکی الحس اور پروقار آدمی

تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کا مکان ہم طلبہ کا مامن و مرکز تھا، جہاں نہایت بے فکری اور بے تکلفی سے ہم لوگ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کے گھر والے بھی طلبہ کی عزت کرتے تھے اور ان کے کھلانے پلانے میں لذت پاتے تھے۔ آبائی پیشہ حلاقت تھا۔ خواجہ کا لقب اسی زمانۂ طالب علمی سے ان کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ اسی طرح نعمانی کی نسبت بھی اسی دَور کی یادگار تھی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں مرادآباد اور مبارک پور رہے۔ پھر پینتے پورہ ضلع سیتاپور کے مدرسہ شمس العلوم میں مدرّس ہوئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہاں سے علیحدگی کے بعد مدرسہ احیاء العلوم کے نام سے پینتے پور میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو آگے نہ چل سکا۔ دعا تعویذ میں بہت آگے تھے اور اس پر معاوضہ طلب نہیں کرتے تھے۔ کسی نے کچھ دے دیا تو لے لیا، ورنہ کوئی بات نہیں تھی، اس بے نیازی کی وجہ سے نقصان میں رہے۔ ویسے بھی میاں بیوی تھے، اخراجات بھی معمولی تھے۔ صاحب اولاد نہ ہو سکے۔ کئی کئی سال پر مبارک پور آیا کرتے تھے۔ تقریباً ۳۵ر سال پینتے پور میں بسر کیے۔ آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا تو کچھ دنوں کے بعد میاں بیوی مبارک پور چلے آئے۔ علاج سے کافی افاقہ تھا، مگر اچانک فالج کا دوسرا حملہ ہوا، جس سے جاں بر نہ ہو سکے اور ۳۰ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۰ھ سنیچر کا دن گزار کر رات میں انتقال کیا اور دوسرے دن دوشنبہ کو دوپہر میں دفن کیے گئے۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۸۰ء کو انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۶۵ر سال کے حدود میں تھی۔

میری ان کی آخری ملاقات مبارک پور میں ان کے انتقال سے ایک ماہ پہلے ہوئی تھی، جب کہ وہ پینتے پور سے بیمار ہو کر آئے تھے اور اپنی سسرال سکٹھی میں قیام کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت میں بمبئی میں تھا۔ برادرم حیات النبی اور عزیزم ظفر مسعود کے خطوط سے ان کے انتقال کی خبر ملی۔

مولوی محمد بشیر خان سکٹھوی رح

مولوی محمد بشیر خان ولد ولی محمد خان، ساکن سکٹھی نے بڑی عمر میں تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ احیاء العلوم میں اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پا کر، آخری سال جامعہ قاسمیہ مراد آباد گئے اور وہاں کے شیوخ واساتذہ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

میری اوران کی طالب علمی کا زمانہ ایک تھا اور ہم لوگوں میں بڑا یارانہ تھا۔ جو آخر تک قائم رہا، بلکہ وہ میرے ہم سبق تھے۔ ان کے والد قدیم وضع قطع کے بے پڑھے لکھے آدمی تھے، مگر انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے محمد بشیر کو مولویت کی تعلیم دلائی۔ مولوی محمد بشیر خان بڑے باغ و بہار اور بے تکلف آدمی تھے۔ ان میں سادگی انتہاء کو تھی۔ پوری زندگی لاابالی پن اور تکلیف میں بسر ہوئی، حالاں کہ بیوی بچوں کی زندگی رکھتے تھے، مگر آخر میں سب نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور بڑی کس مپرسی کے عالم میں دنیا سے گئے۔ میں ان کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش میں رہا۔ اسی سلسلہ میں دوبارہ بمبئی بھی بلایا تھا۔ یک شنبہ صبح کو ۷/رجب ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۴/جولائی ۱۹۷۷ء کو فوت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

(از خط ظفر مسعود ۲۷/جولائی ۱۹۷۷ء)

مولوی عبدالغفور رح

مولوی عبدالغفور بن شیخ عبدالمجید بن حافظ محمد علی، محلّہ پورہ صوفی ٹُن کے پاس کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان موضع اکروڑا سے آیا تھا۔ اوپر جا کر ان کا سلسلۂ نسب مولوی حکیم محمد سعید سے مل جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور محلّہ کے مدرسہ میں حاصل کر کے، مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے اور فارسی وعربی کی مکمل تعلیم حاصل کر کے

دو تین سال جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں تکمیل کی۔

فراغت کے بعد پوری زندگی درس وتدریس اور تعلیم وتعلم سے بے تعلق رہے۔ مزاج کے اعتبار سے کم آمیز تھے۔ کاروبار میں ترقی کی اور اولاد پھولی پھلی۔ نہایت سیدھی سادی اور خاموش زندگی بسر کی۔ آخری دَور میں مشغلہ کے طور پر اپنے آبائی مکان کے پاس والی سنی مسجد کی دوکان میں معمولی طور سے دوکانداری کرتے تھے اور عموماً مسجد کی چھت پر سوتے تھے۔ ۴؍شوال ۱۳۹۴ھ کی رات میں بارہ بجے مسجد کی چھت پر فالج کا حملہ ہوا اور بے ہوش ہوگئے، صبح دوشنبہ کو بغرض علاج اعظم گڑھ لے جائے گئے، دوسرے دن ۵؍شوال منگل کی رات میں ۴؍بجے وہیں انتقال کر گئے اور روضہ کی عیدگاہ کے پیچھے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ راقم سے دو ایک سال پہلے فارغ ہوئے تھے۔ کہنا چاہیے کہ میرے معاصرین میں سے تھے۔

مولوی فیاض حسین واعظ

مولوی فیاض حسین بن شیخ محمد ابراہیم، ساکن محلّہ پورہ صوفی نے ابتدائی تعلیم اپنے محلّہ کے مدرسہ دارالتعلیم میں حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی علی سجاد مبارکپوری سے پڑھ کر وثیقہ اسکول فیض آباد میں پڑھا۔ پھر سلطان المدارس لکھنؤ اور مدرسہ جوادیہ بنارس میں پڑھ کر فخر الافاضل کی سند لی۔ اس کے بعد مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے مروجہ علوم وفنون میں سند فراغت حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا سید ابن حسن نونہروی، مولانا سید محمد رضی زنگی پوری، مولانا سید سبط حسن، مولانا سید ابوالحسن عرف منّن، مولانا سید احمد علی وغیرہ مشاہیر علمائے شیعہ ہیں۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں مدرسۃ الواعظین سے تعلق رہا۔ اس کے بعد مسقط میں واعظ بن کر گئے۔ جمال دیوجی مسافر خانہ بمبئی میں واعظ اور پیش امام رہے۔ ان کا مزاج علمی اور تعلیمی وتصنیفی تھا اور وسعت نظری بھی تھی۔ بمبئی میں

راقم سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں اور مبارکپور میں ان سے علمی ربط بھی رہا۔ ''تذکرۂ علمائے مبارکپور'' کے لیے علمائے شیعہ کے حالات کا بیشتر حصہ ان ہی کا فراہم کردہ ہے۔ وہ ملنسار، باوقار اور خوددار عالم تھے۔ واعظ اور مبلغ ہونے کے ساتھ اپنے مذہب کے اچھے مصنف میں تھے۔ ان کی دو کتابیں مطبوعہ ہیں، ایک ''تاریخ وعقائد شیعہ امامیہ'' جو اچھی خاصی ضخیم ہے اور دوسری کتاب ''صاحب امر امام عصر'' ہے، جو ہمارے پاس ہے اور موصوف کی عطا کردہ ہے۔ اس میں شیعہ امامیہ عقیدہ کے مطابق امام مہدی کا بیان ہے۔ اہل سنت کی کتابوں سے استدلال کیا گیا ہے، مگر اسلوب مناظرانہ نہیں ہے، بلکہ محققانہ ہے۔ یہی حال پہلی کتاب کا ہے۔ پچھلے چند سال سے اہل زمانہ کی ناقدری کے باعث گھر ہی پر تھے۔ اسی دوران میں فالج میں مبتلا ہو کر سالوں کے بعد شعبان ۱۳۹۴ھ میں وطن ہی میں فوت ہوئے۔ عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔

مولانا حکیم محمد صابر خان سکٹی

قصبہ کے مشہور طبیب مولانا حکیم محمد صابر صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دوشنبہ ۸/رجب ۱۳۹۹ھ مئی ۱۹۷۹ء ۳/بجے شب میں انتقال کیا اور دوشنبہ ہی کو اپنے آبائی قبرستان شاہ کے پنجہ میں ۸/بجے رات میں دفن کیے گئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر لگ بھگ ۸۲/سال تھی۔

مولانا مرحوم نہایت متواضع وقانع اور بزرگ انسان تھے۔ پوری زندگی طبابت کے ذریعہ خدمتِ خلق میں صلہ وشہرت سے بے نیاز ہوکر بسر کی۔ فنِ طب میں مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں کئی مشہور طبیب ہوئے۔ راقم کے ننہال اور مولانا مرحوم کے خاندان سے قدیم دینی وعلمی تعلقات تھے۔ راقم بھی عربی کی ابتدائی تعلیم ہی کے زمانہ سے ان کے یہاں جا کر استفادہ کرتا تھا اور بڑی شفقت ومحبت سے ملتے تھے۔

یہ تعلق آخری وقت تک وضع داری کے طوز پر جانبین سے قائم رہا اور اس میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ ان کے ساتھ مبارکپور سے فنِ طب بھی ختم ہو گیا اور اب یہاں کوئی قابل ذکر حکیم وطبیب نہیں رہا۔ اللہ رحم فرمائے۔

مولوی فخر الدین مبارکپوری

مولوی شمس الدین صاحب حسینی مبارکپوری کے سب سے بڑے صاحبزادے مولوی فخر الدین مبارکپوری کا مکہ مکرمہ میں بروز دوشنبہ ۱۲ر فروری ۱۹۸۳ء کو جدہ آتے ہوئے حدودِ حرم ہی کے اندر ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا، رحمۃ اللہ وغفرلہ۔ زاہد اسپتال میں بھرتی کیے گئے، مگر ڈھائی گھنٹہ کے بعد انتقال ہوا۔ نمازِ جنازہ بعد نمازِ عصر حرم میں ادا کی گئی اور جنت المعلیٰ میں دفن کیے گئے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی۔ مرحوم جوان، نیک اور صالح تھے۔ آپ جدہ میں ہندوستانی قونصل خانہ میں عربی انگریزی کے ٹائپسٹ تھے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔

مولوی حافظ مبارز الدین مبارکپوری

مولانا شمس الدین صاحب حسینی مبارکپوری کے صاحبزادے مولوی حافظ مبارز الدین ۲۰ رشعبان مطابق ۴ رجولائی ۱۹۸۰ء جمعہ کو بمبئی جاتے ہوئے ناسک ریلوے اسٹیشن پر ریل پر سوار ہوتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، رحمۃ اللہ وغفرلہ۔ مرحوم جوان صالح عالم تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہو کر گزشتہ سال فارغ ہوئے تھے اور دارالافتاء ریاض کی طرف سے ان کا تعاقد ہندوستان میں ہوا تھا، مگر اپنی ذمہ داری کے سلسلے میں بمبئی کا یہ سفر کر رہے تھے۔ ناسک کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ
خلف اکبر مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

از: قاضی ظفر مسعود مبارکپوری

ہمارے بھائی مولانا خالد کمال مبارکپوری، جنھیں ہم سب بھائی بہن ''بڑے بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ جب کہ خاندان اور گھر کے دیگر بڑے افراد خالد کمال کہتے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش مدرسے کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ہے۔

بھائی صاحب بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے میں بہت تیز اور ذہین وفطین تھے، مگر پڑھتے کم تھے، جو پڑھتے تھے وہ یاد ہو جاتا تھا۔ والد صاحب کی طرح پڑھنے کے زمانے ہی سے شاعری اور مضمون نگاری کرنے لگے تھے۔ انھوں نے بھی والد صاحب کی طرح پوری تعلیم احیاء العلوم ہی میں حاصل کی، دو سال کے لیے دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں تھوڑے عرصہ کے لیے تدریسی خدمات انجام دی اور اس کے بعد چند سال مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں جسے والد محترم نے ۱۹۵۱ء میں جاری کیا تھا، درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس دوران عبد المنعم النجار قونصل جنرل حکومت مصر نے باصرار آپ کو جامع ازہر میں سرکاری وظیفے پر داخلہ کے لیے والد صاحب سے بہت زور دیا، مگر آپ نے انکار کر دیا، کیوں کہ اس زمانے میں جامع ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے طلبہ عام طور پر کوٹ پینٹ پہن لیتے تھے اور داڑھی بھی صاف کرا دیا کرتے تھے۔ اس لیے والد صاحب کو انقباض تھا، مگر جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا آغاز ہوا تو والد صاحب نے انشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں داخلہ کرا دیا، جس کا تذکرہ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نہایت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں:

''یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے، مدینہ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ایک ہنس مکھ نوجوان ہمارے روم پارٹنر بن کر آئے، ان کا نام خالد کمال تھا۔ خالد کمال ہوسٹل میں بادِ بہار بن کر آئے۔ کمرے کی سنجیدگی قہقہوں میں بدل گئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے یہ نئے روم پارٹنر مشہور و معروف عالم دین قاضی اطہر مبارکپوری کے صاحبزادے ہیں۔ قاضی صاحب کے نام سے ہر شخص واقف تھا، جسے کچھ اسلامی کتابوں اور رسائل و جرائد کے مطالعے کا موقع ملا تھا''۔[1]

مدینہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں سند فراغت حاصل کرنے کے بعد ہی حکومت سعودیہ کی طرف سے دین حنیف کی اشاعت کے لیے مبعوث ہو کر گھانا مغربی افریقہ بھیجے گئے، جہاں چودہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے رہے۔

ربوہ (پاکستان) کے بعد دنیا میں قادیانیوں کے سب سے بڑے مرکز گھانا میں اسلام کا بہتر تعارف کرایا اور صحیح دینی شعور بیدار کیا۔ پورے گھانا میں گاؤں گاؤں، شہر شہر، قبیلہ قبیلہ گھوم گھوم کر جلسہ کیا اور قادیانیوں کو چیلنج دیا۔ چوں کہ گھانا بھی برٹش کالونی تھا، اس لیے اپنے پروردہ مرزا غلام احمد قادیانی کی گھانا کو پوری دنیا میں اسلام کے مقابلے میں قادیانیت کا مرکز بنانے کی کھلی ہمت افزائی کی اور اس کے لیے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے، جس میں سب سے مؤثر حربہ اپنی تبلیغ کا یہ استعمال کیا کہ تم لوگ حج کے لیے جاتے ہو، وہاں جتنے کرتا پائجامہ اور شیروانی میں لوگ نظر آتے ہیں، سوائے قادیانی کے کوئی اور نہیں۔ وہ بیچارے سیدھے سادھے ان کے چنگل میں پھنستے رہے اور یہ لوگ اسپتال، اسکول کالج اور مسجدیں بنوا کر لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے اور حالات یہ تھے کہ کوئی ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔ چوں کہ بھائی صاحب بھی کرتا پائجامہ اور شیروانی پہنتے تھے،

[1] ماہنامہ دارالسلام اگست ۱۹۹۶ء۔

اس لیے ان کے بارے میں بھی یہ مشہور کیا کہ دیکھو حکومت سعودی نے بھی اپنا نمائندہ ایک قادیانی ہی کو بھیجا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان کا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں ایک نہایت بدبودار قادیانی تھا، اس لیے غیر ممالک میں تقریباً پچھتر فیصد قادیانی بھیجے جاتے تھے اور وہ لوگ بھی اس سلسلے میں مقامی لوگوں کو ورغلاتے تھے اور بیچارے دوسرے لوگ اگر کبھی منھ کھولتے یا احتجاج کرتے تو فوراً حکومت پاکستان کا عتاب نازل ہوتا، یا تبادلہ کر دیا جاتا، یا پاکستان بلا لیا جاتا۔

اتفاق سے بھائی صاحب کے ساتھ ایک اور ہندوستانی عالم جو جامع ازہر کے فارغ تھے، مولانا فضل الرحمٰن بہاری وہ بھی مبعوث ہوئے، وہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے۔ ان دونوں حضرات نے وہاں کے لوگوں کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ قادیانی ہندوستان و پاکستان میں غیر مسلم مانے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ و عمل سراسر اسلام کے منافی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر اختلاف پیدا کرنے کے لیے، ان کو خوب بڑھاوا دیا اور وہی کام یہ لوگ گھانا میں بھی کر رہے ہیں۔ ہم ان کو کھلا ہوا چیلنج دیتے ہیں کہ یہ پوری دنیا حتی کہ اپنے آقا ظفر اللہ خاں کو بھی بلا لیں، ہم ان سے بحث کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بس کیا تھا، پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، پاکستانی سفارت خانے والوں نے بھی کھل کر قادیانیوں کا ساتھ دیا، یہ دو ہندوستانی مولوی کیا کر پائیں گے۔ انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں، جس کا مقصد ہی باطل عقائد سے ٹکر لینا ہے۔ چناں چہ معرکہ آرائی تو ہوئی نہیں، مگر دکھاوے کے لیے محاذ آرائی کرتے رہے۔ ان دونوں مولویوں کی کوشش رنگ لائی اور گاؤں کا گاؤں اور قبیلے کا قبیلہ توبہ واستغفار کر کے ازسر نو کلمۂ توحید پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گیا۔

اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خاں اور شاہ فیصل مرحوم میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ سر ظفر اللہ خاں چوں کہ بین الاقوامی عدالت ہیگ (جنیوا) کا صدر رہ چکا تھا، اس لیے

بڑے کروفر سے شاہ فیصل مرحوم کو لکھا کہ ہم تو دنیا میں اتحاد بین المسلمین کے لیے رات دن کام کرتے ہیں اور اسلام کی اشاعت وترویج کے لیے کوشاں رہتے ہیں، مگر آپ کے آدمیوں نے گھانا میں طوفان کھڑا کر رکھا ہے، تو یہ کام کیسے شرمندۂ تعبیر ہوگا، جب کہ آپ بھی اس کے پرزور حامی ہیں۔ چوں کہ اس درمیان میں پورے گھانا سے شاہ فیصل مرحوم کے نام لعنت وملامت کے خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جتنا خط جاتا تھا شاہ فیصل مرحوم سب کو بہ نفس نفیس پڑھتے تھے اور جہاں ضرورت سمجھتے تھے، سرخ نشان لگا کر گھانا اپنے سفیر کو واپس بھیج دیتے تھے۔ بھائی صاحب کہتے تھے کہ سفیر ہم لوگوں کو ڈاک دکھلاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب شاہ کے قلم کا نشان ہے، جسے میں پہچانتا ہوں۔ شاہ فیصل مرحوم ان علاقوں میں دوبارہ جا کر قبیلوں کے سردار سے ملنے کے لیے حکم دیتے تھے۔ شاہ فیصل مرحوم نے بڑی خندہ پیشانی سے سر ظفر اللہ خاں کے خط کا جواب دار الافتاء سے منگوایا، جس میں صاف لکھا تھا کہ ان کا مسلمانوں کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ غیر مسلمین کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ شاہ مرحوم کو دار الافتاء نے یہ مشورہ بھی دیا کہ آئندہ حج کے نام پر کوئی قادیانی مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں داخل نہ ہونے پائے، چناں چہ سر ظفر اللہ خاں کو جواب ارسال کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ سرکاری سرکلر بھی جاری ہو گیا اور سعودی سفراء کو ہدایت کر دی گئی کہ آئندہ حج کے ویزے پر کوئی قادیانی اگر مملکت میں داخل ہوا تو وہاں کی حکومت اس کی ذمہ دار ہوگی اور ہمارے اور اس حکومت کے تعلقات بگڑ جائیں گے۔ چناں چہ اس سال ہندوستان میں بھی بڑی سختی تھی کہ کوئی قادیانی ویزا حاصل نہ کر سکے اور پاکستان میں تو طوفان کھڑا ہو گیا، اس لیے کہ سرکاری مشنریوں اور حکومت کے اہم عہدوں پر قادیانی فائز تھے، اسی ہنگامہ میں مجلس ختم نبوت بنی، جس کی بے مثال قربانیوں کے سامنے آخر حکومت نے تھک ہار کر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ اس طرح پوری دنیا میں قادیانیت کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ان سے چھٹکارا ملا، الحمد للہ علی ذالک۔ یہ میں نے اس لیے لکھ دیا کہ یہ ایک حقیقت ہے، جو ریکارڈ

میں آجائے، اس زمانے کے سارے خطوط بھائی صاحب کے جو والد صاحب کے نام ہیں، اس سے بھرے پڑے ہیں اور ضائع ہو رہے ہیں۔

بھائی صاحب کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر حکومت سعودی نے ۱۹۸۱ء میں انھیں نیوزی لینڈ بھیجا، جہاں وہ اپنی وفات (۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء) تک مقیم رہے۔

اس کی بھی تھوڑی تفصیل سن لیجیے، جتنے بھی سرکاری یا غیر سرکاری اور تجارتی وفود آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جاتے رہے، سب یہ رپورٹ دارالافتاء ریاض کو بھیجتے تھے کہ نیوزی لینڈ ایک پر فضا اور پر سکون ملک ہے، جہاں دنیا کے بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں، وہ لوگ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، چناں چہ کسی ایسے شخص کو بھیجا جائے، جو اسلام کو ان کے سامنے مکمل طور پر ان کی زبان یعنی انگریزی میں پیش کر سکے اور ان کی صحیح رہنمائی کر سکے، چوں کہ بھائی صاحب کو چودہ سالہ تجربہ، انگریزی عربی پر عبور اور ان سب سے بڑھ کر دینی معلومات اور مسائل کی پورے طور پر جانکاری تھی، اس لیے انھیں کا انتخاب کیا اور بھیجا گیا۔ جہاں انھوں نے لگ بھگ اٹھارہ سال تک اسلام اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی اور اسلام کے نام پر جاری رسومات وخرافات کو ختم کرایا اور پورے وقار کے ساتھ اسلام کے نمائندے بن کر رہے اور اپنی جد وجہد سے وہاں کے دار السلطنت ویلنگٹن میں پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور یورپین افسران اور باشندوں کے سامنے دو رکعت نماز پڑھ کر مسجد کا افتتاح کیا۔ یہ آپ کا کمالِ خلوص تھا کہ افتتاح رسمی نہیں رہنے دیا، بلکہ پورے ملک میں مسلمانوں کو آزادی اور برابری کے ساتھ رہنے کا حق دلوایا اور سینکڑوں انگریزوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ آج پورے نیوزی لینڈ میں مسلمان اپنے تمام تر دینی تخصص اور پوری شان وشوکت کے ساتھ رہتے ہیں اور بھائی صاحب نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور نارتھ پیسفک کے جزیروں میں تاریخ کا ایک حصہ بن گئے۔

عربی زبان اور دینی معلومات کے سلسلے میں بمبئی کے مشہور میمن خاندان کے فرد احمد غریب صاحب ماہنامہ ''البلاغ'' فروری ۱۹۶۷ء میں لکھتے ہیں:

''بہت دنوں سے قاضی اطہر صاحب کی کچھ خبر نہیں، دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں ان کے صاحبزادے مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی، ماشاءاللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کرلی ہے اور ہمارے یہاں کے علمائے کرام وفضلائے عظام میں جو کمی محسوس کر رہا تھا عربی بول چال کی، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کرلی ہے۔عربی میں گفتگو بہت اچھی طرح کر لیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی۔ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی،جس میں چار پانچ ہندوستان و پاکستان کے علماء کو مدعو کیا۔اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی،عربی وعجمی دونوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتی تھیں،کیوں کہ اپنے علماء عربی میں گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔ہندوستان کے مولانا علی میاں اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔اسی طرح پاکستان کے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی عربی زبان میں گفتگو پر قدرت رکھتے ہیں''۔

والد صاحب اپنے مضمون ''اہل حرمین سے ملاقاتیں'' کے تحت لکھتے ہیں:

''بارہا ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی ان علمی مجلسوں میں عزیزم خالد کمال ساتھ رہے اور اساتذہ وشیوخ سے گفتگو کے درمیان کوئی لفظ بروقت یاد نہیں آیا اور مطلب کی ادائیگی میں دقت محسوس ہوئی تو وہیں باپ نے بیٹے کی طرف مراجعت کرلیا اور یہ بات بھی ان اساتذہ اور شیوخ کے نزدیک علمی شان کی ایک ادا بن گئی''۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری والد صاحب کے نام ۲۰ رصفر ۱۳۸۴ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کے صاحبزادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ماشاءاللہ ذکی اور باوقار ہیں۔اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے''۔

مولانا لقمان سلفی سکریٹری شیخ ابن بازؒ والد صاحب کے نام ۵؍جون ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''کل بھائی خالد کمال کا خط آیا، خیریت سے ہیں اور مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے تعاقد کے بعد فوراً ہی خط کیوں نہ لکھا، میں نے انھیں خط لکھ دیا ہے اور معذرت کرلی ہے۔ ان کی چھٹی ۸؍ربیع الثانی سے شروع ہوگی۔ ان کے کام سے نائب مفتی خوش ہیں۔ خدا مزید کی توفیق دے''۔

مولانا ڈاکٹر خالد محمود اور مولانا منظور احمد چنیوٹی فاتح ربوہ اپنے ''دورۂ افریقہ'' ۱۹۷۶ء ناشر مکتبہ ختم نبوت لاہور میں لکھتے ہیں:

''وفد سیدھے سعودی عرب کے سفارت خانے میں پہنچا اور محترم سفیر سے ملاقات کی اور ساتھ ہی گھانا کے دینی حالات اور مرزائیوں کے سماجی تسلط پر کچھ بات چیت کی، سفیر صاحب وفد کی آمد اور پروگرام سن کر بہت خوش ہوئے اور ہر قسم کے تعاون کی پیشکش فرمائی۔ ایک بجے کے قریب اراکین وفد ناظم استقبال کی کار میں شیخ خالد کمال مبعوث دارالافتاء کے مکان پر پہنچے اور طے پایا کہ آج شام پاکستانی سفیر سے بھی ملاقات ہوجائے، چناں چہ ۵؍بجے وفد نے پاکستانی سفیر سے ملاقات کی اور ان سے گزارش کی کہ یہاں گھانا میں اس قرارداد کی اشاعت نہیں ہوئی ہے، جو پاکستان نیشنل اسمبلی نے ختم نبوت کے سلسلے میں پاس کی تھی اور یہاں کے عوامی حلقوں میں اب تک پاکستانی سے مراد قادیانی ہی لیے جاتے ہیں، سفیر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ ہمیں اس قرارداد کی نقول مہیا کریں گے۔

ہمیں اس بات سے بھی دکھ ہوا کہ گھانا جیسے اہم مقام میں جسے مرزائی دوسرا ربوہ سمجھتے ہیں، پاکستان نیشنل اسمبلی کی ختم نبوت کی قرارداد کی مناسب تشہیر نہیں ہوئی، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ پاکستانی اور مرزائی کے مترادف

ہونے کا تصور یہاں سے یکسر مٹ نہ جاتا .... ہاں شیخ خالد کمال کو ہم نے اس سلسلے میں بہت فکر مند پایا، انھوں نے یہاں کے مقامی دینی ماہنامہ ''اطہر'' میں جو انگریزی زبان میں چھپتا ہے، مرزائیت کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کر رکھی ہے''۔

والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر خالد کمال لکھنے پڑھنے میں آتے تو مجھ سے آگے جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے دوسرے طریقے سے دین کا بڑا بڑا کام لیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین

آپ نے کم از کم چودہ پندرہ حج ادا فرمایا۔ ۱۹۹۶ء میں والد محترم کے انتقال کے بعد وطن آئے تو والدہ مرحومہ کو لوا کر حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی سال منیٰ میں زبردست آگ لگی تھی۔ پھر ۱۹۹۸ء میں نیوزی لینڈ سے سیدھے جدہ تشریف لے گئے اور وہاں پندرہ دن رہ کر فریضۂ حج ادا کیا اور ہندوستان تشریف لائے اور ایک ماہ گھر رہ کر واپس تشریف لے گئے۔ چند ماہ کے بعد برین ہیمرتج کا حملہ ہوا، جس میں سات آٹھ ماہ مبتلا رہے۔ حالاں کہ آپریشن بھی ہوا، مگر جس کا وقت آجائے اسے کون ٹال سکتا ہے۔ بالآخر وقت موعود آ ہی گیا اور اسی مرض میں ۶؍دسمبر ۱۹۹۹ء اور ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵؍دسمبر ۶؍بجے شام کو انتقال فرمایا۔

مرتبہ بخشنے شہادت کا
موت پردیش ہی میں آدھمکی

تاریخ وفات

حضرت مولانا مورخ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی یادداشت میں علماء کی یہ تاریخ وفات، علماء کا تذکرہ لکھنے کی غرض سے درج کی تھی، مگر وہ ان علماء کے حالات قلمبند نہیں کر سکے۔

۱۔ وفات مولانا حافظ عبدالعزیز بھوجپوری مرادآبادی ۲ر جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ مطابق یکم جون ۱۹۷۶ء سہ شنبہ ۱۲ر بجے رات۔ تدفین چہار شنبہ صبح ۹ر بجے الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور۔

۲۔ وفات مولوی حکیم عبدالمجید بکھری ۸ر رجب ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۶ر جون ۱۹۷۷ء یکشنبہ۔ تدفین دوشنبہ قبرستان عائشہ تالاب۔ بعارضۂ فالج۔

۳۔ وفات حافظ قاری محمد یٰسین ولد حافظ عبدالرشید پورہ رانی ۱۷ر نومبر ۱۹۷۷ء ۱۲ر بجے دن۔ تدفین آبائی قبرستان حیدرآباد ۱۰ر بجے رات۔ پوری زندگی دینی و متشرع گزاری۔ بہترین حافظ و قاری تھے، ہمیشہ گھر پر لڑکوں کو حفظ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

۴۔ وفات مولانا مفتی محمد یٰسین ۲۲ر محرم ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۳ء شنبہ۔ تدفین سمودھی قبرستان مولانا شکر اللہ کے پاس۔

۵۔ وفات مولانا بشیر احمد ولد حاجی عصمت اللہ ۳ر شوال ۱۴۰۴ھ مطابق ۳ر جولائی ۱۹۸۴ء سہ شنبہ ساڑھے تین بجے دن۔ تدفین چہار شنبہ ۲ر بجے دن آبائی قبرستان حیدرآباد۔

۶۔ وفات مولوی نثار احمد ولد میاں جی حاجی محمد عمر ۱۰ر رجب ۱۴۰۵ھ مطابق ۲ر اپریل ۱۹۸۵ء سہ شنبہ ۳ر بجے دن۔ قریب شاہ گنج، اجمیر سے واپس آتے ہوئے۔ تدفین چہار شنبہ ۱۰ر بجے دن شاہ کا پنجہ۔

۷۔ وفات قاری مولوی محمد شفیع اشرفی قریشی ۴؍رجب ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۱؍مارچ ۱۹۸۷ء۔

۸۔ وفات مولوی علی ارشاد نجفی مجتہد ولد علی حماد شاہ محمد پور ۱۳؍محرم ۱۴۰۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۷ء۔

۹۔ وفات مولانا عبدالباری قاسمی ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم ۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۸۷ء شنبہ ساڑھے نو بجے دن۔ تدفین یکشنبہ ۱۰؍بجے دن آبائی قبرستان سمودی۔

۱۰۔ وفات مولوی محمد یوسف ولد حاجی عبدالرحیم پورہ رانی شنبہ ۱۰؍جمادی الاوّل ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۰؍دسمبر ۱۹۸۸ء۔ تدفین سمودی قبرستان۔

۱۱۔ وفات مولوی اختر حسین ولد حاجی صفدر علی شاہ محمد پور ۱۴؍فروری ۱۹۸۹ء فیصل آباد پاکستان اسپتال میں تدفین مدرسۃ الواعظین۔

۱۲۔ وفات مولوی خواجہ محمد شفیع ولد عبدالشکور پورہ صوفی ۱۴؍رجب ۱۴۰۹ھ مطابق ۳۰؍مارچ ۱۹۸۹ء دوشنبہ۔ تدفین بعد نماز عصر شاہ کا پنجہ۔

۱۳۔ وفات مولانا قمر الدین بن عنایت اللہ رسولپوری ۹؍ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۴؍مئی ۱۹۹۱ء جمعہ ساڑھے بارہ بجے دن۔ تدفین شنبہ ۹؍بجے صبح رسولپور۔

۱۴۔ وفات مولوی عبدالستار قاسمی ولد حافظ عبدالرشید پورہ رانی ۱۱؍ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۳؍مئی ۱۹۹۲ء شب جمعرات ۱؍بجے۔ تدفین آبائی قبرستان حیدرآباد۔

۱۵۔ وفات مولانا محمد عثمان ساحر مبارکپوری بن حافظ علی حسن ۲۷؍شوال ۱۴۱۳ھ مطابق ۲۰؍اپریل ۱۹۹۳ء سہ شنبہ ۶؍بجے شام۔ تدفین چہار شنبہ ۲؍بجے دن آبائی قبرستان حیدرآباد۔

۱۶۔ وفات مولانا محمد مسلم بہوری بن مولوی محمد الیاس ۲۰؍جولائی ۱۹۹۳ء وفات کے وقت عمر لگ بھگ ۵۷؍سال برین ہمیرج کے بعد لکھنؤ اسپتال میں ایک ہفتہ

رہے اور اسپتال ہی میں انتقال کیا، دوسرے دن آبائی قبرستان بھور میں ۲ر بجے دن میں دفن کیے گئے۔

۱۷۔ وفات مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری (محدث) ۲۲ر رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۵ر جنوری ۱۹۹۴ء چہارشنبہ صبح۔ تدفین بعد نماز مغرب سمودی قبرستان۔

۱۸۔ وفات مولانا محمد عمر مظاہری مبارکپوری ۱۲ر ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۳ر اپریل ۱۹۹۵ء شب جمعہ مئو اسپتال میں۔ تدفین یوم جمعہ بعد نماز مغرب شاہ کا پنجہ۔

۱۹۔ وفات مولوی عبید الرحمٰن قمر حسین آبادی ۱۸ر ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹ر اپریل ۱۹۹۵ء شب شنبہ ۹ر بجے۔ تدفین ۲ر بجے دن آبائی قبرستان حسین آباد۔

۲۰۔ وفات مولانا قاری محمد یحییٰ امام جامع مسجد راجہ مبارک شاہ ۲۶ر ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۵ر مئی ۱۹۹۶ء چہارشنبہ صبح ساڑھے چار بجے۔ تدفین بعد نماز مغرب سمودی قبرستان۔

مراجع ومصادر

نمبر	نام کتاب	مصنف	مطبع
۱	اخبار لبرل اعظم گڑھ		اعظم گڑھ
۲	اعظم گڑھ گزیٹیر	مسٹر ڈی۔ایل۔ڈرک۔بروکمان	الٰہ آباد
۳	آئینۂ اودھ	مولانا شاہ ابوالحسن قطبی مانک پوری	نظامی پریس کانپور
۴	اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار	مولانا فضل احمد	مفید عام آگرہ
۵	اخبار اردو ٹائمز		بمبئی
۶	بحر ذخار	مولوی وجیہ الدین اشرف	قلمی
۷	تاریخ المنوال داہلہ	مولانا عبدالسلام مبارکپوری	احمدی پریس پٹنہ
۸	تذکرۃ الحفاظ	امام ذہبی	حیدر آباد
۹	تذکرہ علماء ہند	مولوی رحمان علی	نول کشور لکھنؤ
۱۰	تراجم علماء اہل حدیث	مولانا یحییٰ نوشہروی	دلی
۱۱	تذکرہ علماء حال		
۱۲	ترجمان اہل حدیث	مولانا ثناء اللہ امرتسری	دلی
۱۳	الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند	مولانا عبدالحئی	حیدر آباد
۱۴	حیات شبلی	علامہ سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ
۱۵	خلاصہ حال اقوام ہند	مسٹر ٹی ڈبلو ٹالبرٹ	جیل پریس ڈیرہ اسمٰعیل خاں
۱۶	خلاصہ تاریخ مسعودی	مولوی صادق	غالب الاخبار پریس
۱۷	خم خانہ جاوید (جلد پنجم)	لالہ سری رام ایم۔اے دہلوی	دلی
۱۸	خانوادہ ظہیریہ	مولانا خالد کمال مبارکپوری	البلاغ بمبئی

۱۹	رحلۃ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ	مصر
۲۰	سیرۃ البخاری	مولانا عبدالسلام مبارکپوری	دلی
۲۱	سلک گہر	جاوید انصاری برہانپوری	برہانپور
۲۲	صدرنگ	مولانا قمرالزماں قمر مبارکپوری وفیاض گوالیاری	اسرار کریمی پریس الہ آباد
۲۳	صدق جدید	مولانا عبدالماجد دریابادی	لکھنؤ
۲۴	عمل صالح	محمد صالح کمنبوہ	رامپور
۲۵	غزانامہ	مولوی عنایت اللہ	نظامی پریس کانپور
۲۶	گل رعنا	مولانا عبدالحئی	لکھنؤ
۲۷	گنج ارشدی	مولانا شاہ غلام رشید جونپوری	قلمی
۲۸	مقدمہ مآثر الکرام	صمصام الدولہ شاہنواز خان	لاہور
۲۹	مظہر الاحدیۃ	مولوی عبدالاحد ظفرآبادی	کاظمی پریس کانپور
۳۰	مرآۃ الاسرار	مولانا عبدالرحمٰن چشتی	قلمی
۳۱	مناقب غوثی باب ہشتم	شیخ شمس الدین حیدری	قلمی
۳۲	مآثر و معارف	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری	ندوۃ المصنفین دلی
۳۳	مقدمہ عون المعبود	مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی	دلی
۳۴	ماہنامہ البلاغ	اڈیٹر مولانا قاضی اطہر مبارکپوری	بمبئی
۳۵	ماہنامہ فاران	اڈیٹر ماہر القادری	کراچی
۳۶	نزہۃ الخواطر	علامہ عبدالحئی لکھنوی	حیدرآباد
۳۷	نمود سحر	مولانا نشر مصباحی مبارکپوری	نامی پریس لکھنؤ
۳۸	واقعات وحادثات مبارکپور	مولوی علی حسن فاروقی مبارکپوری	قلمی

تصانیف مصنف مرحوم

قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی مکمل فہرست

یہ فہرست اتنی مکمل ہے اور جامع ہے کہ آئندہ قاضی صاحب کے کارناموں پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بہترین رہنما ثابت ہوگی، اسی نقطۂ نظر سے ہم شائع کر رہے ہیں۔

(۱) عرب و ہند عہد رسالت میں (اُردو)

یہ کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ اس کو مصر کے ایک مشہور عالم الدکتور عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں الھیئۃ المصریہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا۔ سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر ونظر نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ عارفین نے اس کا ایڈیشن شائع کیا۔

(۲) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (اُردو)

یہ کتاب ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی نے شائع کیا۔ تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے اس کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا۔ مصر کے دکتور عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے اس کا عربی میں ترجمہ کر کے ''حکومات العرب فی السند والھند'' کے نام سے شائع کیا اور اس کو اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان کے مجلّہ الدراسات العلمیۃ نے قسط وار شائع کیا، پھر مکتبہ آل یداللہ بکریہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۳) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (اُردو)

یہ کتاب ۲۴۳ رصفحات پر مشتمل ہے۔ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

(۴) خلافت راشدہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۲۸۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا۔ بعد میں تنظیم فکرونظر سندھ پاکستان نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۵) خلافت عباسیہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۵۵۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن دہلی سے ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ دوبارہ تنظیم فکرونظر سندھ پاکستان نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

(۶) خلافت بنواُمیّہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۶۷۱ رصفحات پر مشتمل ہے۔ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں دہلی سے شائع کیا۔ پھر تنظیم فکرونظر سندھ پاکستان نے اپنے یہاں سے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۷) دیارِ پورب میں علم اور علماء (اُردو)

یہ کتاب ۴۸۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مشرقی ہندوستان میں علمی سرگرمیوں کا محققانہ تذکرہ ہے۔اس کو بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

(۸) تذکرۂ علماء مبارکپور (اُردو)

یہ کتاب ۲۹۲ ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا تھا۔ ترمیم و اضافہ کے بعد ۲۰۰۷ء میں شائع ہو رہی ہے۔

(۹) مآثر و معارف (اُردو)

یہ کتاب ۲۷۱ ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔

(۱۰) آثار و اخبار (اُردو)

یہ کتاب ۱۵۰ ر صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ قاضی صاحب کے کچھ مقالات کا مجموعہ ہے، جو بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

(۱۱) تدوین سیر و مغازی (اُردو)

یہ کتاب ۳۲۰ ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو علم و تحقیق کا شاہکار ہے۔ اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔

(۱۲) خیر القرون کی درس گاہیں (اُردو)

کتاب کا پورا نام ''خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت'' ہے۔ یہ کتاب ۳۹۲ ر صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۵ء میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے اس کو شائع کیا ہے۔

الاربعین
تعزیہ داری
سفارش کرو
اجر و ثواب پاؤ
اتباع سنت
مسائل
جنازے کے مسائل
نماز کے مسائل
نکاح کے مسائل
مقالات محدث مبارکپوری
فقہ الحدیث
کتاب التوحید
دعا کے مسائل
طلاق کے مسائل
Rs. 400/-